



سليم گيلاني

## عرضِ ناشر

جناب سلیم گیلانی کی تالیف ”بلاغ“ پہلی بار 1994ء میں طبع ہوئی تو مجھے اس کے قاری ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کا پیرایہ بیاں اس قدر موثر اور دلنشین تھا کہ میں نے اسے بار بار پڑھا۔

جناب سلیم گیلانی ریڈیو پاکستان کے سابقہ ڈائریکٹر جنرل ہیں اور دنیائے نشریات میں ایک مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں، بلاغ کے رمز آشنا۔ انہوں نے حضرت بلاغ کے حوالے سے خیر الاعصار کی بافت اس طرح کی ہے کہ اُن کی یہ تالیف اردو میں سیرت کے بلاغ میں ایک نئے باب کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

اس تالیف کی طباعت ثانی کے بعد طباعت سوم کی سعادت مجھے حاصل ہو رہی ہے، لیکن یہ محض نقش دوم کی طباعت سوم نہیں ہے، اس میں جناب سلیم گیلانی نے بڑے قابلِ قدر اضافے بھی کیے ہیں۔ جو یقیناً آپ پسند فرمائیں گے۔

گل فراز

## فہرست

		عرضِ ناشر
	۹	پیش لفظ طبع اول
۸۹		پیش لفظ طبع دوم
	۱۳	میں بلال ہوں
۹۷		کعبے کے شب و روز
۱۰۳		ایک اور ہم زبان
	۲۳	غلامی کے داغ
۱۰۷		آخری رات، پہلا دن
۱۱۱		اجرِ عظیم
۱۱۹		آخری سزا
	۳۷	دربار رسالت میں
۱۲۳		آزادی کی تعلیم
	۴۳	اُن کی باتیں
۱۲۹		خانہ آبادی
	۴۷	پہلی وحی
۱۳۷		نزولِ قرآن
	۵۱	
۱۳۵		
	۵۹	
۱۵۱		
	۶۵	
۱۵۵		
	۷۳	
۱۵۹		
	۷۷	
۱۶۵		
	۸۳	

## پیش لفظ (طبع اول)

”یہ کیا خرید لائے ہو ابو بکر؟“

ابو بکرؓ نے بلالؓ کو دیکھا تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”کالی سیاہ رنگت، بے نکال لباقہ، سارے بدن داغ داغ، زخموں سے پُور، پور پور سے خون رس رہا ہے، نڈھال، نیم جان، زبان بھی تو تلی، غلام ہی لینا تھا تو کوئی ڈھنگ کا خریدنا ہوتا۔“

اُس وقت، جو یتیم کے یہ محترم بزرگ بینائی سے محروم نہیں ہوئے تھے۔ فتح مکہ کے وقت جب وہ ایمان لائے تو بالکل نابینا تھے۔ ایمان چیز ہی ایسی ہے۔ اللہ جل مجدہ توفیق دے تو بند آنکھوں سے بھی سب کچھ دکھائی دے جائے، نہ دے تو کھلی آنکھوں سے بھی نظر نہ آئے۔ اپنے والد کی گفتگو سن کر ابو بکرؓ نے جواب دیا:

”میں نے تو محض چند ٹھیکریاں دی ہیں ان کے عوض۔ ساری دُنیا کے خزانے مل کر بھی بلالؓ کے ایمان کی قیمت نہیں چکا سکتے۔“

اسی موقع پر آنحضرتؐ نے بلالؓ کی برأت کی خبر سنی تو ابو بکرؓ سے فرمایا کہ اس ثواب میں مجھے بھی شریک کر لو۔ ابو بکرؓ نے عرض کی:

”یا رسول اللہؐ، میں قیمت ادا کر چکا ہوں۔“

حضرت بلالؓ کی شخصیت اسلام کے اولین دور سے اب تک مسلمانوں ہی کے لئے نہیں، غیر مسلموں کے لئے بھی کئی وجوہ کی بنا پر پُرکشش رہی ہے۔ دین کی راہ میں اُن کی

۲۸۹	ابوسفیان	۱۶۹	الوداع مکہ
۱۲۹	فتح مکہ	۱۷۵	ثور سے قبا
۳۰۱	فتح مکہ کی اذان	۱۸۱	قبا
۳۰۹	خطبہ عرفات	۱۸۹	جانب لطما
۳۱۳	غلامی	۱۹۵	تعمیر مسجد
۳۲۱	غلام	۱۹۹	مواخات
۳۳۵	میں رہن رکھا گیا	۲۰۵	پہلی اذان
۳۴۳	اشاعت اسلام	۲۱۳	پہلی اسلامی مملکت
۳۴۹	نبیؐ کی وفات	۲۱۷	بدر
۳۵۹	اُن کے بعد	۲۲۵	احد
۳۶۱	آخری اذان	۲۳۱	شام احد
۳۶۷	فتح شام	۲۳۷	آب یا کبھی نہیں
۳۷۳	حضورؐ کی خدمت میں	۲۴۵	بدر صغریٰ
۳۸۳	کھلی کتاب	۲۴۹	غزوہ احزاب
۳۸۹	زندگی اور یادیں	۲۶۵	سفر حدیبیہ
۳۹۳	خاتم المرسلین	۲۷۳	فتح مین
۴۰۳	جنت کی محفل	۲۸۱	جانب منزل

عدیم المثال قربانیاں، سابقوں الاؤلون میں شمار کا شرف، اسلام کے اولین مؤذن کی حیثیت سے اُن کا منفرد مقام، کئے کے ایک ادنیٰ غلام سے ایک جلیل المرتبت صحابی کے درجے تک پہنچنے میں اُن کی زندگی کا دلچسپ، ہمد آئوب اور قابل رشک سفر، رسالتآب اور اُن کے اہل بیت سے اُن کا رشتہ، خلوص و وفا، خادم نبی کی حیثیت سے اللہ کے رسول کا ہمہ وقت قرب، پہاڑوں کی سی عظمت اور استقامت رکھنے والے اسلام کے اس بطل جلیل کا ذرہ خاک جیسا انکسار، دلوں پر نقش جاوداں کی طرح ثبت ہیں۔

دریں صورت زبیر نظر کتاب، سیدنا بلالؓ کے ساتھ تاریخ کی روشنی میں ایک تصوراتی انٹرویو ہے جو دمشق میں اُن کی وفات سے چند ماہ قبل ۲۰ ہجری میں کیا گیا۔  
آئیے حضرت بلالؓ سے ملتے ہیں!

سلیم گیلانی

## پیش لفظ (طبع دوم و سوم)

میں ”بلاں“ کے قارئین کا ممنون ہوں جن کی آراء نے میری اس کاوش کو قبول عام بخشا اور اسے طباعت دوم کے بعد سوم کی منزل تک پہنچایا۔ اُن کی بے ساختہ پذیرائی کو میں اپنی کسی صلاحیت پر نہیں بلکہ محبت اور عقیدت کے اُس سیل بیکراں پر محمول کرتا ہوں جو حضرت بلالؓ جیسے یگانہ روزگار، جلیل القدر صحابی کے لیے ہر مسلمان کے دل میں مؤثر ہے۔

زبیر نظر ایڈیشن میں چند نئے باب شامل کئے گئے ہیں اور اُن کے علاوہ کئی اضافے ہیں جنہیں حضرت بلالؓ پر مزید تحقیق کے بعد شامل کرنا ضروری تھا۔  
حرف تشکر عزیزم خالد شیرازی کے لئے جنہوں نے اس ایڈیشن کے مسودے کے پروف دیکھے اور چند اہم حوالے فراہم کئے۔

سلیم گیلانی

## میں بلالؓ ہوں

میں بلال ہوں! حبشہ کے سیاہ فام غلام زبّاح کا سیہ فام بیٹا۔ غلام النّ غلام! غلامی میں آنکھ کھولی، غلامی میں پلا بڑھا، غلاموں کی مخصوص سوچ کے ساتھ جوان ہوا، غلاموں کی طرح بار بار بیچا اور خرید اگیا اور شاید یہی داغ سینے پر لئے، کسی کوڑے کی ضرب پر جان دے کر، اپنے طوقِ غلامی سمیت کسی گوشہٴ ارض میں گنّام دفن ہو جاتا، اگر کئے کا تاجر اُمیہ ایک دن مجھے قتل کرنے کا فیصلہ نہ کرتا۔

آج میں دمشق میں اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہا ہوں۔ اُمیہ مجھے ماضی کے اُنق پر بہت دُور ایک دھندلے سے دھبے کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ یہ دھبہ کراں تا کراں میری ساری زندگی پر محیط تھا۔ روشنی کی کوئی کرن نہیں تھی جو اُس کی ظلمت کو چیر کر مجھ تک پہنچ سکتی۔ یہ دھبہ پھیلتا، سمٹتا، گرجتا، برستا مگر اس کا حصار کبھی نہ ٹوٹتا۔ پھیلتا تو دنیا اندھیر ہو جاتی، سمٹتا تو دیو قامت چٹانوں کی طرح اپنی پوری طاقت سے

مجھے کچل کر رکھ دیتا، مگر جتنا تو کالے بادلوں کی طرح اچانک یوں پھٹ پڑتا کہ جائے پناہ نہ ملتی اور برسنا تو اُس کے ہر کوڑے پر کائنات دم توڑنے لگتی۔

غلاموں کی زندگی میں اتنا چڑھاؤ نہیں ہوتے۔ حادثات کی بھر مار نہیں ہوتی۔ زندگی ایک ڈگر پر چلی جاتی ہے۔ صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے اور وقت کا دھار ایونٹی بہتا چلا جاتا ہے۔ لیکن غلام کی زندگی میں اگر کوئی سانحہ آجائے تو وہ حتمی ہوتا ہے۔ پھر کسی اور سانحے کی گنجائش نہیں رہتی۔ غلام گرا تو پھر اٹھتا نہیں۔ ٹوٹا تو ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ غلام کی حیثیت ہی کیا ہے؟ محض ایک کھال جو کوڑوں کے لئے وقف رہتی ہے اور یہ کوڑے کسی بھی وقت، کسی بھی بات پر، کسی بھی جگہ برس سکتے ہیں۔

اُمیہ ایک خود پسند، خود سر انسان تھا۔ من مانیاں کرنے کا حق، اُس کے خیال میں اُسے اپنے حسبِ نسب اور اپنی دولت و ثروت سے ملا تھا۔ اُس کے لئے میرے بارے میں صرف اتنا جاننا کافی تھا کہ میں بلال ہوں، اُس کا زر خرید غلام اور بس۔ میرے لئے بھی بس اتنا ہی جاننا کافی تھا کہ وہ میرا آقا ہے۔ آقا کس بات سے خوش ہوتا ہے، کس بات پر خفا ہوتا ہے، یہ جاننا صرف آقا کا حق تھا۔ غلام کے لئے کچھ بھی جاننا لازم نہیں ہوتا۔ اُسے کچھ بتانا، سمجھانا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ غلام کو کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اُس کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے طور پر صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہے اور قرآن سے جو نتیجہ چاہے، اخذ کرتا رہے۔ وہ صحیح ہو تو اُس کی قسمت، غلط ہو تو اُس کا مقدر!

غلام کے لئے اُس کے آقا جیسی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ جب وہ آواز گو نہتی ہے تو اُس سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔ غلام کا یہ فرض ہے کہ یا تو وہ نظروں کے سامنے ہو یا آواز پر فوراً حاضر ہو جائے۔ تیسری صورت ممکن نہیں کیونکہ اُس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غلام بھاگ گیا ہے اور اس جرم کی ایک ہی سزا ہے۔ موت!

جو لوگ اس دنیا میں نہیں رہے اُن کو بُرا کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اُمیہ نے مجھے مکے کے بازار سے خرید کر کوئی گھائے کا سودا نہیں کیا تھا۔ اُسے اپنی رقم کی ایک ایک پائی وصول ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ اُمیہ کی بہت سی باتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ میں انہیں بھولا نہیں ہوں لیکن بھلا دینا چاہتا ہوں۔ میں بلال، اُمیہ کا زر خرید غلام، آپ کو اُن دنوں کی باتیں سنانا چاہتا ہوں جو شروع سے آخر تک حیرت و استعجاب کے دن تھے اور حیرت بھی ایسی کہ آج تک اُس کے نشے سے سرشار ہوں۔ بائیس سال تک اس غلام نے اُس فضا میں سانس لیا جس میں اللہ کے آخری نبی، محمد صل اللہ علیہ وسلم کے سانسوں کی مہک تھی۔ جو انہوں نے کہا، میں نے سنا۔ جو انہوں نے کیا، میں نے دیکھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

## کعبے کے شب و روز

موسم گرما کی ایک صبح تھی۔ اُمیہ حسبِ معمول اپنے تاجر ساتھیوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے گھر سے نکلا۔ تاجروں کی یہ محفل خانہ کعبہ کے سائے میں لگتی تھی۔ مجھے یہ صبحیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ تاجروں کے ساتھ اُن کے غلام بھی ہوتے تھے جو کچھ فاصلے پر بیٹھے اپنے اپنے آقاؤں کے اشاروں کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ ایسے موقعوں پر غلام آپس میں ہلکی ہلکی سرگوشیاں بھی کر لیتے تھے۔ ادھر ادھر کی جھوٹی سچی خبریں مل جاتی تھیں اور وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ سب سے زیادہ لطف اُن محفلوں کا یہ تھا کہ ہم غلام لوگ بھی سائے میں بیٹھتے تھے۔ مکے میں سایہ ایک نعمت سے کم نہیں اور پھر ہم غلاموں کو تو یوں لگتا تھا جیسے سخت جس میں سانس لینے کے لئے ٹھنڈی، تازہ ہوا کا جھونکا بیسرا آ گیا ہو۔

مکے میں کچھ نہیں آگتا۔ نہ پودے، نہ پھول، نہ گھاس، نہ درخت۔ دن بھر سورج کی تمازت سے ارد گرد کی پہاڑیاں تانبے کی طرح تپ اٹھتی ہیں اور رات گئے تک اُن کی تپش

خانہ کعبہ، اللہ کا یہ گھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ صرف ایک اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کے لئے لیکن پھر انسانی ذہنوں میں کچھ ایسا خلفشار پیدا ہوا کہ یہ عظیم عبادت گاہ لکڑی اور پتھروں سے بنائے ہوئے بتوں کا گودام بن گئی۔ ان بتوں کو عرب اپنے خداؤں کا درجہ دیتے تھے، یعنی پہلے تو اس قادرِ مطلق کا تصور گم ہوا، پھر اُس کی جگہ بتوں نے لے لی اور پھر ایک نہیں سینکڑوں خداؤں کا تصور ابھر ا، اور پھر وحدانیتِ الہی کی یہ قدیم علامت تین سوساٹھ بتوں کا مسکن بن گئی جو پتھے جاتے تھے، خریدے جاتے تھے اور ہر خرید و فروخت پر منافع کمایا جاتا تھا۔ کوئی دن کے خدا تھے، کوئی رات کے۔ کوئی معذروں کے خدا تھے، کوئی صحت مندوں کے۔ خوش نصیبی کے خدا الگ، سفر کے الگ اور سب کے سب دنیوی منفعت کے لئے۔ بدی بہود اور آخروی بہتری کا کوئی عنصر ان کی عبادت میں شامل نہیں تھا۔ خانہ کعبہ میں آنے جانے والے قافلوں کے پاس صرف نفع کمانے کا تصور تھا جو بازاروں اور منڈیوں میں نظر آتا ہے۔

ہر سال ایک خاص مہینے میں عرب کے قبائل میلوں کی مسافت طے کر کے اپنے اپنے خداؤں کے حضور حاضری کے لئے آتے تھے۔ ایک میلہ سالگ جاتا تھا۔ شام کے تاجر، یمن کے سمندری تجارت کرنے والے تاجر، فارس کے تاجر اور دور دراز مقامات سے آئے ہوئے غلاموں کی خرید و فروخت کرنے والے تاجر، سبھی یہاں جمع ہوتے تھے۔ اس میلے میں سونا، چاندی، کپڑے، خوشبوئیں بھی فروخت ہوتی تھیں، غلام بھی اور خدا بھی!

”اُسے دیکھو، وہ کہتا ہے کہ وہ خدا سے باتیں کرتا ہے“ ابو جہل کی آواز نے ہم غلاموں کو چونکا دیا۔ اُس کا غلام آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا مگر ابو جہل کا فقرہ جلد ہی قہقہوں میں ڈوب گیا اور اُس کا غلام دوبارہ بیٹھ گیا۔

”پیغمبر صاحب، آپ ہمیں پانی پر چل کر کیوں نہیں دکھاتے“

اب کے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ اُمیہ کی آواز تھی۔ میرے بد نصیب آقا کی جو آج جنم

کئے کی فضا میں آگ برساتی رہتی ہے لیکن نہ جانے اس شہر کی فضا میں کون سا ایسا جادو تھا۔ کون سی مقناطیسی کشش تھی کہ یہاں کے باسی جب کہیں باہر جاتے، اُن کا کہیں جی نہ لگتا۔ وہ مکے کے لئے اُداس ہو جاتے اور کاروبار سے فارغ ہوتے ہی مکے کی راہ لیتے۔ یہاں تک کہ مکے کے نام پر اُونٹوں کے بھی کان کھڑے ہو جاتے اور وہ بھی اپنی رفتار تیز کر دیتے۔ میں تو محض ایک غلام تھا اور مکے میں ذلت اور رسوائی کے سوا میں نے دیکھا کیا تھا! جب سے پیدا ہوا تھا لوگوں کے ہاتھوں صعوبتیں اٹھا رہا تھا۔ کوئی بوجھ اٹھواتا تھا، کوئی دائروں میں دوڑ لگواتا تھا، یہ دیکھنے کے لئے کہ اس میں کتنا دم خم ہے یا کتنے میں ٹھیک رہے گا اس کا سودا، مگر مجھ غلام کو بھی اپنی یہ جائے عقوبت اچھی لگنے لگی تھی۔

آج میرے سامنے پیالے میں دمشق کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی رکھا ہے لیکن کوئی میرے دل سے پوچھے، اس پانی کا مزہم کے تیکھے، نمکیات ملے پانی سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ خانہ کعبہ کے صحن میں زمین سے اُبلتا ہوا مزہم کا پانی مجھ جیسے غلام چلوؤں سے پیا کرتے تھے۔

ایسا کیوں تھا؟ کیا سحر تھا مکے کی فضا میں؟ ایک غیر ذی زرع واوی میں سُورج کی حدت سے پتہ ہوا یہ شہر! نہ کوئی درخت، نہ سبزہ، نہ پرندے، نہ تتلیاں۔ فطرت کی چھوٹی سے چھوٹی توجہ سے بھی محروم یہ نگری! کیلیات تھی اس میں کہ سب کے دلوں میں گھر کر رکھا تھا! ذہنوں پر کچھ اس طرح قبضہ کر رکھا تھا اس شہر نے کہ ہر دل کی دھڑکن بنا ہوا تھا۔ اس کا صرف ایک جواب تھا۔ نہایت واضح اور مختصر۔ خانہ کعبہ کی سیاہ مکتب نما عمارت جو ایک آسمانی نگینے کی طرح اس ریگ زار کا زیور بنی ہوئی تھی، اس کے سائے میں سو کھجوروں کے سایوں کا سرور تھا۔ یوں کہیے کہ یہ عمرہ ارض کا سب سے خوشگوار نخلستان تھا۔ جاہلیت کے دور میں بھی یہ امن کا گوارہ تھا۔ کسی کو یہاں تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی اپنے دشمن پر بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کوئی جھگڑا، کوئی فساد، کوئی تنازعہ، کوئی جنگ خانہ کعبہ کی حدود میں نہیں لائی جاسکتی تھی۔



”راہِ راست پر لاؤں، کس کو؟ محمد کو؟ وہ کوئی چمچہ ہے؟ چالیس سال کا ہے! اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سراسر بدنامی کا باعث ہے۔ میرے لئے، اپنے خاندان کے لئے اپنے نسبِ عالی کے لئے۔ کل اُس نے ایک غلام کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا ہے، پاگل پن ہے، پاگل پن! جو کوئی اُس سے کچھ مانگتا ہے، اٹھا کر اُس کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراسر دیوانگی ہے۔ جہان بھر کے چوروں اُچکوس، مقروضوں کو کھانے کھلاتا ہے۔ جب دیکھو اُس کے دروازے پر دس بارہ جمع رہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ہو جو اُس کے گھر سے کوئی بھیڑ، یا بھری یا کچھ اور لے کر نہ جائے، ہم کر کیا سکتے ہیں۔ لہٰذا ہشام میرا بھتیجا پاگل ہو گیا ہے، بالکل پاگل!“

ابو لب باتیں بھی کرتا جاتا تھا اور لوگوں کے چہرے بھی دیکھتا جاتا تھا۔ اس امید پر کہ شاید اُن میں سے کوئی بول پڑے اور اس معنی کو سلجھانے میں مدد دے جو وہ خود سلجھنا نہیں پاتا تھا اور جو شاید سلجھایا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ پیغمبری کا دعویٰ، کیسی انسانی بات تھی! گھبراہٹ میں اُس نے ابو سفیان کا بازو تھام لیا۔

”ابو سفیان! تم ہی بتاؤ، ایک جوان شخص، مضبوط، توانا، خوبصورت، سر کا ایک بال سفید نہیں، ایک رئیس عورت کا خاندان، خود عالی نسب، وہ کئے میں جو چاہے کر سکتا ہے مگر کرتا کیا ہے۔ اپنے گھر کا آرام دہ بستر چھوڑ کر پہاڑوں کے غاروں میں بیٹھا سردی سے ٹھنڈا رہتا ہے، محض اس وہم پر کہ ایک فرشتہ اُس سے بات کرتا ہے۔ یہ فرشتہ اُس کی جان کا روگ بن گیا ہے!“

ابو لب تھک ہار کے بیٹھ گیا۔ اُس کے دوست بھی کچھ پریشان، کچھ شرمندہ سے لگ رہے تھے۔ خاندان میں پاگل پن کا واقعہ ہر ایک کے لئے تشویش ناک ہوتا ہے، کیونکہ ایسے معاملے میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی مشورہ دے سکتا ہے، صرف دُعا کی جاسکتی ہے۔

ابو لب بیٹھا بیٹھا پھر بولنے لگا:

میں اپنی اس ہرزہ سرائی کا جواب سُن رہا ہے۔

پھر میں نے انہیں دیکھا۔ محمد بن عبد اللہ کو، ہمیشہ کی طرح تنہا، نظریں پہاڑوں کی سمت، جہاں لوگ کہتے تھے ایک فرشتے نے اُن سے بات کی تھی۔ وہ ابو جہل کے طنز سے بے نیاز، کعبے کے گرد چلتے چلتے، نظروں سے لوجھل ہو گئے۔ ادھر تاجروں کی محفل میں ہر چہرے پر ہنسی تھی۔ ہر شخص اس مذاق میں شریک تھا۔ صرف ابو سفیان تھا جس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ ہم غلاموں کے لئے مقدم تو ہمارے آقا تھے لیکن اپنے آقا کے بعد اگر کئے میں ہم کسی کو قابلِ اعتنا سمجھتے تھے تو وہ ابو سفیان کی شخصیت تھی۔ اُس کی اور ہماری کہانی ایک دوسرے سے ایسے ہی منسلک ہے جیسے شکار اور شکاری کی۔

اچانک وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ محفل میں سنجیدگی لوٹ آئی۔ وہ کہنے لگا:

”ایک خدا کو ماننے والا خدا کا منکر ہے۔“

ہمیشہ کی طرح آج بھی ابو سفیان نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا کیونکہ سب سے زیادہ تکلیف کھار کو اسی بات کی تھی کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ کفار نے اپنی ضعیف الاعتقادی میں موقع محل کے لحاظ سے کئی خدا بنا رکھے تھے۔ وحدہ لا شریک کا تصور اُن کے دائرہ فکر سے باہر تھا۔ ابو سفیان فکر مند تھا۔

”اگر ہم نے اس فتنے کو ختم نہ کیا تو خدا ہم سے ناراض ہو جائیں گے اور اپنی رحمتیں کسی اور شہر پر نچھاور کرنے لگیں گے۔“

ابو جہل جواب تک خاموش تھا، یکایک بول اٹھا:

”ابو لب! تم اُس کے چچا ہو۔ یہ تم قریبی رشتہ داروں کی ذمہ داری ہے کہ اُسے

راہِ راست پر لاؤ۔“

ابو لب گھبرا گیا۔ اُس نے اب تک دانستہ طور پر اپنے آپ کو اس ساری گفتگو سے الگ

رکھا تھا۔ وہ اس میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ابو جہل نے خواہ مخواہ اُسے بیچ میں گھسیٹ لیا۔

”ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا۔ سب اُس کے دوست تھے، اُس کی عزت کرتے تھے۔ اُس وقت کسی کو اُس پر ہنسنے کی جرات نہیں تھی۔ وہ تمہارے درمیان فیصلے کراتا تھا، تمہارے قہقہے چکاتا تھا۔ لوگ اس کے پاس جاتے تھے اور اُسے عادل و منصف سمجھ کر اپنے اپنے معاملوں میں رہبری حاصل کرتے تھے۔ صرف ایک سال پہلے!“

ابو لب نے اپنے غلام کو اشارہ کیا۔ اُسے جو کہتا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ میں نے ابو لب کو کئی بار دیکھا تھا، کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا کہ جنت اُس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر ہے۔ بس ایک قدم اٹھائے گا اور جنت میں داخل ہو جائے گا لیکن آخری وقت میں اُس نے ہمیشہ غلط فیصلہ کیا۔

ابو جہل کچھ سوچ رہا تھا، لگتا تھا کوئی اہم فیصلہ کر رہا ہے۔

”مجھے یہ فکر نہیں ہے کہ وہ ہمارے خداؤں کے بارے میں کیا الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ ہمارے خدا اُس سے خود نمٹ لیں گے لیکن وہ انسانوں کو جو پٹی پڑھا رہا ہے، وہ بے حد خطرناک ہے مگر اس کا فیصلہ جلد ہو جائے گا۔ سب سے پہلے ہم اُن غلاموں اور لاوارثوں سے نمٹیں گے جو اُس کے گرد جمع رہتے ہیں۔“

جس وقت وہ عمار کو لے کر آئے۔ میں غلاموں کے مخصوص انداز میں دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ انہوں نے اُسے دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ زمین پر گرتے ہی عمار نے سر اٹھا کر انہیں دیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے دل میں کہا اب خیر نہیں! غلام کا کیا کام کہ سر اٹھائے۔ اُس کی تو عافیت ہی سر جھکائے رکھنے میں ہے لیکن عمار مجھ جیسا غلام نہیں تھا، اُسے غلام بنایا گیا تھا۔ وہ بھی مجھ جیسا ہوتا تو اسے اس رمز سے آشنائی ہوتی۔ وہ تو یوں لگتا تھا جیسے اپنا حق طلب کر رہا ہو، بالکل آزاد لوگوں کی طرح جو اپنے حق کی خاطر مقابلے پر اتر آتے ہیں۔

”محمد تمہیں کیا سکھاتا ہے؟“ ابو سفیان نے پوچھا

”وہ سکھاتے ہیں کہ اللہ کی نظر میں سب انسان برابر ہیں، بالکل ایسے جیسے کنگھے کے

دندانے۔“

میں دیوار سے پشت لگائے ہوئے، عمار کے یہ الفاظ سن کر سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

## ایک اور ہم زبان

روزی ہے، سب قبیلوں کے اپنے اپنے خدا ہیں جن کی پرستش کے لئے وہ یہاں آتے ہیں۔ خدا ہمارے معبود بھی ہیں اور ہمارا ذریعہ معاش بھی۔ اور کیا ہم لوگ غریبوں، کمزوروں کی نگہداشت نہیں کرتے؟ ابو سفیان کہتے کہتے رُک گیا، بالکل ڈرامائی انداز میں، جیسے بڑے بڑے مقرر کو کوئی بات کہہ کر تاثر پیدا کرنے کے لئے تھوڑا سا وقفہ دیتے ہیں۔

”اگر ہم تین سو ساٹھ خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کو ماننے لگیں جو نظر بھی نہیں آتا اور جو ہر جگہ بتایا جاتا ہے۔ اس باغ میں، طائف میں، مدینے میں، یروشلم میں، چاند پر، تو پھر مکہ کہاں جائے گا؟ جب ہر گھر میں خدا ہوگا تو یہاں کوئی کیا کرنے آئے گا؟

اس منطق پر ہر چہرہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ بات یہیں ختم ہو جاتی اور کسی پر کوئی عذاب نہ نازل ہوتا مگر شو مئی قسمت کہ میرے آقا نے اچانک مجھے اس معاملے میں الجھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُمیہ اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ میری پشت پر کھڑی دیوار کی طرح سناکت! لیکن اگلے ہی لمحے میری پشت پر کوئی دیوار نہیں تھی، کیونکہ میں اپنے آقا کے منہ سے اپنا نام سُن کر دوڑ پڑا تھا۔

اُمیہ اپنے ریشمی ملبوس کے لہراتے ہوئے گھیر میں عمار کے پاس پہنچا:

”تم کہتے ہو کہ ایک غلام کا رتبہ اُس کے آقا کے برابر ہے۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا عمار کے پاس آ کر یکایک رُکا تو اس کی ریشمی عبا اُس کی پشت پر لہرا کر ایک لمحے کے لئے اُس کے گرد لپٹ گئی۔

”یہ سیاہ فام بلال جسے میں نے اپنے پیسے سے خریدا ہے، میرے برابر ہے؟“

یہ کہہ کر وہ رُکا اور بزم خود اپنے سوال کی معقولیت، کا لطف اٹھانے لگا۔ میں، بلال، اس سارے قطعے سے الگ تھا۔ میرا کسی بات سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ مجھے تو خواجواہ پنج میں گھسیٹ لیا گیا تھا۔ میں غلام ابنِ غلام! مجھے کیا کہ کون کس کے برابر ہے یا

میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی مگر ادھر اُمیہ کا چہرہ تپ کر سُرخ ہو گیا تھا۔ غلام اور آقا کی نبضیں ایک سی نہیں ہوتیں!

مجھے آج بھی حیرت ہے کہ عمار کو آخر سو جھی کیا۔ اللہ کے بندے تجھے اتنی بہادری دکھانے کی ضرورت کیا تھی! تو بڑی آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ محمد عبادت کرنا سکھاتے ہیں، سچ بولنا سکھاتے ہیں، ہمسایوں کی خبر گیری کی تلقین کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ یقیناً تجھے چھوڑ دیتے لیکن تُو نے تو ایک فقرے میں وہ ساری کی ساری بنیاد ہلا کر رکھ دی جس پر مکے کے مردم آزاد، استحصالی معاشرے کی عمارت تعمیر تھی۔ اس پر بھی بس نہیں۔ ایک بار پھر عمار کی آواز آئی:

”محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سکھاتے ہیں کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرو۔“

ابو سفیان کو دوسرے آقاؤں کے مقابلے میں نیک سمجھا جاتا تھا۔ ہم غلاموں کے حلقے میں اُس کی شہرت اچھی تھی۔ اُس کے اپنے غلام بھی اُس کو بُرا آقا نہیں سمجھتے تھے۔ جہاں جنبش ابرو سے کام چل سکتا ہو وہاں وہ زبان کبھی نہیں ہلاتا تھا لیکن مجھے ابو سفیان کی خاموشی اور نرم رویے سے خوف آتا تھا۔ عمار شاید اُس کے اسی دھیمے انداز سے دھوکا کھا گیا تھا جو سب کچھ کہتا چلا گیا۔ جب ابو سفیان نے اُس سے اپنے مخصوص لہجے میں سوال کیا تو عمار بد نصیب یہ سمجھا کہ وہ اُس سے برابر کی حیثیت سے بات کر رہا ہے اور واقعی اُس سے صحیح جواب چاہتا ہے۔

”ایک اللہ؟“ ابو سفیان کے لہجے میں غصہ کم اور تجسس زیادہ تھا۔ لیکن ہمارے تو

تین سو ساٹھ خدا ہیں جو ہماری حفاظت کرتے ہیں، ہماری مرادیں بر لاتے ہیں۔“

کتنی اچھی طرح یاد ہے مجھے وہ دن اور اس واقعے کا ایک ایک لمحہ، اور کیوں یاد نہ ہو تاکہ اُس دن چند ثانیوں بعد میری ساری کائنات بدل گئی تھی۔

”محمد کو احساس نہیں ہے کہ ہم مکے میں خداؤں کو گھر مینا کرتے ہیں۔ یہی ہماری

اگلے لمحے کیا ہوا، یہ میں شاید کبھی بیان نہ کر سکوں۔ آج بھی جب میں اُس لمحے کا تصور کرتا ہوں تو میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بجتی ہیں اور مجھ پر سکتہ سا طاری ہونے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید وہ لمحہ اپنے وجود کی پوری وسعتوں اور پہنائیوں کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ ہی نہیں ہے۔ اُمیہ کی آنکھیں جو غصے سے باہر نکلی پڑتی تھیں اور ابو سفیان کا نصف چہرہ، کیونکہ اُس نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں تھیں۔ ابو سفیان سزا دینے کا قائل تھا مگر اُس میں براہِ راست شرکت کو وہ اپنے منصب سے گری ہوئی بات سمجھتا تھا لیکن عمار صاف میری نظروں کے سامنے تھا۔ وہ ٹھنکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں پاکیزگی تھی، سکون تھا، بے خوفی تھی۔ سر تاپا مجبور مگر عزم! میں نے اس کی آنکھوں میں ایک ایسی قوت دیکھی جو مجھے اپنے غلامی کے بدھن سے بھی زیادہ طاقتور محسوس ہوئی۔ ٹھیک اُس لمحے اُمیہ کا غلام بلال، کسی لور کا غلام ہو گیا۔

میں نے کوڑا ہاتھ سے گرا دیا۔

سب نے بیک وقت ایک آواز کے ساتھ اندر کی طرف سانس کھینچا۔ منہ کھلے ہوئے تھے۔ چہرے حیرت زدہ! جو انہوں نے دیکھا تھا، اُن کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ جو میں نے کیا تھا، مجھے معلوم تھا۔ ایک غلام باغی ہو گیا تھا۔ عمار نے گھٹنٹے گھٹنٹے، ہاتھ بڑھا کر کوڑے کو پکڑنے کی کوشش کی اور بلا آخر کامیاب ہو گیا۔ کوڑا پکڑ کر اُس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے دوبارہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ ہولے ہولے کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ اُس کی سرگوشی میرے دماغ میں چیخوں کی طرح گونج رہی تھی۔

”بلال! جو یہ کہتے ہیں کرو! بلال! یہ تمہیں مار ڈالیں گے۔“

لیکن اس بار جو میں نے کوڑا نیچے پھینکا تو میرے اوپر جیسے نور کی پھوار پڑ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ابو سفیان نے اُمیہ کو اشارہ کیا۔ میں نے ہند کی ہلکی سی ہنسی اور سزا کی طرف

نہیں ہے۔ میں تو کچھ تھا ہی نہیں۔ نہ کسی کے برابر، نہ بہتر، نہ فروتر۔ میری نظر میں میرا کوئی وجود ہوتا تو میں اپنے آپ کو کسی پیمانے سے ناپتا بھی! میں تو تھا ہی نہیں۔ اُمیہ کے الفاظ میں غصہ بھی تھا، طنز بھی اور اسی طنز یہ لہجے میں یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ اپنا ہاتھ ایک پیالے کی سی شکل میں عمار کے منہ کے پاس لے گیا، بالکل مسخروں کے سے انداز میں۔ صورتِ حال مختلف ہوتی تو شاید مجھے اس پر ہنسی آجاتی۔ اُمیہ کو جواب کا انتظار نہیں تھا۔ اُسے جواب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایسی بات کا جواب ہو بھی کیا سکتا تھا لیکن عمار کی عاقبت نااندیشی کہ وہ اس سوال کا بھی جواب دینے کو تیار ہو گیا:

”محمدؐ کہتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک تمام انسان برابر ہیں، خواہ وہ کسی نسل، کسی رنگ کے ہوں۔“

مخفل پر سناٹا چھا گیا۔ پھر میں نے اپنے آقا کی آواز سنی:

”بلال!“

مجھے کیا خبر تھی کہ اس دفعہ میرا نام اس لئے پکارا جا رہا ہے کہ مجھے ایک زندگی سے دوسری زندگی ملنے والی تھی۔ بس اللہ ہی ہے جو جانتا ہے کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ ایک ٹائمنے میں، میں تعمیلِ حکم کے لئے حاضر تھا۔

”بلال! اس کو بتاؤ کہ تم میں اور ایک رئیس مکہ میں کیا فرق ہے؟ یہ لو اور مار مار کے اس کا چہرہ مسخ کر دو تا کہ اسے سبق مل جائے۔“

یہ کہہ کر اُس نے کوڑا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ کیسا واضح حکم تھا۔ کتنا مختصر اور جامع۔ میں آج تک ان فقروں کی جامعیت کا احاطہ نہیں کر سکا۔ سوچ میں ظلم کی انتہا مگر لفظ کتنے تھوڑے سے، کیسے گئے چنے! مقصد میں تعدد کی لامتناہی گنجائش مگر فقرے کیسے بر جستہ، نپے تے! عمار نے زمین پر اوندھے پڑے پڑے سر اٹھا کر اپنا چہرہ مجھے سزا کے لئے پیش کر دیا۔

دیکھا۔ میں ہند کو ساری زندگی سے جانتا تھا لیکن اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی جرأت مجھے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بس اُس کی کچھ جھلکیاں تھیں میرے ذہن میں، جن کو جوڑ کر میں انہیں ہند کی شخصیت سے تعبیر کر لیا کرتا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ آج میں نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھ لیا ہے۔

امیہ کا چہرہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ غیر معمولی طور پر چُپ چُپ بھی تھا۔ پھر ایک دم میری طرف دیکھا اور کہنے لگا:

”بلال اگر تمہیں یہ زعم ہے کہ تم انسان ہو اور یہ کہ تمہیں بھی خدا رکھنے کا حق ہے تو کان کھول کر سُن لو، تمہارے خدا وہی ہوں گے جو تمہارے آقا کے خدا ہیں۔ کوئی نیا خدا میرے غلام خانے میں نہیں لایا جاسکتا،۔۔ پھر امیہ نے باہر نظر دوڑائی اور کہا:

”تمہاری اصلاح کرنی پڑے گی۔ لیکن آج نہیں۔ میں سورج کے نصف النہار پر آنے کا انتظار کروں گا۔ آج وہ ذرا ڈھل گیا ہے۔“

پتہ نہیں کہ ہر سے اشارہ ہوا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے بازوؤں اور گردن کے گرد رستوں کی گرفت محسوس کی اور آنا فانا انہوں نے مجھے جس طرح چاہا توڑا، مروڑا، جھنجھوڑا اور جکڑ کر رکھ دیا۔ میں غلام تھا۔ کبھی نافرمانی کا تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن اُس وقت میں ضرورت سے زیادہ فرماں بردار بنا ہوا تھا۔

وہ مجھے جس طرف موڑتے مڑ جاتا، جس طرح بٹھاتے بیٹھ جاتا، جب کتے کھڑا ہو جاتا، باندھنے لگتے تو میں خود ہاتھ پاؤں آگے بڑھا دیتا۔ اچھی طرح مشکیں کس کے انہوں نے مجھے کمرے سے باہر دھکیلا اور دھکا دے کر غلام خانے کے فرش پر گرادیا۔ کل کے سورج کے انتظار میں!

## غلامی کے داغ

آج میں اپنی زندگی کے ساٹھویں سال میں ہوں۔ اٹھائیس سال غلامی کے، بائیس سال شہنشاہی کے اور دس سال یادوں کے۔ جب میں بیوہ کی غلامی میں تھا، اُس وقت مجھے لگتا تھا کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں اختیار، شعور اور خوابوں سے نوازا گیا ہے اور دوسرے وہ جنہیں صرف ایک جسم عطا کر کے دنیا میں بھیج دیا گیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس دوسری جماعت کا فرد سمجھتا تھا۔ میں کیا، میرے جیسے سارے غلام جانتے تھے کہ اُن کی ذات، کائنات کے لئے محض ایک جسم ہے جس کی طاقت کا ذکر ہوتا تھا۔ جس کو بچا جاسکتا تھا، خریداجا سکتا تھا، جس پر غصہ اتارا جاسکتا تھا، جس کی کھال کھینچی جاسکتی تھی، جس کی اچھائی، برائی کے علاوہ ہماری کوئی بات قابل ذکر نہیں تھی۔ ہمارے ذہنوں میں بھی سوال اُبھرتے تھے، ہماری روحوں میں بھی تلاطم ہوتا تھا، ہم بھی کبھی کبھار کوئی خواب دیکھ لیتے تھے لیکن ایسے جیسے ہم نے کسی شجر ممنوعہ کو ہاتھ لگا لیا ہو، جیسے ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو

گیا ہو! ہماری یہ سوچ منشاءِ الہی سے نہیں، معاشرتی جبر سے اُبھری تھی جو ایک اٹل پہاڑ کی طرح ہر وقت ہمارے سامنے رہتا تھا۔ اس سے ٹکرانے کا تصور ہی ہمیں پاش پاش کر دینے کے لئے کافی تھا۔

یہ معاشرتی جبر کیا تھا؟ جاہلانہ ثقافت کا ایک شوشہ تھا جو اُس وقت سارے عرب میں پورے عروج پر تھی۔ اولادِ آدمِ فلاح اور ارتقا کی راہ سے بھٹک گئی تھی۔ زندگی کا کارواں ایک ایسی صورتِ حال کے نرغے میں تھا جو ظلم، تکبر، شراب اور جوئے کی کشید تھی۔ انسان تمدن کے معنی بھول کر خواہش پرستی کی اُس ادنیٰ سطح پر آچکا تھا کہ اُس کی اخلاقی روح سسک رہی تھی۔ وہ درندوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ہر زبردست اس دردِ ندگی کا شکار تھا اور سب سے زیادہ ہم غلام، جو غلام سازی کے ایک ظالمانہ رواج میں تشدد کے کولہو میں پیلے جا رہے تھے۔ یہ ایک ایسا آہنی قفس تھا جس میں کسی طرف کوئی روزن نہیں کھلتا تھا، کوئی آواز باہر نہیں جاتی تھی۔ ہمارے آقا بدلتے رہتے تھے مگر ہر تبدیلی کی چکی ہمیں اور زیادہ تیزی سے پستی تھی۔ تشدد کی اس خوف ناک فضا سے نبرد آزما ہونا تو درکنار ہم اُس کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری روحیں چیختی تھیں مگر پکار کا کہیں سے جواب نہیں آتا تھا۔ کوئی مذہب ہماری دستگیری کے لئے موجود نہیں تھا۔ ہمارے مذہب تحریفوں اور تاویلوں کے غبار میں گم ہو چکے تھے اور مذہبی قائدین نے اجارہ داریاں قائم کر کے وقت کے حاکموں کی ظالمانہ قوتوں کے ساتھ سودے کر رکھے تھے۔ الہامی مذہب کی تعلیم سربہ گریباں تھی۔ انسان کی فکر اعلیٰ دم بخود اور بے بس، روشنی کی کسی کرن کا انتظار کر رہی تھی۔ یمن، سبالور عدن کی قدیم سلطنتوں کے سائے میں بھی تہذیب کی نشوونما ہوئی تھی مگر ان سلطنتوں کو اُبڑے مدتیں گزر چکی تھیں۔ قریش مکہ نے مشرکانہ اور بت پرستانہ مذہبیت کے ساتھ کعبے کی مجاوری کا کاروبار بھی چکار کھا تھا۔ طائف اور مکہ کے مہاجنوں نے سُد کے جال پھیلائے ہوئے تھے۔

تھے۔ چند پڑھے لکھے لوگ تھے جو پرانے مذاہب کا علم رکھتے تھے مگر انہوں نے بھی فقہی مویشہ گافیوں اور من مانی تاویلوں کی دکانیں کھول رکھی تھیں۔ ایسا گھنپ اندھیرا تھا کہ کسی سمت کسی امید افزا اعتقاد، کسی خوش آئند نظریے کا جگنو نہیں چمکتا تھا۔ آج میں اس دور کو کسی اور نظر سے دیکھ رہا ہوں۔ اُس وقت تو مجھے اُس کا بھی ہوش نہیں تھا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ ایک سمجھو تاسا کر لیا تھا ہم غلاموں نے اپنے شبِ دروز سے!

انہی دنوں مکے میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے شہر کی فضا ہی بدل ڈالی تھی۔ ایک طوفان کی آمد آمد تھی۔ طوفان تو شاید ابھی دور تھا مگر اُس کی گھن گرج ہر ایک کو سنائی دے رہی تھی۔ گفتگو کے موضوع بدل گئے تھے۔ سارا شہر سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ مختلف سطحوں پر مختلف ردِ عمل تھے۔ کچھ لوگوں نے اسے اپنی ذات کے لئے خطرہ سمجھا۔ کچھ نے اسے اجتماعی سانحہ گردانا۔ کچھ نے جزوقتی حادثہ سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کی۔ کچھ خوش فہموں نے اسے کسی اہمیت کے قابل نہیں سمجھا۔ کچھ اتنے متذبذب تھے کہ نہ اُسے اچھا کہہ سکے نہ بُرا مگر فکر مند سمجھی تھے۔ جہاں دو آدمی اکٹھے ہوتے یہی ذکر چھڑ جاتا کہ محمدؐ نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ لا الہ الا اللہ کا درس دیتے ہیں۔ انسانی مساوات کی بات کرتے ہیں۔ محمدؐ کو ہم سب جانتے تھے، کوئی کم کوئی زیادہ۔ سارے شہر میں اُن کی نیکی، اُن کی دیانت، اُن کی امانت، اُن کی درد مندی اور اُن کے اخلاق کا شہرہ تھا مگر یہ رسالت، یہ وحی، غارِ حرا میں فرشتے سے بات چیت، معبودِ واحد کا تصور، مساوات کا سبق، غریبوں کے حقوق کا ذکر، آخرت و مافیہا کی باتیں۔ کہاں جا کر ٹھہرے گا یہ طوفان۔ جو جتنا زیادہ با اختیار تھا اتنا ہی زیادہ فکر مند تھا۔ سب کو محسوس ہو رہا تھا کہ اگر یہ ہیل منڈھے چڑھ گئی تو اس کے پلے سے کچھ نہ کچھ جا کر رہے گا۔ دولت کی صورت میں، یا اختیار کی صورت میں۔ ہم غلاموں کے پاس کیا تھا دینے کو جو ہم فکر مند ہوتے۔

کے علاوہ مجھے دیکھ کر کبھی کوئی اس شفقت اور التفات سے نہیں مسکرایا تھا۔ وہ مسکراتے تھے تو ان کی آنکھیں اور چہرہ ہی نہیں ان کا سارا وجود مسکراتا محسوس ہوتا تھا۔ میرے درجے کے لوگوں کے لئے تو شاید مسکراہٹ ہی نہیں تھی۔

میں نے ہنستی ہوئی صبحیں دیکھی تھیں، رات کے آنچل پر ستاروں کی جھلملاہٹ دیکھی تھی، مسکراتے ہوئے پھول دیکھے تھے مگر ان سب کا تقسیم ہر ایک کے لئے ہوتا ہے۔ محمدؐ کی مسکراہٹ کا ایسا دل میں کھب جانے والا انداز تھا کہ بندہ ہزاروں کے ہجوم میں تنہا ہو جائے۔ اُس میں کسی غیر کی شرکت کا شائبہ بھی نہیں محسوس ہوتا تھا۔ وہ مسکرا کر میری طرف دیکھتے تو لگتا جیسے بادلوں سے چاند نکل آیا ہو، جیسے چلچلاتی دھوپ میں سایہ پتر آگیا ہو، جیسے تپتی دوپہر میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا گزر جائے، جیسے بے آب و گیاہ صحرا میں تھوہڑ کی کسی شاخ پر کوئی شاداب پھول نظر آجائے!

ایک راندہ خلق یہ فام غلام پر نظر اٹھانے کی بھی بھلا کوئی اہمیت ہے لیکن جب وہ میری طرف دیکھتے تو اس توجہ سے کہ جیسے اُن کے نزدیک یہ دنیا کا اہم ترین کام تھا۔ یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ہر چھوٹے بڑے کام کو انتہائی اہمیت اور مکمل یکسوئی سے انجام دینا اُن کی عادت تھی۔

اُن کی مسکراہٹ ایک سچے انسان کی مسکراہٹ تھی اور میرے لئے یہی احساس ان کی ہر بات کی صحت کی ضمانت تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ اگر محمدؐ کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے تو یقیناً ایک ہی ہوگا۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں تو واقعی وہ اللہ کے رسول ہوں گے۔ اگر محمدؐ کہتے ہیں کہ وہ فرشتے سے ہم کلام ہوئے ہیں تو ضرور ہوئے ہوں گے۔ مگر یہ ساری سوچ میرے لاشعور میں تھی۔ شعوری طور پر مجھے اس کا ادراک اُس وقت ہوا جب امیہ رات کو غلام خانے میں آیا اور اُس نے مجھ سے براہ راست سوال کیا:

میں بلال حبشی، دوسرے درجے کا انسان بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا مگر اس بار میری سوچ میں احساس گناہ شامل نہیں تھا۔ گپ اندھیرے میں ایک جوت جاگی تھی۔ یہ اجالا میرے لئے کیا لے کر آئے گا اس روشنی میں جو کچھ نظر آئے گا، میں اس کا متحمل بھی ہو سکوں گا یا نہیں۔ مگر یہ ساری باتیں بعد کی تھیں۔ اُس وقت سب سے مقدم بات یہ تھی کہ تاریکی میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی ہے اور مستقبل جو بھی ہو، حال سے بدتر نہیں ہو سکتا۔ اپنی اس سوچ کی مجھے بہت بڑی قیمت چکانا پڑی۔ وہ قیمت جو میرے خیال میں میرے پاس تھی ہی نہیں۔

میں نے محمدؐ کو کئی بار دیکھا تھا لیکن آج تک اُن سے بات نہیں کی تھی۔ عکاظ کے پس روزہ سالانہ بڑے میلے کے بعد جب قافلے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کے لئے مکے سے نکلتے ہی اپنے گرد و غبار میں گم ہو جاتے تو مکہ سے سکر سا جاتا۔ گلیوں میں دوبارہ وہی جانے پہچانے چہرے نظر آنے لگتے۔ یہ سب میرے واقف نہیں تھے لیکن صورت شناس میں سبھی کا تھا۔ بہت سے تو غلام سمجھ کر میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ کچھ پہچانتے بھی تھے لیکن اُن کا مجھ ایسے غلام کے ساتھ راہ و رسم رکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا لیکن محمدؐ مختلف تھے۔ وہ جب بھی پاس سے گزرتے تو مجھے محبت کے انداز سے مسکرا کے دیکھتے۔ یہی وہ محمدؐ تھے جو اللہ کی وحدانیت کی باتیں کر رہے تھے۔

محمدؐ مجھے اچھے لگتے تھے۔ اپنی ذات میں اچھے لگتے تھے۔ کسی سو دو زیاں کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ تھے تو پہلے درجے کے انسانوں کی صف میں مگر مجھے لگتا تھا کہ اوروں کی طرح وہ مجھے نچلے درجے کا انسان نہیں سمجھتے تھے۔ اُن سے مجھ غلام کا کوئی براہ راست تعلق نہیں تھا اور ہو بھی کیا سکتا تھا مگر اپنی جماعت کے انسانوں میں وہ واحد شخص تھے جن کی مسکراہٹ کو میں نے اپنے لئے محسوس کیا تھا بلکہ یوں کہئے کہ اُس وقت شاید میری ساری زندگی کی واحد خوشی وہ ایک لطیف سا تعلق تھا جو اُن کے تقسیم ہر راہے سے قائم ہو گیا تھا۔ اُن

”سچ بتا تیرا معبود کون ہے؟“

”محمدؐ کا معبود میرا معبود ہے!“

میرا جواب سنتے ہی اس کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی مگر شاید وہ اس جواب کے

لئے تیار تھا۔ کہنے لگا:

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تو ہمارے خداؤں سے انکار کرتا ہے؟“

”محمدؐ الامین ہیں۔ انہیں ایک فرشتے نے بتایا ہے کہ اللہ ایک ہے۔“

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کل میں عمار کے جن الفاظ پر معترض تھا، وہی الفاظ آج میری اپنی زبان سے نکل رہے ہیں۔ کل میں عمار کی وجہ سے خائف تھا مگر آج میں اپنے لفظوں پر بھی خائف نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں اس دیدہ دلیری کی سزا سے بے خبر تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے میرے اندر طاقت کا ایک سیلاب اُٹ آیا ہے جس کے سامنے امیہ اور اُس جیسے کئی، خس و خاشاک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ امیہ مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی دھمکیاں دیتا ہوا غلام خانے سے باہر چلا گیا۔ مجھے اُس وقت وہ ایک بے بس چوہ لگ رہا تھا جس کا کوئی کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔

اس واقعے کے بعد اب روز کا یہ معمول ہو گیا کہ مجھے دوپہر کو غلام خانے سے باہر نکالا جاتا اور دھوپ میں جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر میرے سینے پر تپتی ہوئی بھاری بھاری چٹانیں رکھ دی جاتیں کہ میں ہل بھی نہ سکوں۔ اسی حالت میں امیہ مجھ پر کوڑے برساتا اور مجھے مجبور کرتا کہ میں اُس کے خداؤں کو تسلیم کروں۔ میری کمر پر پہلے چھالے پڑے جو ایک دو روز میں زخم بن گئے جن سے خون رستار ہوتا تھا۔ مگر امیہ نے میرے معمول میں فرق نہ آنے دیا بلکہ ہر روز اس کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ہر روز میرے لئے گزشتہ دن سے زیادہ گرم ریت تلاش کی جاتی، پہلے سے زیادہ وزنی چٹانیں ڈھونڈی جاتیں اور پہلے سے زیادہ کوڑوں کی ضربیں۔

ہر روز میں مرنے کے قریب ہو جاتا مگر امیہ کے سوالوں کا جواب میں ’احد‘ ’احد‘ کے سوا کچھ نہ کہتا۔ ایک دن اُس نے تنگ آکر مجھے ایک رات اور ایک دن بھوکا رکھا اور پھر مجھے گرم ریت پر لٹا کر مارنا شروع کر دیا مگر میں چٹانوں کے نیچے دبا دبا بھی اُس کے ہر سوال کے جواب میں ’احد‘ ’احد‘ ہی دہراتا رہا۔

ہونج کے سارے محلے کو علم تھا کہ بلال کی اصلاح کی جا رہی ہے۔ بعد میں ایک دفعہ عمرو بن العاصؓ نے مجھے بتایا کہ انہوں نے بھی مجھے سزائیں پاتے دیکھا تھا۔ چوہ میرے نام سے واقف ہو گیا تھا۔ ابو بکرؓ بھی جو ہونج ہی کے محلے میں رہتے تھے، مجھے روز دیکھتے تھے اور نظریں نیچی کر کے چلے جاتے تھے۔ جب دھوپ اور کوڑوں کی سزا کا گرنہ ہوئی تو امیہ نے میرے گلے میں رستی باندھ کر مجھے ہونج کے لڑکوں کے حوالے کر دیا۔ بچے سارا دن چیختے چلاتے، قہقہے لگاتے مجھے مکے کی اونچی نیچی پتھرلی سڑکوں پر کھینچے پھرتے۔ اُن کے قہقہوں میں میری چیخ نکال کر کسی کو سنائی نہ دیتی۔ بچوں کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا اور وہ اس سے پورا پورا لطف اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ رستی سے میری گردن کو جھٹک دیتے تو میں گر پڑتا۔ اور پھر وہ سب مل کر مجھے گھسیٹنے لگتے۔ میں اٹھنے کی کوشش کرتا تو ٹھوکریں مارتے۔ کبھی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا تو پھر رستی کے جھینکے سے مجھے گرا دیتے۔ میں منہ کے بل گرتا تو پھر مجھے گھسیٹنا شروع کر دیتے۔ کبھی رسی اس زور سے کھینچتے کہ میرا دم گھٹنے لگتا۔ نوکیلے کنکروں، سنگریزوں اور پتھروں کی رگڑ سے روز میرے بدن پر نئے زخم ہتے۔ پہلے زخم بھرنے بھی نہ پاتے کہ پھر کھل جاتے۔ میرا سارا جسم لمبو لہان ہو جاتا۔ دوپہر کے بعد جب سارا مکہ تپ اُٹھتا تو وہ میرے کپڑے اترا کر مجھے لوہے کی زرہ پھینا دیتے اور دھوپ میں ڈال دیتے۔ ایک دن انہوں نے مجھے دیکھنے کو نکلوں پر لٹا کر میرے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا۔ آج بھی میرے جسم پر اُن کو نکلوں کے داغ ہیں۔ ایک دن مدینے میں میں رسول کریمؐ کے گھر کا سودا سلف لے کر آ رہا تھا کہ میری چادر



شانوں سے سرک گئی۔ عبیدہ بن حارثؓ میرے پیچھے آرہے تھے۔ انہوں نے میرے جسم کے داغ دیکھے تو ان پر رقت طاری ہو گئی۔ مگر کیسی کیسی لوٹاٹھی ہے ان داغوں سے، کیسی کیسی شعاعیں پھوٹی ہیں۔

سورج ڈھلتے ہی میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے دوبارہ غلام خانے کے فرش پر پھینک دیا جاتا۔ میرا سارا جسم زخمی ہو گیا تھا بلکہ پورا بدن ایک زخم بن گیا تھا جس سے ہر وقت خون بہتا رہتا تھا۔ عوٹخ میں میرا تماشا ایک دفعہ حسان بن ثابتؓ نے بھی دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے خود بتایا کہ وہ کئی عرصے میں عمرہ کرنے گئے ہوئے تھے مگر میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ تماشا کب تماشائی کو دیکھتا ہے۔ لیکن ایک ضعیف شخص مجھے یاد ہے اور میں اُسے کبھی نہیں بھولوں گا۔ ورقہ بن نوفل۔ میں روزمرہ کی طرح گرم چٹانوں تلے دبامیہ کے کوڑے کھا رہا تھا اور وہ مجھے ہر کوڑے پر لات اور عزیمی کی عبادت پر مجبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُدھر سے ورقہ کا گزر ہوا۔ وہ میرے منہ سے 'احد، احد' کی آواز سن کر رُک گئے اور انہوں نے آواز بلند کہا "بلال وہ واقعی ایک ہے" پھر انہوں نے امیہ سے مخاطب ہو کر کہا:

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تو نے اسے مار ڈالا تو میں اس کی قبر پر درگاہ تعمیر کروں گا۔"

مگر امیہ باز نہ آیا۔ ہر روز دوپہر کو جب بچے مجھے مار مار کر نڈھال کر دیتے اور ریت پر لٹا کر میرے لو پر چٹانیں رکھ دیتے تو وہ بھی کوڑا گھماتا وہاں پہنچ جاتا اور ہر کوڑے کی ضرب کے بعد مجھ سے پوچھتا کہ میں محمدؐ کے منحرف ہوا ہوں یا نہیں؟ مگر میرا جواب 'احد، احد' کے سوا کچھ اور نہ ہوتا۔ شاید میں کچھ اور کہنا ہی بھول گیا تھا۔ میرا روزمرہ کا قصہ بسمل بھی جب اُس کے دل کی مراد بر نہ لاسکا تو ایک دن اُس نے ایک قطعی فیصلہ کر لیا۔ آج کی رات بلال کی آخری رات ہوگی۔ کل کی صبح اُس کی آخری صبح۔ شدید ترین اذیتیں اور پھر موت!

## آخری رات، پہلا دن

موت کا قرب کبھی کبھی انسان کے اندر شمعیں روشن کر دیتا ہے۔ میرے اندر بھی اس رات اللہ نے اپنی رحمت سے ایک جوت جگا دی۔ میں نے اپنے والد اور والدہ کو دیکھا جو ایک کارخانے میں کام کر رہے تھے۔ یہ چزارنگے کا کارخانہ تھا جس میں چاروں طرف بھاپ اٹھ رہی تھی اور بھاپ نے میرے ماں باپ کو ڈھانپ رکھا تھا۔ جب میں ان کے قریب گیا تو ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ اُن کی اُداس آنکھوں میں میرے لئے بے پناہ محبت اور شفقت جھلک رہی تھی۔ میرے والد نہایت قوی انسان تھے لیکن اُن کی جسمانی قوت کو اس بے دردی سے استعمال کیا گیا تھا کہ وہ جوانی میں بھی بوڑھے نظر آتے تھے۔ میری ماں کھانس رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کھانسنے جا رہی تھی، یہاں تک کہ کھانسنے کھانسنے اُس نے دم دے دیا۔

میرے والدین جشہ سے آئے تھے، حیرت آمیز امر پار کر کے۔ مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ غلام کیسے بنائے گئے۔ انہوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔ شاید اس لئے کہ ایسی

ساتھ۔ اُس رات میں نے ایک سُرخ بھورا بھی دیکھا تھا جو تیز دھوپ میں ایک ٹھنڈے نخل پر بیٹھا تھا۔ آج بھی جب کہیں مجھے سُرخ بھورا نظر آجاتا ہے، میرا سارا دن خوشی میں گزر جاتا ہے۔ یہ سُرخ بھورے، روئے ارض پر پھیلی ہوئی مخلوق، قبروں میں لینے ہوئے میرے ماں باپ یہ سب کہاں سے آگئے تھے اُس رات، موت نزدیک محسوس ہوتی ہے تو انسان کا ذہن کہاں سے کہاں چھلانگیں لگاتا پھرتا ہے۔

پھر عمار کے واقعے کی تفصیل نظروں کے سامنے پھرنے لگی۔ میں کیسے پھنس گیا اس سارے معاملے میں؟ میرا کیا واسطہ تھا؟ ذہن سے جواب آیا۔

’عمار۔ عمار نے تجھے اس دلدل میں دھکیلا ہے۔

لیکن عمار میرا کیا لگتا تھا؟ کیا رشتہ تھا میرا اُس سے یا اُس کا مجھ سے؟

اگر میں واقعی اُسے کوڑا ماز دیتا تو وہ ہرگز مجھے الزام نہ دیتا۔ اُسے پتہ تھا کہ غلام حکم عدولی کر ہی نہیں سکتے۔ بلکہ اُس بے چارے نے تو خود کوڑا میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ لیکن پھر بھی میرا ہاتھ اُس پر نہیں اٹھ سکا۔ دراصل اس میں عمار کا قصور نہیں تھا۔ میرے اندر، حبشی غلام ہلال کے اندر، کوئی کہہ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو آج حکم کی تعمیل نہیں ہوگی۔

غلام خود تو ایسے فیصلے نہیں کر سکتے۔ غلام تو کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ فیصلے بغیر اختیار کے نہیں ہوتے اور غلاموں کے پاس اختیار کہاں! تو پھر کوڑا میرے ہاتھ سے کیسے گر گیا۔ غلام کو تو خود اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے۔ پھر کیسے ہو گئی مجھ سے یہ حکم عدولی۔ میں نہ بہادر تھا، نہ احمق کہ بغاوت پر اتر آتا۔ پھر کہاں سے آیا مجھ میں یہ حوصلہ۔ اس کا جواب کہیں اور تھا۔ یہ حوصلہ مجھے محمدؐ سے ملا تھا۔

رات بھر میں غلام خانے کے فرش پر کس پیرسی کے عالم میں پڑا کر اہتا رہا۔ رسیوں سے جکڑا ہوا۔ رسیاں میرے زخموں میں دھنسی جاتی تھیں اور میری ذہنی کیفیت ایسی

باتوں کو بھلا کر ہی وہ غلامی کی صعوبتیں برداشت کرنے کے قابل ہوئے تھے۔ ایک دن میری ماں نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ میں پیدا تو حالتِ غلامی میں ہوا لیکن جب میں اپنی ماں کے شکم میں آیا تھا تو میرے ماں باپ آزاد تھے۔ یہ بات میرے لئے کوئی خاص تسلی کا باعث نہیں تھی، پھر بھی کبھی کبھی میں اس پر خوش ہو لیا کرتا تھا۔

پھر اس رات میں نے اپنے ماں باپ کی گفتگو سنی۔ وہ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے مشورہ کر رہے تھے کہ کیوں نہ ہم اس بچے کو مار ڈالیں اور اسے پیدا انٹی غلامی کی لعنت سے چالیں۔ میرے آنسو بہہ نکلے۔ اپنے دکھ پر نہیں، اُس کرب پر جو میرے والدین نے یہ فقرے کہتے ہوئے اپنے اندر محسوس کیا ہوگا۔

مجھے وہ دن بھی یاد آیا جب میں جوان ہونے پر بازار میں پہلی بار فروخت کے لئے لایا گیا تھا۔ اب میں لن غلام نہیں بذاتِ خود غلام بننے والا تھا۔ پھر اس کے بعد میں کئی بار بکا۔ اونٹوں کے ساتھ، بجزیوں کے ساتھ، بھیردوں کے ساتھ اور بالکل انہی کی طرح۔ آج دمشق میں بیٹھ کر میں اُن باتوں پر ہنس سکتا ہوں مگر سوچتا ہوں مجھ پر کیسے کیسے دور گزرے ہیں۔ گرم ریت اور دھکتے انگاروں پر لٹائے جانے کے دور، مکے کے گلی کوچوں میں گلے میں رستی باندھ کر پھرائے جانے کے دور، گرم پتھروں تلے دبائے جانے کے دور، ڈنڈوں سے پٹائی کے دور، ٹھوکروں کے دور، کوڑوں کے دور لیکن اُس رات اُمیہ کے غلام خانے میں جب میری گردن میرے گھٹنوں سے جکڑی ہوئی تھی میرے ذہن میں ہنسی کا تصور بھی نہیں تھا۔

پھر اسی کرب کے عالم میں میں نے اپنے گرد پھیلی ہوئی زندگی کے حسن کو محسوس کیا۔ وہ حُسن جو جلد ہی مجھ سے چھننے والا تھا۔ چاند تارے، دن رات، آتے جاتے موسم، دریاؤں، پہاڑوں، میدانوں اور جنگلوں میں جیتی جاگتی، رنگ برنگی مخلوق اور ان سب کا سردار انسان اپنی تمام آرزوؤں، امنگوں، اُداسیوں، خوشیوں، مجبوریوں، کامرانیوں اور قربانیوں کے

گزر گیا، اُن کے پاؤں پکڑتا، زمین پر ماتھا رگڑتا، اُن سے رحم کی بھیک مانگتا لیکن جب ایسا نہ ہوا تو وہ سمجھے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ خوف سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ میں اپنے خالقِ حقیقی کے حصارِ عاطفت میں ہوں اور اب وہ جو کچھ بھی کریں گے، یا نہیں کریں گے، وہ سب میرے رب ہی کی رضا سے ہوگا۔ انہوں نے مجھے میری جائے عقوبت پر لے جانے کے لئے زمین سے اٹھایا مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ میرا اللہ مجھے پہلے ہی اُن کے ہاتھوں کی پہنچ سے کیسے زیادہ بلندی پر لے جا چکا ہے۔

تھی جیسے اندر ہتھوڑے چل رہے ہوں۔ تھوڑا سا خیال یہ بھی آتا تھا کہ اگر حج میں اُن کی خوشامد کروں، واسطے دوں، منت سماجت کروں، اُن کے قدموں پر سر رکھ دوں تو شاید مجھے زندگی اور موت کے درمیان ایک حدِ فاصلہ میسر آجائے۔ کوئی امید تو ہوگی جو میں زندہ تھا۔

صبح ہو رہی تھی۔ میں نے گہرے گہرے سانس لے کر نئے دن کی تازہ ہوا کو اپنے اندر جذب کیا مگر اب میرا ذہن پھر اُس ایک اللہ کے تصور کی طرف چل پڑا۔ اُن دنوں میں بالکل ان پڑھ تھا۔ میری سوچ میں کوئی اجد شامل نہیں تھی۔ میں چل تو پڑا ایک انجانی، ان دیکھی راہ پر لیکن محض ایک خانہ بدوش کی حیثیت سے، جسے پیاس تو ضرور لگتی ہے مگر راستے کے کنویں اُس کے اپنے نہیں ہوتے۔ مجھے بھی پیاس تھی، شدید پیاس۔ کنویں میرے نہیں تھے لیکن میں پیاسا تھا اور یہ پیاس مجھے کھینچنے لئے جارہی تھی۔ نامانوس راہوں پر، نہ جانے کس منزل کی طرف!

اُس دن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میں نے اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیا۔ یہی میرا اسلام تھا۔ میرے اندر مٹھاس کی ایک لہر دوڑ گئی، ایسی کہ مجھے اپنے بندھنوں میں بھی چین ملنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میری عاقبت صرف اور صرف اُس ایک اللہ کے قُرب میں ہے، یہ سچائی میرے دماغ میں نہیں میرے دل میں، میری روح کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ میں نے عبادت شروع کی تو میرا باطن نور نور ہو گیا۔ میں نے ربِ جلیل کی حمد و ثنا کی تو میرے اندر انجانی قوتوں کے سوتے اُبل پڑے۔ میں نے اللہ کی رحمتوں کی تلاش کی تو خوف میرے اندر سے نکل گیا۔

اور پھر اللہ کی قدرت سے سورج طلوع ہوا۔

جب وہ مجھے لینے کے لئے آئے تو میں سر پائشکر تھا۔ اُن بد نصیبوں کو کیا خبر تھی کہ یہاں کیا ہو چکا ہے۔ انہیں شاید توقع تھی بلکہ مناسب بھی یہی تھا کہ میں اُن کے سامنے

## اجرِ عظیم

انہوں نے مجھے اٹھایا اور بڑی تیزی سے باہر لے گئے۔ ہمیں دیکھ کر گلیوں میں کچھ کھڑکیاں بند ہوئیں۔ لوگ عام طور پر ظالم نہیں ہوتے، بہت کم ہوتے ہیں جو دوسروں پر تشدد ہوتا دیکھ سکتے ہیں۔ ویسے بات سب کی سمجھ میں آگئی تھی۔ سارا مکہ جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ غلاموں کو راہِ راست پر لانے کے معاملے میں اہل مکہ کا آپس میں مکمل اتفاق تھا۔ میں نے بغاوت کی تھی، حکمِ عدولیٰ کی تھی، اپنے آقا کو اُس کے احباب کے سامنے رسوا کیا تھا، اُس کے مذہبی عقائد سے ٹکری تھی، اور ایسی بے راہ روی برداشت نہیں کی جاسکتی تھی۔

جہاں تک اُمیہ کا تعلق تھا، اس کے لئے بات بالکل واضح تھی۔ وہ مجھے مجرم سمجھتا تھا۔ خطا کار، قصور وار۔ میں اپنی حرکتوں کی وجہ سے محیثیتِ غلام اپنی قیمت گنوا بیٹھا تھا۔ اس لئے وہ مجھے اُس رقم کا دین دار سمجھتا تھا جو اُس نے مجھ پر خرچ کی تھی۔ اب صرف میری کھال اُس کے کام کی تھی۔ وہ اسے کھنچوا سکتا تھا، کتوں کے آگے پھنکوا سکتا تھا، دوسرے غلاموں کی

آئی اور کان لگا کر میری نحیف آواز سننے کی کوشش کی۔ 'اُحد، اُحد'۔ یہ سُن کر مڑی اور ہنستی ہوئی واپس چلی گئی۔ ہند کی ہنسی بڑی مترنم تھی۔

”یہ بد نصیب تو وعظ کر رہا ہے۔“

اور پھر مجھ پر کوڑے برسے لگے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔

میں نے اکثر سوچا ہے کہ شاید اُس دن میں درخت پر پڑے کسی جھولے پر جھولتا ہوا موت کے دامن میں پہنچ گیا لیکن ایسا نہیں تھا۔ موت کیا ہوتی ہے یہ صرف وہی جانتے ہیں جو واقعی مر جاتے ہیں، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ میں ہر درد سے آزاد ہو چکا تھا۔ مجھے کسی تکلیف کا احساس نہیں رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اپنی دانست میں مجھ پر ظلم کرنے والے میری دنیا سے بہت دور کہیں اپنے ظلم میں مصروف ہیں، یہاں تک کہ جب انہوں نے مجھ پر تپتی ہوئی چٹانیں رکھیں، جن کے بوجھ تلے میری موت یقینی تھی، تو مجھے صرف اتنا محسوس ہوا کہ انہوں نے ایک کھیل ختم کر کے دوسرا شروع کر دیا ہے۔ میں اُن کی پہنچ سے باہر جا چکا تھا۔ اُن کی حرکتیں مجھے احقانہ لگ رہی تھیں بالکل چچگانہ۔ مجھے وہ ایسے لگ رہے تھے جیسے عکاظ کے میلے پر تاپنے والی بھیزیں۔

پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں اور چہرہ آسمان کی طرف اٹھا دیا۔ مجھے اپنے سامنے سرسبز و شاداب کھیت نظر آنے لگے۔ چاروں طرف پھلوں سے لدے ہوئے درخت تھے۔ میں نے بہتے جھرنوں کی گنگناہٹ سنی۔ مجھے اپنے اوپر ایک روح پرور سائے کا احساس ہونے لگا۔ پھر میں ایک نہایت خوبصورت باغ میں داخل ہو گیا جہاں ہر رنگ، ہر نسل کے نوجوان مرد عورتیں سیر و تفریح میں مشغول تھے۔ اُن کے چہروں پر وقار تھا اور اُن کے پور پور سے خوشیاں پھوٹ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور ایک فوارے کے پاس لے گئے جہاں میں نے پانی پیا۔ اتنا کہ میری روح کی پیاس بجھ گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں ذاتِ باری

عبرت کے لئے اُس کی نمائش لگوا سکتا تھا۔ آج میں یہ سب باتیں سوچتا ہوں تو مجھے اُمیہ پر ترس آتا ہے کیونکہ جو دوسروں سے ناانصافی کرتا ہے، وہ درحقیقت اپنے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔

وہ مجھے ایک میدان میں لے گئے جس کے پتوں پہنچ ایک لکڑی کا کھمبا گڑا ہوا تھا۔ اس کھمبے سے انہوں نے مجھے مضبوطی سے جکڑ دیا۔ اُمیہ نے کوڑا سنبھال لیا۔ میں اس تشدد کی روداد بیان نہیں کروں گا۔ درد کی یاد نہیں ہوتی۔ درد جب ہوتا ہے تب ہوتا ہے، اُس کے بعد نہیں، صرف اتنا کہوں گا کہ اللہ سورج سے زیادہ طاقت ور ہے اور کوڑے انسان کی روح کو نہیں جھٹھکتے۔

مجھے یاد ہے کہ اُس وقت میں زور زور سے اللہ کو پکار رہا تھا۔ ایک ہی طریقے سے جو مجھے آتا تھا اور ایک ہی نام سے جو میں جانتا تھا 'اُحد، اُحد'۔ میں بلال جس نے اب تک ہزاروں لاکھوں لوگوں کو نماز کے لئے پکارا ہے، اُس وقت عبادت کے طریقوں سے واقف نہیں تھا لیکن جب میں نے اُس کا نام پکارا تو میرے دل نے گواہی دی کہ اُس نے سن لیا۔ کوڑے پڑتے تھے تو میں چیختا نہیں تھا۔ میں نے اپنی زندگی کی باقی ماندہ سانسیں اللہ کے لئے وقف کر دی تھیں۔ ہر کوڑے پر میری آواز مدہم ہوتی جا رہی تھی مگر میں اُسی کا نام لیتا رہا۔ میں نے اُن سے رحم کی التجا نہیں کی۔ صرف اپنے اللہ سے رحم مانگا۔

اگر میں دو چار کوڑوں ہی میں دم دے دیتا، جو عین ممکن تھا تو اُمیہ یقیناً یہ سمجھتا کہ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہو گیا ہے اور اُس کے ذوقِ ایذارسانی کی تسکین نہ ہوتی اور وہ شاید مجھے دوہرا مجرم سمجھنے لگتا۔ ایک تو اُس کی رقم ڈوٹی، دوسرے غلام مناسب سزا کے بغیر ہی فراغت حاصل کر گیا۔

کوڑوں کا ایک دور ختم ہوتا تو وقفہ ہوتا اور پھر دوسرا دور شروع ہو جاتا۔ ایسے ہی ایک مختصر وقفے میں ابو سفیان کی بیوی ہند چھاتتا لئے ہوئے، خوشبوؤں میں بسی میرے پاس

تعالیٰ کے قرب میں ہوں۔

میں نہیں جانتا یہ کیا تھا۔ واہمہ تھا، خواب تھا، کوئی وجدانی کیفیت تھی، کوئی مافوق الفطرت کرشمہ تھا، کوڑوں سے میرا دماغ معطل ہو گیا تھا یا محض میری افتاد طبع تھی یا پھر اس کیفیت میں یہ سارے ہی عناصر شامل تھے۔ بہر کیف جو کچھ بھی تھا جلد ہی ختم ہو گیا لیکن میں آج بھی اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ بلال کیا واقعی تو نے جیتے جی جنت بریں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا!

## آخری سزا

میں نے کچھ آوازیں سنیں جیسے لوگ آپس میں کسی بات پر بحث کر رہے ہوں۔ ایک تو امیہ تھا مگر یہ ایک لورڈ رادھیسی آواز کس کی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی بہت کوشش کی مگر سورج جو اس وقت اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ آگ برسا رہا تھا، مجھے چند ہیائے دے رہا تھا۔ کچھ رقم کا ذکر ہو رہا تھا۔ یہ تو کوئی نئی بات نہیں تھی مکے کا معمول تھا۔ مکے میں دولت کمانے کا شوق و باکی طرح پھیلا ہوا تھا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا میں دوبارہ سو جاؤں اور پھر غلام کی حیثیت سے کبھی نہ جاؤں، کبھی نظر نہ آؤں ان لوگوں کو، کبھی ان کی آوازیں نہ سنوں۔ اب میں وہ جان گیا تھا جو آج سے پہلے نہیں جانتا تھا۔

اللہ رحیم و کریم جب کسی کو اس دنیا سے اٹھاتا ہے تو اس کے عمل میں نرمی ہوتی ہے لیکن انسان جب اپنے کسی ساتھی کی جان لینا چاہتا ہے تو اس کے لئے نہایت اذیت ناک منصوبے بناتا ہے مگر اس کڑے وقت میں بھی اللہ اپنے بندوں کے شامل حال رہتا ہے۔ میری

نہیں، دو سو میں سودا ہو گا۔ دو سو درہم میرے حوالے کر دو لو لے جاؤ اسے۔“

میرے لو پر رکھے ہوئے بھاری پتھر ہٹائے گئے۔ میری مکھنیں کھول دی گئیں۔ بلال ایک بار پھر بکا، ایک بار پھر خریزا گیا۔ لیکن اس بار صرف ایک منٹ کے لئے۔ ایک نوجوان نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ میری آنکھیں خون لور آنسوؤں سے اتنی دھندلائی ہوئی تھیں کہ مجھے اُس کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ کچھ دیر میں میری نظر ٹھہری تو میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ زید تھے، محمد کے منہ بولے بیٹے۔ زید بن حارثہ نے کہا:

”بلال! اب تم آزاد ہو!“

میں خاموش رہا۔ اس ایک فقرے کے بعد میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ ادھر اُمیہ لہک لہک کر اپنی رقم گن رہا تھا۔ اُس کی ہنسی تھی کہ تھم نہیں رہی تھی۔

”لکن ابو بکر! تم نے اس کے دو سو درہم دئے ہیں، میں تو اسے سو پر بھی بیچنے کو تیار

تھا،۔۔ اس پر ایک ترقمہ گونجا۔

اب میں نے ابو بکر کو دیکھا۔ ایک شخص جس کا چہرہ قدیل کی طرح روشن تھا۔  
”اُمیہ! ادھو کا میں نے نہیں، تم نے کھایا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو یمن کی بادشاہی بھی اس کے آگے بیچ ہے۔“

کیا میری قیمت واقعی اتنی بڑھ گئی تھی؟ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ چلنا تو درکنار، میں کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ابو بکر نے مجھے ایک بازو سے پکڑا، زید نے دوسرے سے لوہ مجھ نیم مردہ کو ادھار استہ چلاتے لوہا تقریباً گھسیٹنے ساتھ لے گئے۔

پانچ دن تک میں ابو بکر کے گھر ایک تاریک کمرے میں بے ہوش پڑا رہا۔ کبھی تھوڑی دیر کے لئے ہوش بھی آجاتا تھا مگر زیادہ عرصہ بے ہوشی طاری رہتی تھی۔ میرے بستر کے گرد سرگوشیاں کرتے ہوئے مجھے مرہم لگاتے، تیل ملتے اور میرے بدن پر ٹھنڈے پھاہے رکھتے۔ ایک بار مجھے ہوش آیا تو میں نے کمرے کے ایک گوشے میں کسی کو عبادت

اس آزمائش کی گھڑی میں وہ میرے ساتھ بھی تھا۔ اسی نے اس آزمائش پر پورا اترنے کے لئے مجھے ایک خاص شعور دے کر اپنے کرم سے نوازا۔

اب میرے کانوں میں ایک تیسری آواز آئی۔ بڑی جانی پہچانی آواز! ابو جہل مجسم اختیار بنا حکمانہ انداز میں کہہ رہا تھا:

”یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے کہ غلام کو سزا ختم ہونے سے پہلے خریدایا بیچا جائے۔“ میں نے اپنے حواس قائم کرنے کی کوشش کی۔ اب یہ اُمیہ تھا:

”یہ غلام تو پہلے ہی مر چکا ہے۔ اگر ابو بکر اس کی لاش کے سو درہم دیتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

ابو بکر! اچھا تو یہ تھی وہ دھیمی سی آواز جو میں نے کچھ دیر پہلے سنی تھی مگر ابو بکر یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟

دھوپ کی شدت کے باوجود میں نے آنکھیں کھولیں اور اس چھوٹے سے عمل کے لئے مجھے لگا جیسے میں نے اپنے سارے جسم کا زور لگا دیا ہو۔ دھوپ کے دیکتے جہنم کے اُس پار سے مجھے اُمیہ کی آواز آئی۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا، چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

”غلام..... زندہ ہے، زندہ ہے۔ میں نے ابھی اُسے حرکت کرتے دیکھا ہے۔“

وہ نہایت تیزی سے میرے قریب آیا اور سرگوشی کے سے انداز میں میرے کانوں کے پاس منہ لاکر بولا:

”سانس لے، ارے بد بخت یہ فام حیوان سانس لے!“

سارا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ شخص جو گھنٹوں سے میرے خون کا پیاسا تھا، مجھے زندہ رہنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ دیکھا جائے تو زندگی میں ہنسی کم اور ہنسنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ اُمیہ پھر کچھ کہہ رہا تھا:

”ابو بکر! غلام نے اپنے جسم کی حرکت سے اپنی قیمت چڑھالی ہے۔ اب سو میں

کرتے دیکھا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ چھٹے دن صبح کے وقت میں چند قدم اٹھانے کے قابل ہو گیا۔ میں اپنے قدموں پر چل کر باہر کھلی فضا میں آیا تو ابو بکرؓ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ فوراً ایک بکری لائے اور میرے سامنے اُس کا دودھ دوہ کر مجھے پلایا۔ پھر وہ بولے:

”اللہ کے رسولؐ متواتر تین دن تک تمہارے کمرے میں جا کر تمہاری صحت کی دُعا کرتے رہے۔ جب تک تمہارا اختار نہیں اُترا، انہوں نے دعائیں جاری رکھیں۔ تمہاری صحت پر وہ اتنے خوش تھے کہ میں نے کبھی کسی کو اتنا خوش نہیں دیکھا۔ وہ کہتے تھے بلال اسلام میں داخل ہو گیا ہے۔ کل ہم دونوں اُن کی خدمت میں حاضری دیں گے۔“

ابو بکرؓ مجھ سے پہلے بھی چھ غلاموں کو آزاد کرا چکے تھے جن میں عامر بن فہیرہ جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں میں دائرہ اسلام میں داخل ہونے والا ساتواں شخص تھا، کچھ کہتے ہیں نواں لیکن میرے لئے یہی بہت ہے کہ میں سابقوں الاؤلون میں تھا۔ بہت بڑا اعزاز تھا یہ ایک بے نوا غلام کا۔ میری اوقات ہی کیا تھی۔ میں وہی تو تھا جو ایک پتھر کے نیچے پڑا پایا گیا تھا۔

## دربار رسالت میں

دوسرے دن ابو بکرؓ مجھے اُن کی خدمت میں لے گئے۔

اُن کی کشادہ پیشانی، اُنکی عالی ظرفی اور نجات کا مظہر تھی۔ اُن کی مسکراہٹ روح میں خوشیوں کی لہر دوڑا دیتی تھی۔ اُن کی خوب صورت متناسب آنکھوں کی سیاہی میں گہرے بادامی رنگ کی ہلکی سی آمیزش تھی۔ ہاتھ ملاتے تھے تو مضبوطی سے، اور اُس وقت تک گرفت ڈھیلی نہیں کرتے تھے جب تک دوسرا اُن کا ہاتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ زمین پر اُن کے قدم اتنے ہلکے پڑتے تھے کہ لگتا تھا پانی پر چل رہے ہیں۔ پیچھے دیکھنے کے لئے مڑتے تھے تو صرف گردن نہیں موڑتے تھے بلکہ کمر سے اُن کا سارا جسم ساتھ مڑتا تھا، یہ محمدؐ تھے۔ اللہ کے برگزیدہ رسول صل اللہ علیہ وآلہ وسلم!

جب میں پہلی مرتبہ اُن سے ملا تو وہ تنکوں کی ایک سادہ سی چٹائی پر اپنے عم زاد علیؓ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ علیؓ نے جو اُس وقت بچے



تھے، اُن کا ہاتھ تھام کر کہا:

”آپ کیوں رورہے ہیں۔ یہ کوئی بُرا آدمی ہے کیا؟“

”نہیں علی! نہیں۔ یہ وہ شخص ہے جسے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوئی ہے۔“

یہ کہہ کر محمدؐ جلدی سے اٹھے اور مجھ سے بغلخیم ہو گئے، اور مجھے گلے لگائے لگائے

فرمایا:

”بلال! جب تک دنیا قائم ہے، یہ بات یاد رکھی جائے گی کہ اسلام کی راہ میں اذیت

برداشت کرنے والے پہلے شخص تم تھے۔“

اُن کے گرم گرم آنسو میرے چہرے پر گر رہے تھے۔ جب سے میرے ماں باپ

اللہ کو پیارے ہوئے تھے، یہ پہلے شخص تھے جن کے محبت بھرے آنسو میں نے اپنے چہرے

پر محسوس کئے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے کسی نے ایک گڑھے کی تہ سے بہ حفاظت باہر نکال لیا

ہو لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ لمحہ خوشی کا نہیں تھا۔ میری خوشی کا کیا محل تھا جب محمدؐ

اشکبار تھے۔ کائنات کا سب سے پاک صاف دل میری وجہ سے غمزدہ ہوا تھا۔ یہ بات میری فہم

سے باہر ہے کہ نصاریٰ اس بات میں کیا خوشی محسوس کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اُن کے

لئے روئے تھے۔ مجھ ناچیز کی سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ کسی پیغمبر کو رنجیدہ کرنا کوئی خوشی کی

بات نہیں ہے۔ سب مجھے کہتے ہیں کہ نبیؐ نے تیرے لئے آنسو بہائے۔ تجھے بہت بڑا مرتبہ

حاصل ہوا۔ تو نے بڑی منزلت پائی لیکن مجھے اُن سے اختلاف ہے۔

محمدؐ نے میرا بازو پکڑا اور مجھے اپنے ساتھ چٹائی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس بات پر میں

چوٹک گیا۔ کہاں میں کہاں وہ عالی نسب! میں آج تک قریش کے کسی فرد کے سامنے نہیں بیٹھا

تھا۔ میرا منصب یہ تھا کہ میں اُن کے رومد و جاؤں تو ایستادہ رہوں۔ ایک ہی چٹائی پر اُن کے

ساتھ بیٹھنے کا تو میں تھوڑا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں انتہائی تذبذب کے عالم میں تھا کہ محمدؐ نے

اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں میری مدد فرمائی۔

”دیکھو بلال! اگر تم بیٹھو گے نہیں تو علیؑ ہم کو اپنے کھیل نہیں دکھائے گا۔“

میں بیٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اہل منصب کے پہلو میں، ایک ہی چٹائی پر اور

بیس سے میری بائیس سالہ رفاقت کا آغاز ہوا جس کی بنا پر مجھے صحابی رسولؐ کہلانے کا شرف

حاصل ہوا۔ بائیس سال پر محیط شب و روز کا یہ ساتھ حضورؐ کی زندگی کے آخری لمحے تک رہا۔

اس تمام عرصے میں، میں اُن کے ساتھ بیٹھا، اُن کے ساتھ چلا، اُن کے ساتھ سفر کئے۔

مدینہ منورہ میں انہیں صبح نماز کے لئے بیدار کرنے کی سعادت بھی میرے مقدر

میں آئی۔ صبح جب میں اذان کے لئے جاتا تو پہلے اُن کو بیدار کرتا۔ اُن کے حجرے کے دروازے

پر ہلکے سے دستک دیتا اور کہتا رسول اللہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ ہاں میں صحابی رسولؐ تھا اور یہ

وہ مرتبہ ہے جس پر شاہان عالم رشک کرتے ہیں۔ اُس دن جب میں اُن کے ساتھ چٹائی پر بیٹھا

تو بیٹھا کیا، عرش کی بلندیوں تک اُٹھ گیا۔ جب علیؑ اپنے کھیل دکھا رہے تھے تو سارا گھر

خوشیوں سے معمور ہو گیا تھا۔ وہ پھلانگتے تھے، کودتے تھے، قلابازیاں لگاتے تھے، الٹی

سیدھی، اور پھر ہوا میں اچھلتے تو حضورؐ اُن کو ہوا ہی میں پکڑ کر، اپنے بازوؤں میں لے لیتے۔

بچوں کو اُن سے بڑا پیار تھا۔ وہ اُن کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اُن کے اندر کوئی

موسیقی ہے جسے صرف بچے ہی سن سکتے تھے۔ وہ لوگوں سے اُن کی عمر اور مزاج کی مناسبت سے

گفتگو کرتے تھے۔ بچوں سے بچوں کی باتیں، بچوں کے لطیفے، بچوں کے مذاق اور بڑوں سے بڑوں

کی دلچسپی کی باتیں۔

ایک دن مدینے میں نماز پڑھنے تشریف لائے تو شانوں پر ایک چھوٹی سی مٹی کو سوار

کر لیا ہوا تھا۔ یہ مٹی ایک ننھے فرشتے کی طرح مسجد میں سب سے اونچی نظر آرہی تھی اور اپنی

معصومیت میں حضورؐ کے بال کھینچنے کی گستاخی بھی کر رہی تھی۔ اُسے بہت دیر تک شانوں پر

فرمایا، حضورؐ نے دوسرا نکاح نہیں کیا اور نہ کبھی اس خواہش کا اظہار فرمایا۔ خدیجہؓ کے انتقال کے وقت رسالتِ نبویؐ کی عمر پچاس سال تھی۔ دونوں کا آپس میں بے حد پیار تھا۔ زندگی بڑی خوشیوں میں بسر ہو رہی تھی لیکن مکمل خوشی تو شاید انسان کے مقدر ہی میں نہیں ہوتی۔ ان دونوں کو بھی ایک غم تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ دو بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ قاسم اور عبد اللہ، لیکن ان کا صغر سنی ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ قاسم حضورؐ کی سب سے پہلی اولاد تھے۔ زینب سے بھی پہلے۔ انہیں کے نام پر آپ کی کنیت ابو القاسم پڑی۔ عبد اللہ سب سے چھوٹے تھے، فاطمہ سے بھی۔

اب دن ڈھلنے لگا تھا، سائے دراز ہوتے جا رہے تھے۔ باہر تھوڑی سی ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی اور مکہ جو دھوپ کی حدت میں دم سادھے پڑا تھا، آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا تھا۔ مکہ ہوا کے جھونکوں سے بیدار ہوتا ہے۔ گرمی میں اتنی گھٹن ہوتی ہے کہ سانس لینا بھی دو بھر ہو جاتا ہے۔ ہوا چلی تو سب نے گہرے گہرے سانس لے کر اس کا خیر مقدم کیا۔ رسول کریمؐ نے فرمایا:

”چلو باہر بیٹھتے ہیں۔ صحن میں موسم بہتر ہو گا۔“

میں اٹھنے کو تو اٹھ گیا لیکن اٹھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں تو تقریباً پانچ ہوں۔ میں اپنا بوجھ نہیں سنبھال پارہا تھا۔ لڑکھڑا کر گرنے ہی والا تھا کہ ابو بکرؓ نے لپک کر مجھے سہارا دیا اور اپنے بازوؤں میں سنبھال کر مجھے دوبارہ بٹھا دیا۔ خدیجہؓ نے یہ صورت حال دیکھی تو بیٹیوں کو آواز دے کر کہا کہ کھل اور گرم تیل لے آئیں۔ لیکن محمدؐ کے پاس ایک اور علاج تھا۔ انہوں نے فرمایا۔

”اٹھنے کی کوشش کرو بلال! خون کو گردش میں آنے دو۔“

یہ کہہ کر انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا۔ میں اپنی ٹانگیں سیدھی نہیں کرپا

بٹھائے رکھا۔ اتار اُس وقت جب نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ اور نماز ختم کرتے ہی پھر اُسے اٹھالیا۔ اُس جی کا نام امامہ تھا۔ یہ حضورؐ کی نواسی اور خدیجہؓ کی ہمشیرہ ہالہ کی پوتی تھیں، ابو العاصؓ اور زینبؓ کی دختر۔

جبی کریمؐ کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بات کہیں سے کہیں جا نکلتی ہے۔ بے شمار واقعات ذہن میں ابھر نے لگتے ہیں۔ کس کو چھوڑوں، کس کو بیان کروں، کہاں سے ابتدا کروں، کہاں انتہا۔ اُن کی یادوں، اُن کی باتوں نے میری زندگی کے آخری دنوں کے ایک ایک لمحے کو حُسن سے بھر رکھا ہے۔ چاروں طرف نور ہی نور پھیلا محسوس ہوتا ہے اور نور کے اس دائرے میں، میں ایک سیاہ نکتہ۔ کتنی رحمت ہے مجھ پر اللہ تعالیٰ کی!

علیؑ کے کھیل ابھی جاری تھے کہ باقی افرادِ خاندان بھی وہاں آگئے۔ خدیجہؓ، سرور کائناتؐ کی چاروں دختران زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، فاطمہؓ۔ یہ اپنا ایک الگ حلقہ بنا کر بیٹھ گئیں۔ سب نے مجھے نہایت اپنائیت کی نظر سے دیکھا۔ فاطمہؓ نے تو بیٹھتے ہی مجھ پر سوالات کی بو جھاڑ کر دی۔ جسٹہ کہاں ہے، کیسا ہے، وہاں کے درخت کیسے ہوتے ہیں، پہاڑ کیسے ہوتے ہیں، پھول کیسے ہوتے ہیں، چڑیاں کیسی ہوتی ہیں۔ میں بے چارہ کیا جواب دیتا۔ میں نے تو حبشہ کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ ادھر ادھر کے جواب دیتا رہا۔

اتنے میں ام کلثومؓ نے کھجوروں کی ایک ٹوکری لا کر رسول اکرمؐ کے سامنے رکھ دی۔ حضورؐ نرم نرم، پکی پکی کھجوریں انگلیوں سے دبا دبا کر دیکھتے اور مجھے دیتے جاتے تھے۔ خود کھانے کے لئے جو کھجور بھی ہاتھ میں آئی کھا لیتے تھے۔

پھر خدیجہؓ نے ہمارے لئے بچریوں کا تازہ دودھ منگوا لیا۔ خدیجہؓ اپنے شوہر سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ دراز قد، خوش خرام، خوش مزاج، پُر وقار۔ اس عمر میں بھی وہ ایک خوبصورت خاتون تھیں۔ وہ پچیس سال تک حضورؐ کے عقد میں رہیں اور جب تک انتقال نہیں

وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ چند قدم اور چلے تو میں نے مزید کہا:  
”میں اللہ کو جانتا ہوں، لیکن پھر بھی نہیں جانتا، کیا اللہ تلاش سے مل سکتا ہے؟“

وہ خاموش قدم بڑھاتے رہے۔ میں اُن سے ذرا پیچھے تھا۔ شاید انہوں نے میرا سوال نہیں سنا تھا۔ پھر وہ رے کے اور اپنے سارے جسم کے ساتھ نہایت دلکش انداز میں مڑتے ہوئے، بہت اپنائیت اور تعلق کے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے:

”ہاں بلال۔ تلاش سے۔ اُس کی عبادت کرنے سے۔ اس کی حمد و توصیف کرنے سے اور اس کے بندوں کے ساتھ ہمدردی کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے قریب ہو جاتا ہے لیکن ہمیشہ یاد رکھنا! بندہ اللہ کو نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ خود بندے کو تلاش کرتا ہے۔ ایمان بندے کی اپنی صفت نہیں، اللہ کا عطیہ ہے۔“

اُن کے چہرے پر عجیب استقامت اور طہانیت تھی۔ لہجے میں یقین کی قوت جھلکتی تھی:

”میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور مجھے علم ہے کہ اللہ تک رسائی کا راستہ اسلام ہے۔“

اُس یادگار دن میں ’اسلام‘ کا لفظ میں نے دوسری مرتبہ سنا تھا مگر ابھی تک اس لفظ کا اصل مفہوم مجھ پر واضح نہیں تھا۔ ویسے ہر بار سننے کے بعد اس لفظ کے معنی میں وسعت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ انہوں نے میری بے علمی اور کم مائیگی کو محسوس کیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے:

”اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو اللہ لاشریک کی مرضی کے تابع کر لینا۔ اسلام کا مطلب ہے سب انسانوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا خواہ وہ کسی رنگ، کسی نسل، کسی منصب کے ہوں۔ اسلام نوع انسان کی مساوات کا پیغام ہے۔ اسلام انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کا منتخب کیا ہوا دین ہے۔“

رہا تھا، اُن پر وزن ڈالنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ مجھے کھینچ کر اٹھانے کی کوشش کی اور میں اُن کا ہاتھ تھامے لو پر اٹھتا چلا گیا۔ اس بار جب میں کھڑا ہوا تو اپنا سارا درد وہیں چٹائی پر ہی چھوڑ آیا۔

محمدؐ کبھی معجزے نہیں دکھاتے تھے۔ انہیں بیماروں کو شفا یاب کرنے کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ وہ مردوں کو زندہ نہیں کرتے تھے۔ پانی پر چل کر نہیں دکھاتے تھے۔ لوہے کو پانی پر تیرا کر لوگوں کو حیرت میں مبتلا نہیں کرتے تھے اور نہ زخموں سے نڈھال غلاموں کا درد رفع کرنے کے لئے کوئی اعجاز دکھاتے تھے۔ اُس شام بھی جب انہوں نے مجھے اٹھایا اور اُن کے ہاتھ کے لمس سے میرا سارا درد دور ہو گیا تو انہوں نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا تھا۔ وہ ان باتوں سے بہت بلند تھے۔ انہوں نے صرف اتنا کیا کہ مجھے اپنی تکلیف کو برداشت کرنے کی طاقت عطا کی۔ یہ اُن کا وصف تھا کہ وہ ہر شخص کے اندر چھپی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو دیکھ لیتے تھے اور اُسے اُن کا شعور دے دیتے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے محسوس کیا کہ ہر شخص کے اندر فطری طور پر رحم کا جذبہ موجود ہے تو انہوں نے سب کو اس کا ادراک کرا دیا اور اس طرح انسان کی یہ فطری خوبی ابھر کر سامنے آگئی اور زندگی کا روزمرہ بن گئی۔

محمدؐ کا مہلا بشریت کے دائرے میں زندگی گزارتے تھے۔ اُن کی ولادت بھی دائرہ بشریت میں ہوئی، اُن کی وفات بھی۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اللہ نے اُن کو وہ کچھ مرحمت کیا جو پہلے کسی نبی کے حصے میں نہیں آیا۔ اللہ نے انہیں قرآن حکیم عطا کیا اور یہی کلام الہی جو ہمیں اُن کی وساطت سے ملا، سب سے بڑا معجزہ ہے۔

چلتے چلتے انہوں نے دھیمی آواز میں کہا:

”بلال! تم اللہ کو کس کس طرح جانتے ہو؟“

”میرا دل اللہ کی شہادت دیتا ہے۔“

انہوں نے میرے کندھے سے ہاتھ اٹھالیا اور شرمیلے سے انداز سے منہ پھیر لیا۔  
شاید انہیں خیال آیا ہو کہ انہوں نے ایک کندہ نائراش سے بہت کچھ، بہت جلدی کہہ دیا۔

”سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔“

انہوں نے دینی زبان میں کہا، جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔  
یہ تھی اللہ کے رسول صل اللہ علیہ وسلم سے میری پہلی ملاقات اور اس طرح  
میرے اسلام کی ابتدا ہوئی۔

## آزادی کی تعلیم

میرے حالات واقعی بدل گئے تھے۔ اب میں ایسے گھر میں رہتا تھا جہاں غلام خانے  
نہیں تھے اور نہ ڈرے سسے چرے دیکھنے میں آتے تھے۔ یہ ابو بکرؓ کا گھر تھا لیکن ابو بکرؓ اپنے مہمانوں  
کے لئے میزبان کم اور خادم زیادہ تھے۔ صبح سویرے اُن کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی تین بیویوں کا  
دودھ دو ہیں۔ نہیں، بلکہ اس سے بھی پہلے وہ نماز پڑھتے تھے۔ رسول پاکؐ کے تمام اصحاب کو  
محبت اور شفقت کی خاص تعلیم تھی مگر ان سب میں ابو بکرؓ سب سے زیادہ شفیق و خلیق تھے۔ اُن  
کے مزاج میں بے حد دھیماپن تھا۔ بہت حلیم الطبع، نہایت بھلا مانس انسان تھے، یہی نہیں وہ  
بہادری اور شجاعت کے ہر امتحان میں بھی پورے اترے۔

گھر کا ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ تاریخ بھی اُن کا مزاج نہ بدل  
سکی رسول پاکؐ کی وفات کے وصال کے بعد جب وہ اُن کے خلیفہ ہوئے تو اس وقت تقریباً  
نصف دنیا اُن کے زیر نگیں تھی اور اُن کی فوجوں کی ہیبت سے دنیا کی عظیم سلطنتوں کے ایوانوں

الفاظ کہہ کر میں دوبارہ اپنے ماضی کی ظلمت میں داخل ہو گیا اور اب اتنی تاریکی میں ہوں کہ پتہ نہیں انہیں نظر بھی آرہا ہوں یا نہیں۔ میں نے یہ تین نامناسب الفاظ ہی نہیں کہے تھے بلکہ انہیں کہتے ہوئے میں نے غلاموں کے مخصوص انداز میں اپنا سر بھی بہوڑا لیا تھا۔

ابو بکرؓ نے دودھ کا برتن زمین پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے میرے دونوں کان پکڑ لئے، اور میری پیشانی سے اپنی پیشانی برابر ٹکراتے ہوئے کہا:

”بلال! سنو، غور سے سنو۔ تم ایک آزاد انسان ہو۔ تمہارا کوئی آقا نہیں ہے لیکن آزاد رہا کیسے جاتا ہے، یہ تمہیں سیکھنا ہوگا۔“

یہ کہتے جا رہے تھے اور پیشانی سے ٹکریں مارتے جاتے تھے۔ میں ہر ٹکر پر ہاں، ہاں، ہاں کہتا جاتا تھا۔ پھر وہ یکا یک ہنس پڑے اور انہوں نے میرے کان چھوڑ دئے۔

”دیکھو بلال! میں تمہیں یہی سکھا سکتا ہوں کہ جب کوئی تم سے مخاطب ہو تو چونک نہ پڑا کرو۔ بات کرتے وقت لوگوں کے چہروں پر نظریں رکھو اور اپنے سائے کو اپنا ہی سائیہ سمجھو۔ یہ سب ضروری باتیں ہیں.....“

وہ کہتے کہتے رک گئے۔ ایک بیٹی جس کے پیٹ میں بچے تھے، زمین پر رکھے ہوئے دودھ کے برتن کے گرد منڈلانے لگی۔ ابو بکرؓ کی ساری توجہ اُدھر ہو گئی۔ انہوں نے ایک پیالے میں دودھ نکالا اور بیٹی کے آگے رکھ دیا، یعنی مجھ سے پہلے اُس نئے مہمان کی تواضع ہوئی۔

یہ بات مجھے عجیب سی لگی۔ میں ہوتا تو شاید ایک ٹھوکر مار کر بیٹی کو بھگادیتا لیکن نہیں، ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ مجھے یاد ہے جب ہم مکے کی طرف دس ہزار کی فوج کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے تو ایک جگہ ہمارے راستے میں ایک کتیانے بچے دے رکھے تھے۔ حضور اکرمؐ نے جب یہ دیکھا تو فوج کو راستہ بدلنے کا حکم دے دیا اور ہم اُس بچوں والی کتیانے سے سو گز دور نیا

میں لرزہ تھا۔ اُن دنوں میں بھی وہ اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھے اپنے ہاتھوں سے اپنے جوتے مرمت کرتے دیکھے گئے۔

جب میں انہیں معرکہ عراق میں مسلمانوں کی عظیم الشان فتح کی خوش خبری سنانے گیا تو میں نے اُن کو اسی حالت میں اپنی دہلیز پر بیٹھے ہوئے پایا۔ لیکن اس وقت میں جس دن کا ذکر کر رہا ہوں، اُس دن تک تو بیس برس بھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور فارس کی طوکیت ابھی تک اپنے ہزار سالہ قدیم تخت پر قائم تھی۔

میں نے ابو بکرؓ کو آتے دیکھا تو ایک مرتبہ پھر اُن کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے مجھے خرید کر آزاد کیا۔ میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ الٹا انہوں نے میرا شکریہ ادا کرنا شروع کر دیا، گویا میرا ہی اُن پر احسان تھا اور گویا وہ رقم بھی میں نے ہی دی تھی جس سے مجھے خرید گیا تھا۔ ابو بکرؓ کہنے لگے:

”رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ غلاموں کو آزاد کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔“  
یہ بات انہوں نے شرماتے شرماتے کہی بلکہ یہ کہتے ہوئے ان کی زبان ایک آدھ بار لڑکھرائی بھی۔ شاید اس لئے کہ اپنی ایمان داری سے مجبور ہو کر وہ میرے ہی سامنے اعتراف کر رہے تھے کہ انہوں نے مجھے اپنے ثواب کی غرض سے آزاد کرایا ہے لیکن نیک کاموں کے پس منظر میں اس قسم کی روحانی خود غرضی تو ہر دین کا حصہ ہے۔ وہ کہنے لگے:

”بلال اب تمہیں نئے کام کرنے ہوں گے اور شاید اتنے سخت کہ اب سے پہلے کبھی نہ کئے ہوں۔“

میرے منہ سے معاذ نکلا:

”جو حکم آقا!“

- میرے جواب سے انہیں بہت دکھ پہنچا۔ مجھے بھی فوری طور پر احساس ہوا کہ یہ

نے میرے لئے دیا۔

ابو بجرؓ کی رہبری اور نگرانی میں، میں لکھنا سیکھ گیا۔ میں سیاہی بنانے کے لئے نیل کے پتے لاتا تھا۔ مغرب سے فجر تک انہیں پانی میں بھگوئے رکھتا۔ پھر صبح انہیں کونٹا اور کوٹ کر سیاہی بنا لیتا۔ میں کھال پر لکھتا تھا۔ درختوں کی چھال پر لکھتا تھا۔ بھید کے کندھے کی سوکھی ہڈی پر، گیلی زمین پر، راکھ پر، پتھروں پر، غرض ہر اُس چیز پر جس پر لکھا جاسکتا تھا۔ چلتے پھرتے میں ہوا میں بھی انگلیوں سے کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔

ہر روز ابو بجرؓ مجھے تھوہر کا ایک نیا قلم تراش کر کے دیتے تھے۔ اب اُن کی صبح کا معمول یوں ہو گیا تھا۔ پہلے نماز، پھر قلم، پھر بجزیوں کا دودھ۔

میں لکھنے بیٹھتا تو اکثر وہ میرے پیچھے آکھڑے ہوتے۔ مجھے لکھتے دیکھتے رہتے اور میری اصلاح کرتے۔ ایک دن انہوں نے مجھے عسترہ کی نظمیں لا کر دیں جنہیں میں نے پہلے ایک ایک لفظ اور پھر ایک ایک مصرع کر کے زور زور سے پڑھنا سیکھا۔ عسترہ صحراؤں کا شہزادہ تھا۔ اس کے عظیم کارنامے، یکہ و تہا کئی کئی سے لڑکر داؤدِ شجاعت و وصول کرنے کی داستانیں، اُس کی نیکیوں کے قصے، مہمان نوازیوں کی کہانیاں، عبلہ سے محبت کے افسانے اور عبلہ کے عشق میں ڈھلے ہوئے اس کے رومانی اشعار زبانِ زدِ خلائق تھے۔ عسترہ اپنے عمد کا ہیر و تھا۔ اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا، نہ شمشیر زنی میں نہ شاعری میں۔ مجھے اُس کا ہر مصرع مہسوت کر دیتا تھا۔ یہ اُس کی نظم کی عظمت کا تقاضا تھا مگر میرا اُن سے ایک تعلق یہ بھی تھا کہ عسترہ بھی میری طرح حبشہ کی ایک غلام خاتون کا بیٹا تھا۔

ایک دن ابو بجرؓ باہر سے آئے تو بہت خوش تھے۔ میں اپنے لئے سیاہی بنا رہا تھا۔ مجھے سیاہی بناتے دیکھ کر لور بھی خوش ہوئے۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے سیاہی سے داندار ہاتھ پکڑ کر چوم لئے۔

راستہ بنا کر گزرے۔ سارے کے سارے دس ہزار۔ محض اس لئے کہ بچوں والی کتیا پریشان نہ ہو۔ محمد نبیوں میں پہلے نبی تھے جنہوں نے جانوروں پر رحم کرنے کی تاکید کی۔ ایک بار انہوں نے فرمایا تھا کہ بندہ ایک بلی پر ظلم کر کے جہنم میں جاسکتا ہے اور ایک بے زبان کو پانی پلا کر انعام پاسکتا ہے۔

لیکن اُس وقت یہ ساری باتیں میرے لئے نئی تھیں۔ میں سوچتا تھا بلی کو دودھ دینا جا رہا ہے اور مجھے نہیں۔ مجھے اُس کی شکم سیری کا انتظار کرنا ہے۔ میں انہی خیالات میں گم تھا کہ بلی کے پاس زمین پر بیٹھے ہوئے اُس عظیم اور حلیم النفس انسان نے اپنا سلسلہء کلام دوبارہ شروع کیا، وہیں سے جہاں سے ٹوٹا تھا:

”زیادہ ضروری نکتہ یہ ہے بلال کہ غلام کا کوئی مستقبل نہیں ہو تا اور مستقبل کا ہونا بہت اہم ہے۔“

یہ کہہ کر وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے تاکہ ذرا فاصلے سے بلی کو دودھ پیتے دیکھیں۔ مجھے ابھی یہ سیکھنا تھا کہ جنہیں اللہ سے پیار ہوتا ہے اُن کے لئے ہر جاندار چیز میں مدرسہ کھلے ہوتے ہیں، جانوروں میں، پھولوں میں، پھلوں میں۔ ابو بجرؓ کے لئے رودبارِ حیات کی ہر لہر، گلشنِ زندگی کی ہر لرزش، فرش و عرش کے درمیان تخلیقِ ایزدی کا ادنیٰ سے ادنیٰ مظہر ایک درس تھا۔

”بلال! اگر میں تمہیں ایک قلم بنا دوں تو تم لکھنا سیکھنے کی کوشش کرو گے؟“

یہ سوال ایسے پوچھا گیا جیسے بے ارادہ ہو۔ جیسے میرے لئے اس کا سننا بھی ضروری نہیں تھا، حالانکہ یہی نادانستہ سوال میرے لئے غلامی سے قطعی نجات کا پیش خیمہ بنا۔ غلامی سے اصل رہائی میں نے ابو بجرؓ کی تربیت سے پائی۔ اُن کی اُس رقم سے نہیں جس سے اُن نے مجھے خرید کر آزاد کیا تھا، گویا ابو بجرؓ کا حقیقی احسان وہ تھا جو انہوں نے مجھے دیا، وہ نہیں جو انہوں نے

”تمہیں پتہ ہے آج رسول اللہ نے کیا فرمایا؟“

ابو بکر میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مجھے ایک گدے کے پاس لے گئے۔ بیٹھنے کو کہا اور ساتھ ہی خود بھی بیٹھ گئے۔ جو خبر وہ لے کر آئے تھے اُس کے لئے اتنا اہتمام ضروری تھا۔ جب ہم بیٹھ گئے تو انہوں نے کہا:

”طالب علم کی سیاہی، شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ رسول کریم کے الفاظ

ہیں۔“

میں اٹھا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ سیاہی کے برتن میں ڈبو دیئے، پھر ہاتھ باہر

نکالے اور بہت دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ سیاہی پر سیاہی!

## اُن کی باتیں

اب میں آپ کو محمد کی ابتدائی زندگی کے بارے میں چند باتیں بتاتا ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا سنا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر کو غریب اور یتیم پیدا کیا۔ اُنکے والد عبد اللہ نے کبھی اپنے فرزند جلیل کو گود میں نہیں اٹھایا۔ محمدؐ ابھی شکم مادر ہی میں تھے کہ عبد اللہ کا انتقال ہو گیا۔ اپنے بیٹے کے لئے انہوں نے جو ترکہ چھوڑا وہ بھی کیا تھا۔ پانچ نحیف و نزار اونٹ اور چند بھیڑیں!

محمدؐ عام الفیل میں واقعہ فیل سے پچاس یا پچپن دن بعد مکے میں پیدا ہوئے تھے۔ مجھ غلام کی پیدائش سے بارہ سال پہلے۔ صبح کا وقت تھا اور بہار کا موسم۔ ربیع الاول کی نویبارہ تاریخ تھی۔ پیدائش کے دن کے متعلق انہوں نے میرے سامنے ایک اعرابی کو بتایا تھا کہ ان کی ولادت پیر کے دن ہوئی تھی۔ عیسوی تاریخ کے مطابق سن ۵۷۰ء تھا یا ۵۷۱ء عیسوی مہینے پر بھی اختلاف ہے۔ زیادہ لوگوں کا خیال ہے کہ اپریل کی آخری تاریخیں تھیں۔

کہتے ہیں میلادِ محمدؐ کی رات عرشِ الہی پر ایک جشن ہوا تھا۔ کچھ لوگوں سے میں نے سنا کہ اُس رات انہوں نے آسمان پر قدیلیں روشن دیکھی تھیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ اُس رات فرشتے نظر آئے تھے جو آسمان پر شادمانی کے گیت گارہے تھے۔ سنا ہے لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ولادتِ محمدؐ کے ساتھ فارس کے ہزار سالہ قدیم آتش کدے کا دائمی شعلہ بجھ گیا۔ لوگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ اُس رات فردوسِ بریں سے ایک کبوتر نیچے اترتا تھا جس کی منقار جو اہرات سے مزین تھی۔ اُس نے حضرت آمنہ کے شکم مبارک پر اپنے پر رگڑے اور وہ زچگی کی تکلیف سے مامون ہو گئیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے موقع کی بھی ایسی بہت سی باتیں سنی ہیں۔ کہتے ہیں اُس رات آسمان پر ایک نیا ستارہ نمودار ہوا تھا جس نے تین بادشاہوں کو یروشلیم کی راہ دکھائی تھی اور اس طرح وہ تینوں اُس کی رہبری میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پالنے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ بھی سنا ہے کہ اُن تین کے علاوہ ایک ملکہ بھی تھی جو دیر سے یروشلیم پہنچی تھی کیونکہ راستے میں اُس راہبر ستارے پر بادل کا ایک ٹکڑا آگیا تھا جس کی وجہ سے وہ دیر تک نظروں سے اوجھل رہا لیکن اللہ کی اللہ ہی جانے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب محمدؐ کی عمر چار سال کی تھی تو دو فرشتوں نے اُن کا سینہ چاک کر کے اُن کا دل باہر نکالا اور اُسے گناہِ آدم سے پاک کر کے دوبارہ اُس کے مقام پر رکھ دیا۔ نہ انہیں کوئی تکلیف محسوس ہوئی نہ جسم پر کوئی نشان رہا۔ اس واقعے کا راوی ایک بچہ بتایا جاتا ہے جو اُس وقت محمدؐ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ یہاں میں پھر کہوں گا کہ واللہ اعلم بالصواب اللہ کی اللہ ہی جانے۔

چھ سال کے ہوئے تو اُن کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اُن کے دادا عبدالمطلب انہیں اپنے یہاں لے آئے اور اپنے بچوں کی طرح اُن کی پرورش کرنے لگے۔ دو ہی سال بعد عبدالمطلب بھی وفات پا گئے۔ پھر اُن کے بڑے بیٹے زبیر نے ابوہاشم کے سربراہ کی حیثیت

سے قبیلے کی باگ ڈور سنبھالی۔ محمدؐ کی کفالت اور پرورش کے ذمے داری بھی سردار ابوہاشم کی حیثیت سے انہوں نے ہی قبول کی۔ جب بیس ایکس سال کے ہوئے تو زبیر کی بھی وفات ہو گئی مگر اب وہ بیس ایکس سالہ نوجوان تھے۔ زبیر کے بعد ابو طالب ابوہاشم کے سردار بن گئے اور محمدؐ اُن کے یہاں منتقل ہو گئے۔ غربت اور کثرتِ اولاد کی وجہ سے ابو طالب کے حالات باقی بھائیوں جیسے نہ تھے مگر محمدؐ کو اُن سے اور ان کی اولاد سے بہت محبت تھی۔ خود ابو طالب کو اُن سے بہت پیار تھا۔ ایک مرتبہ وہ انہیں ایک تجارتی قافلے میں اپنے ساتھ شام بھی لے گئے تھے۔ اس سفر کے بارے میں بھی کئی معجزات مشہور ہیں۔ کہتے ہیں اُن پر ایک بادل کا ٹکڑا سایہ رکے رہتا تھا۔ یہ بھی سنا ہے کہ حیرہ نامی ایک عیسائی راہب نے جب یہ دیکھا تو اُسے حیرت ہوئی۔ پھر اُس نے اُن کے شانوں کے درمیان، مہرِ نبوت دیکھی جو ایک بڑے سکے کے برابر تھی۔ یہ آنے والے پیغمبر کی نشانیاں تھیں جو حیرہ نے اپنی کتابوں میں پڑھی تھیں۔ یہ دیکھ کر اُس نے اُن کی نبوت کی پیش گوئی کر دی تھی۔

معجزات کے بارے میں، میں تو اتنا ہی کہوں گا جو قرآن میں تحریر ہے کہ وہ لوگ جو علم نہیں رکھتے، معجزوں سے اپنا بیٹ بھر لیتے ہیں۔ دراصل انسان کی ہوس کبھی کبھی اُس کی ضرورتوں سے بڑھ جاتی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی ضرورت اتنا ہی جاننے کی ہے جو ان موقعوں کے بارے میں قرآن میں آیا ہے۔ نہ کم، نہ زیادہ۔ ویسے یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک شخص کسی واقعے کو معجزہ کہتا ہے اور دوسرا اُسے محض ایک رمز یہ حکایت سمجھتا ہے، میں اکثر سوچتا ہوں کہ موسیٰ علیہ السلام کے سولہ معجزات جنہیں ہزاروں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، کائنات میں ایک فوری اور دائمی انقلاب کیوں نہ لاسکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب نازل فرمادی تو اُس نے مزید کسی معجزے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ قرآن حکیم ہی ایک مرکزی اعجاز تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اسی



ہم فطرت ہی کی درس گاہ کا انتخاب کریں گے۔ انسان کی بنائی ہوئی تمام چیزیں ختم ہو جائیں تب بھی فطرت کی تباہی کے مقابلے میں وہ ایک معمولی حادثہ ہو گا۔ صحراؤں میں گلہ بانی کرنے والے اسی مدرسہ فطرت کے طالب علم ہوتے ہیں۔

وہ جب چودہ سال کے ہوئے تو اُن سے گلہ بانی چھڑادی گئی۔ اب اُن کی عسکری تعلیم ہونا تھی۔ محمدؐ کم عمری کی وجہ سے تلوار نہیں چلا سکتے تھے، البتہ اپنے جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی طرح اُن کا رجحان تیر اندازی کی طرف تھا۔ اس عمر میں بھی انہوں نے اس فنِ حرب میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس مہارت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کی نظر غیر معمولی طور پر تیز تھی۔ کئے میں مشہور تھا کہ وہ عقدِ ثریا کے بارہ ستارے گن سکتے تھے۔ پہلی جنگ جس میں وہ شریک ہوئے حربِ الجار تھی۔ یہ خون ریز جنگ تین چار سال جاری رہی مگر لڑائی صرف پانچ دن ہوئی۔ حربِ الجار کی جس جنگ میں محمدؐ شریک ہوئے تھے ایک دن کی تھی۔ اُس میں اُن کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ دشمن کے چلے ہوئے تیروں کو میدانِ جنگ سے اٹھا اٹھا کر جمع کریں اور اپنے تایا زبیر اور ابو طالب کو لا کر دیں۔ اُن کے ترکش خالی ہونے لگیں تو وہ مزید تیر جمع کر کے لائیں۔ سارا دن وہ پیچھتے چلا تے زخمیوں، لاشوں اور کٹے ہوئے انسانی اعضاء کے درمیان، تلواروں، نیزوں اور بھالوں کی زد سے اپنے آپ کو محفوظ کرتے گھوڑوں کی ٹانگوں سے پھتے پھتے انسانی خون سے رنگے میدانِ کارزار میں دوڑ دوڑ کر تیر جمع کرتے رہے۔

اُن کو یہ دن اچھا نہیں لگا۔ وہ اسے اپنے ذہن سے محو کر دینا چاہتے تھے۔ میں نے ایک دن انہیں کہتے سنا کہ کاش وہ دن کبھی طلوع ہی نہ ہو تا! کتنا خون بہا تھا اُس جنگ میں اور بات اتنی تھی کہ کنانہ کے ایک شراہی نے ہوازن کی شاخ ہو عامر کے ایک فرد کو سوتے میں قتل کر دیا تھا۔ قریش، کنانہ کے حلیف تھے۔ اس لئے اُن کی زیادتی کے باوجود اُن کا ساتھ

طرح جیسے پہلے عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مرکزی اعجاز کی حیثیت رکھتے تھے۔

محمدؐ نے مجھے بتایا کہ عیجن میں وہ گلہ بانی کیا کرتے تھے۔ صبح بھیروں کے ریوڑ کئے کی پہاڑیوں سے پرے لے جاتے تھے اور وہاں دن بھر اُن کے چارے کے لئے خود رو، خاردار جھاڑیوں کے سیاہی مائل پھل اکٹھے کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ اپنے وقتوں میں سبھی پیغمبروں نے بھیروں چرائی ہیں۔ میرے خیال میں اس میں بھی قدرت کی مصلحت ہے۔ تنہائی انسان کو فطرت کے قریب کر دیتی ہے۔ انسان جب صحرا کی کھلی اور تازہ فضا میں تنہا اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے تو اُسے لگتا ہے جیسے وہ سب مناظر صرف اُس کے لئے تخلیق ہوئے ہیں۔ اُس کے ذہن میں انسان کی اہمیت کا احساس جاگنے لگتا ہے۔ چار سو پھیلے ہوئے فطرت کے دیکراں مناظر اُسے دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ وہ اپنی ذات اور کائنات کے تعلق پر غور کرنے لگتا ہے اور بات خالق کائنات تک جا پہنچتی ہے۔ شہر سے دُوری اس کے ذہن کو الجھنے نہیں دیتی۔ شہروں میں انسان وقت کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ماضی کی پرچھائیاں اور مستقبل کے سائے اُس کے حال پر چھائے رہتے ہیں اور وہ کسی عظیم مقصد کی جستجو کے قابل نہیں رہتا۔ شہروں کی مستقل آبادیاں، وہاں کے گلی کوچے رفتہ رفتہ انسان کی اخلاقی اور روحانی اقدار کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں اور وہ اپنے ماحول کا غلام بن کر اپنے اندر سمٹ کے رہ جاتا ہے۔ صحرا کی آزاد فضا یہ تمام بدھن توڑ دیتی ہے اور انسان کو کشادگی اور آفاقیہ کا احساس دلاتی ہے۔

فطرت اپنی تمام تر معصومیت اور پاکیزگی کے ساتھ اپنی تمام تر قوت اور ہیبت کے ساتھ ہمیشہ سے صداقتوں کی علامت رہی ہے۔ یہ ایک راہ اور ایک مسلک بھی ہے جس میں ہر دور کے انسان نے پناہ پائی ہے۔ اس کی عظمت کا اندازہ یوں لگائیے کہ اگر ہمیں انسان کے بنائے ہوئے اعلیٰ سے اعلیٰ مدرسے اور فطرت کے مدرسہ ازل کے درمیان انتخاب کرنا ہو تو

دے رہے تھے۔

دیواریں گرا دی گئیں۔ حجرِ اسود کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا گیا اور نئی دیواریں حضرت ابراہیم کی رکھی ہوئی بنیادوں سے اٹھائی گئیں۔ جب حجرِ اسود کو اُس کے مقام پر رکھنے کا وقت آیا تو ایک قضیہ کھڑا ہو گیا۔ حجرِ اسود کو نصب کرنے کی سعادت کس قبیلے کے حصے میں آئے گی۔ چار دعوے دار تھے اور ہر ایک اپنے تئیں، اپنے قبیلے کو اس اعزاز کا مستحق سمجھتا تھا۔ چار پانچ دن سے جھگڑا جاری تھا۔ سارے شہر میں یہی باتیں ہو رہی تھیں مگر مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل رہا تھا۔ کوئی مصالحت پر تیار نہیں تھا۔ ایک دن بات اتنی بڑھ گئی کہ آنکھوں میں خون اتر آئے اور چاروں قبیلوں کے نوجوان اپنے اپنے گھروں سے تلواریں لانے کے لئے دوڑ پڑے۔ حاضرین میں مخزومی خاندان کے ایک بزرگ ابو امیہ بن مغیرہ نے جو وہاں موجود لوگوں میں سب سے معزز تھے، انہیں روکا اور حرمتِ کعبہ کا واسطہ دے کر کہا:

”اے اہلِ قریش! بات کا فیصلہ نہیں ہو رہا تو کسی کو ثالث بنا لو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اب جو پہلا شخص حرم میں داخل ہو اُسے منصف بنا لیا جائے۔“

اُس بزرگ کی نہایت درد مندی سے کئی ہوئی بات سب کے دل پر اثر کر گئی اور سب نے یہ مشورہ تسلیم کر لیا۔ اب سب حرمِ کعبہ کے دروازے پر نظر میں جمائے انتظار کرنے لگے کہ اتنے میں محمد داخل ہوئے اُسی متانت کے ساتھ جو اُن کا مزاج تھی، اُسی خود اعتمادی کے ساتھ جو اُن کا خاصہ تھی، اُسی بردباری کے ساتھ جو اُن کا شیوہ تھی، اسی خندہ پیشانی کے ساتھ جو اُن کی پہچان تھی۔ حلم و رورقار کا حسین امتزاج عدل و انصاف کا نقیب الامین آپہنچا تھا۔ سب نے خوشی خوشی انہیں ثالث بنا کے معاملہ اُن کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے تنازعے کی نوعیت سنی اور ایک عبالانے کو کہل کسی نے عبا پیش کر دی تو انہوں نے اُسے فرش پر بٹھا دیا اور حجرِ اسود کو اٹھا کر اُس کے وسط میں رکھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے چاروں قبیلوں کے ایک ایک فرد کو دعوت دی کہ وہ عبا کا ایک ایک گوشہ سنبھالیں اور سب مل کر اُسے حجرِ اسود سمیت، بیک وقت اُپر اٹھائیں۔ جب حجرِ اسود مطلوبہ بلندی تک اٹھ گیا تو محمد نے اُسے اٹھا کر اُس کے مقررہ مقام پر رکھ دیا۔ جہاں وہ آج بھی نصب ہے۔

وہ اور بڑے ہوئے تو انہوں نے تجارت شروع کر دی، اپنے والد کی طرح۔ بہت چھوٹے پیمانے پر! یہ مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کس چیز کی تجارت کرتے تھے، پھلوں کی، جانوروں کی، مصالحوں کی، عطر کی یا ریشم کی۔ اس بات کا کبھی ذکر نہیں آیا۔ ان تمام معمولات کے باوجود جن میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، محمد کی اپنی ذات غیر معمولی تھی۔ وہ تمام کی انسانوں سے بہت مختلف تھے۔

مکہ تاجروں، سوداگروں اور دکان داروں کا شہر تھا اور ہر کاروبار میں چھل کپٹ کرنے والوں کی بہتات تھی۔ ان میں محمد واحد شخص تھے، جن کے بارے میں ہر زبان پر یہ تھا کہ وہ لین دین میں انتہائی ایماندار ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ کسی کو اپنے مال کے بارے میں مغالطے میں نہیں رکھا۔ جو نقص ہوا، گاہک کو پہلے بتا دیا۔ مکے کے ماحول میں اُن کی ذات ایک عجیب مثال تھی، سب سے الگ۔ اتنا اعتبار تھا اُن کا کہ شہر کے لوگ اُن کے پاس اپنی امانتیں رکھوا جاتے تھے۔ سارے مکے میں وہ الامین کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ یہ شاید اس لئے بھی کہ اُن کا اپنا نام سب کے لئے بہت غیر مانوس تھا۔ محمد سب کے لئے ایک بنیام تھا جو پہلے کسی کا نہیں رکھا گیا تھا۔

ان کی امانت اور ایمان داری کا چرچا اس قدر پھیل گیا تھا کہ اُن سے تین تین گنا عمر کے تاجر انہیں بلواتے اور انہیں ثالث تسلیم کر کے آپس کے جھگڑے چکاتے۔ اس دور میں انہوں نے اتنے بڑے بڑے فیصلے کئے کہ حضرت سلیمان بھی ہوتے تو ان پر فخر کرتے۔ وہی قصہ لے لیجئے، خانہ کعبہ میں حجرِ اسود نصب کرنے کا۔ خانہ کعبہ کی عمارت پرانی ہو گئی تھی، اس کی دیواریں بھی نیچی تھیں اور چھت بھی نہیں تھی۔ اُس میں رکھے ہوئے بت اور چڑھاوے کا سامان غیر محفوظ تھا۔ اُن دنوں جدہ میں ایک بحری جہاز خشکی پر چڑھ کر بے کار ہوا پڑا تھا۔ قریش مکہ نے وہ جہاز خرید لیا اور اس کی لکڑی سے کعبے کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا۔ پرانی

## خانہ آبادی

میں نے پہلی مرتبہ خدیجہؓ کا نام اُس وقت سنا تھا جب میری ماں نے ایک شہد لگا روٹی کا ٹکڑا میرے منہ میں ڈالا تھا۔ میں کوئی پانچ سال کا تھا۔ یہ روٹی خدیجہؓ کے گھر سے آئی تھی، اُس دن سے آج تک میرے ذہن میں خدیجہؓ کے نام کے ساتھ شہد کی حلاوت ولہبہ ہے۔ خدیجہؓ مجسم عنایت، سر تا پا شفقت تھیں۔ اُن کے گھر کے دروازے ہمیشہ حاجت مندوں کے لئے کھلے رہتے تھے۔ اُن کے یہاں ہر ضرورت مند، ہر مسکین، ہر بے کس، بے نوا کی پذیرائی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی اُن کی نوازشیں، اُن کے گھر سے بہت دُور بھی پہنچ جاتی تھیں۔ وہ خود غریبوں کے محلّوں میں اُن کا حال پوچھنے آجاتی تھیں اور اُن کی حاجت روائی کرتی تھیں۔ خدیجہؓ اپنی مثال آپ تھیں۔ ایک رئیس خاتون جن کا دل غریبوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔

اُس وقت جب رسول اللہؐ نے عورتوں کے حقوق کا اعلان نہیں فرمایا تھا، مکے میں انسان اور انسان کے درمیان تفاوت شرم ناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔ چند کھاتی پتی خواتین کا

بلائی ہیں۔ ذہن میں نئے جذبے جنم لیتے ہیں، نئی امنگیں جاگتی ہیں اور اس کے سامنے نئے افق کھلنے لگتے ہیں۔

جب یہ قافلہ دمشق پہنچا تو ساربانوں نے شہر کے روایتی شراب خانوں میں اپنی پیاس اور تھکن دور کرنے کا پروگرام بنایا۔ محمد نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور شہر کے باہر ہی اپنے اونٹوں کے ساتھ ٹھہر گئے۔ انہیں شاید علم تھا کہ ملاح سمندروں میں کم اور ساحلوں پر زیادہ ڈوبتے ہیں۔ یہ سفر انہوں نے نہایت ذمے داری کے ساتھ پورا کیا اور خدیجہؓ کو اُن کی توقع سے کہیں زیادہ منافع لاکر دیا۔ جب وہ سفر کی روداد سنا رہے تھے تو خدیجہؓ اُن کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اسی وقت اُن کی زکات نے انہیں محمدؐ کی ذات میں اپنے ہونے والے شوہر کی جھلک دکھادی۔

خدیجہؓ نے ایک رشتے کروانے والی خاتون نُسَیہ کو بلوایا اور اُسے کہا کہ ذرا اپنے طور پر محمدؐ کا عندیہ تو لو کہ شادی کے بارے میں اُن کا کیا خیال ہے۔ نُسَیہ نے بات چھیڑی تو انہوں نے کہا:

”میرے پاس ہے کیا جو میں شادی کا سوچوں۔“

”بھلا غربت بھی کوئی بہانہ ہے۔ فرض کیجئے آپ کی کسی ایسی خاتون سے شادی ہو

جائے جس کے پاس اتنا ہو جو دونوں کے لئے کافی ہو!“

پھر وہ اُن کے اور قریب آئی اور رشتے کرانے والیوں کے مخصوص رازدارانہ انداز میں کہا:

”فرض کیجئے آپ کو کسی ایسی خاتون کا رشتہ مل جائے جو حسین ہو، جس کے پاس

دولت ہو، عزت ہو، جو کسی باوقار گھر کی مالکہ ہو تو؟“

محمدؐ اب نُسَیہ کی باتوں سے بیزار ہو چلے تھے۔ انہوں نے کہا:

معززین شہر میں شمار ہوتا تھا جیسے خدیجہؓ اور ابو سفیان کی بیوی ہند، لیکن باقی غربت اور بے چارگی کی چکی میں بُری طرح پس رہی تھیں۔ وہ مردوں کی ہوس اور ظلم تلے روندی جا رہی تھیں۔ مرد نہیں اپنا مال اسباب سمجھتے تھے، مال مولیٰ کی طرح۔ عترہ جیسا شاعر بھی اب نہیں رہا تھا جو اپنے اشعار میں اُن کی حالت زار پر اشک بہایا کرتا تھا۔ مکہ اس لحاظ سے عجیب شہر تھا کہ یہاں ایک طرف تولات، منات اور عربی کی صورت میں عورتوں کی پرستش ہوتی تھی اور دوسری طرف عورتوں کو تسکین ہوس کا سامان بنا کر انہیں بیادی انسانی حقوق سے بھی محروم کیا ہوا تھا۔

یہ باتیں میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ خدیجہؓ کی صورت میں اللہ جل شانہ، نے اپنے رسولؐ کو کتنا بڑا تحفہ دیا تھا۔ ان دونوں کے مراسم کی ابتداء تو عجیب حالات میں ہوئی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ تعلق بڑھتا گیا اور خوشگوار سے خوش گوار تر ہوتا گیا۔ پہلے پہل خدیجہؓ نے محمدؐ کو اپنے تجارتی قافلے کے سالار کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا۔ اُن کا یہ قافلہ تجارت کے لئے شام آتا جا رہتا تھا۔ اُس وقت جب وہ پہلی بار خدیجہؓ کے تجارتی قافلے شمال کی طرف لے گئے، اُن کی عمر چوبیس سال تھی۔

ایک ایسے ہی قافلے کا تھوڑا کیچے۔ ریگستان کی رات میں چلتے ہوئے اونٹوں کے قدموں کی دھب دھب، کسی حدی خواں کے نغمے کی دلسوز آواز، ہر قدم پر نزدیک آتی منزل کا تھوڑا جانور اور انسان سب ایک مقصد کی خاطر سر شہو ڈائے رواں دواں، اطراف میں دور دور تک پھیلا ہوا بے نشان ریگ زار مگر اوپر آسمان پر ستاروں کی قدیلیں جو نہ صرف انہیں اُن کی منزل کا راستہ بتا رہی ہیں بلکہ کئی نئی منزلوں کی بھی نشان دہی کر رہی ہیں، اُن گنت جہانوں کی جو اُن سے پرے آباد ہیں۔ انسان اپنا سر اٹھاتا ہے اور فطرت کی بیخراں پہنائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ پہنائیاں اس کے توسن فکر کو ممیز دیتی ہیں، اُسے بلندیوں کی طرف

”یہ بھی تو دیکھنا ہو گا کہ وہ خاتون خود کیسی ہے۔“

”یقیناً۔ یقیناً“

”ایسی کون سی خاتون ہے“

”خدیجہ“

وہ یہ نام سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہنے لگے:

”یہ کیسے ہو سکتا ہے“

نفسیہ نے کہا:

”سب مجھ پر چھوڑ دیجئے“

خدیجہ اُس وقت چالیس سال کی تھیں۔ دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ محمد کی عمر پچیس

سال تھی۔ یہاں دمشق میں، میں نے چند لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس عقد میں خدیجہ کا زیادہ فائدہ ہوا لیکن وہ کم عقل کچھ نہیں جانتے۔ انہیں کیا معلوم کہ اس تعلق میں محمد نے کیا پایا۔ یہ شادی ہر لحاظ سے اتنی مکمل اور کامیاب تھی کہ لگتا تھا یہ انسان کی نہیں کسی فرشتے کی تجویز تھی۔ دراصل یہ رشتہ اُن کے مشن کی تکمیل کا پہلا مرحلہ تھا۔ خدیجہ نے انہیں غربت سے نجات دلائی۔ ہر پریشانی میں خدیجہ انہیں دلاسا دیتیں۔ ایک دفعہ میں نے رسالہ کتاب کو کہتے ہوئے سنا:

”جب سب مجھے کاذب کہتے تھے تو صرف خدیجہ مجھ پر یقین کرتی تھی۔“

خدیجہ سب سے پہلے اُن کے مشن پر ایمان لائیں، سب مردوں سب عورتوں سے پہلے، اس وقت جب خود سرور کائنات بھی پریشان تھے۔ محمد اور خدیجہ کی شادی ایک مثالی شادی تھی، اتنی خوش گوار اور کامیاب کہ اس کے ذریعے گویا اللہ نے بندوں کو ایک ثبوت فراہم کر دیا کہ مرد کی بہترین ساتھی صرف عورت ہی ہو سکتی ہے۔

ہاں

۷۷

## پہلی وحی

یہ واقعہ جو میں بیان کر رہا ہوں، مصدقہ بھی ہے اور ناقابل تردید بھی۔ مصدقہ یوں کہ اس کے راوی ہی صدیق ہیں، صدیق اکبر، ابو بکر جنہوں نے اسے زید سے سنا، زید نے علی سے علی نے خدیجہ سے اور خدیجہ نے خود اللہ کے رسول سے جن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ ناقابل تردید یوں کہ قرآن شریف میں اس کا ذکر ہے۔ اس حوالے سے یہ ہمارا جزو ایمان ہے۔ جبل النور پر غار حرا میں محمد تمنا تھے کہ جبریل علیہ السلام نے حاضری دی اور کہا:

”پڑھو“

محمد نے جواب دیا:

”میں پڑھ نہیں سکتا۔“

جبریل علیہ السلام نے زور دے کر کہا:

”اپنے رب کا نام لے کر پڑھو جس نے عالم کو پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی پھسکی سے بنایا اور جس نے انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ پہلے ناواقف تھا۔“

محمدؐ خاموش رہے تو اور زور دے کر کہا۔

”پڑھو!“

اس کے بعد بھی انہوں نے وہی کہا:

”میں پڑھنا نہیں جانتا۔“

ہر بار جب جبریلؑ انہیں کہتے کہ پڑھو اور محمدؐ اپنی مجبوری بیان کرتے کہ وہ پڑھنا نہیں جانتے تو جبریلؑ ان کے جسم کو اس زور سے بھینچتے کہ محمدؐ کو اپنی قوت برداشت جواب دیتی محسوس ہوتی۔ تیسری مرتبہ بھی جب جبریلؑ نے یہی انداز اختیار کیا تو محمدؐ سمجھے بس اب موت قریب ہے لیکن اس کے فوراً ہی بعد جبریلؑ نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور غار سے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد محمدؐ کو یوں لگا کہ کوئی تحریر یا پیغام ان کے اندر ثبت ہو گیا ہے۔ پیغام کیا تھا، اس کا انہیں ابھی علم نہیں تھا مگر وہ اس کا وزن محسوس کر رہے تھے۔

یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع اتنا عجیب و غریب اتنا چانک ہوا تھا کہ محمدؐ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کلام الہی کی جلالت و تمکنت سے وہ لرزہ بر اندام تھے اور اس واقعے کے ایک ایک پہلو پر غور کر کے اسے دائرہ فہم میں لانے کی کوشش کر رہے تھے مگر کتنی تھی کہ کسی طرح سلجھنے میں نہیں آتی تھی۔ مکے میں وہ حسن اخلاق کا اعلیٰ ترین نمونہ تسلیم کئے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے چالیس سال اس منانت، سنجیدگی اور شائستگی سے گزارے

تھے کہ کسی سے تلخ کلامی تک کی نوبت نہیں آئی تھی چہ جائیکہ کسی کا اس سختی سے انہیں بھینچنا۔ یہ تجربہ ان کے لئے قطعی ناقابلِ توجیہ تھا اور کلام الہی کی سطوتِ نزول کے تناظر میں جو خود اپنی جگہ ایک معرکہ بنا ہوا تھا یہ نامانوس سلوک انہیں ناروا معلوم ہوا۔

سوچ کی ایک لہر یہ بھی اٹھتی تھی کہ یہ عقدہ جتنا حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم تھا ہو سکتا ہے اس کا حل بھی اتنا ہی اُنہو نا اور خلافِ معمول ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں تشویش کی کوئی بات ہی نہ ہو بلکہ سب کچھ بظاہر جتنا پریشان کن اور تکلیف دہ محسوس ہو رہا ہے اتنا ہی خوش آئند اور نیک انجام ہو۔

پھر بھی اس مخیر العقل تجربے کے انجانے مضمرات سے ان کا سارا بدن لرزاں تھا۔ اسی کیفیت میں وہ لرزتے، کانپتے غارِ حرا سے باہر آئے اور حیرت کے عالم میں آہستہ آہستہ کوہِ حرا کی بلندی پر اُس سمت میں چڑھنا شروع کر دیا جہاں سے نیچے اترنے کا راستہ تھا۔ ابھی نصف راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ جبریلؑ انہیں دوبارہ نظر آئے۔ اس بار وہ انسانی شکل میں تھے اور اُفق پر کھڑے تھے۔ محمدؐ جس سمت بھی رخ کرتے، شمال، جنوب، مشرق، مغرب انہیں موجود پاتے۔ پھر ایک بار انہیں ان کی آواز سنائی دی۔

”محمدؐ! تم اللہ کے رسول ہو اور میں جبریلؑ ہوں۔“

حیرت اور پریشانی کے اسی عالم میں وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سارا بدن کانپ رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی بستر پر لیٹ گئے! در کئی کمبل اپنے اوپر اوڑھ لئے۔ سر منہ سب ڈھانپ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی موقع کی مناسبت نئے انہیں مُدّثر کہہ کر پکارا تھا۔ مُدّثر یعنی چھپنے والا، اپنے آپ کو ڈھانپنے والا۔ ربِّ ذوالجلال والا کرام کو تو علم تھا کہ

اُس نے کیا کہا ہے اور کیوں کہا ہے۔ اس کا پیغام پہنچنے پر محمدؐ کی جو حالت ہوئی تھی اور اس محیر العقول روحانی تجربے کے بعد وہ جس کیفیت سے دوچار تھے، وہ بھی اللہ جل شانہ، کے علم میں تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ایک خیر عظیم کی خاطر ہو رہا تھا اور ناگزیر تھا۔ ادھر محمدؐ کے دل کا یہ حال تھا کہ اس واقعے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد بھی وہ اپنے آپ کو کمبلوں میں سینٹے اس کے رموز و نکات، اس کی توجیہ اور توضیح میں مصروف مجسم سوال نے ہوئے تھے۔ یہ رویت واقعی منجانب اللہ تھی یا شیطان نے انہیں دھوکا دیا تھا۔ ایسا تو نہیں کہ فی الواقع کچھ بھی نہ ہو اور اُن کے ذہن نے از خود کچھ ہیولے کھڑے کر دئے ہوں۔ یہ تو وہ جانتے تھے کہ وہ محض انسان ہیں۔ بدن کی لپکی تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اُنھوں نے کچھ اور کمبل اوڑھ لئے۔ اتنے میں خدیجہؓ آگئیں۔ تو اُنھوں نے اُنھیں شروع سے آخر تک سارا واقعہ تفصیل سے سنایا۔

ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں واقعات میں رنگ آمیزی کا شوق ہوتا ہے۔ انھوں نے اس واقعے سے بھی بہت سی کمائیاں منسوب کر رکھی ہیں۔ مگر اس قسم کی خوش کن رنگ آمیزیاں خانہ بدوشوں کے الاؤ کے گرد ہی جتی ہیں، تاریخ کے اوراق کو زیب نہیں دیتیں۔ میں تو وہی کموں گا جو میں جانتا ہوں۔ رب کریم نے خدیجہؓ کو بڑی بصیرت سے نوازا تھا۔ انہوں نے اپنے خاوند کو تسلی دی، اُن کا خوف ختم کرنے کی کوشش کی، اُن کے خدشات دور کرنے کے لئے دلائل دئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے ساری صورت حال کا ادراک کر لیا اور اس وقت جب حضور اکرمؐ کو بھی یقین نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے، کچھ ہوا بھی ہے یا نہیں، وہ اس واقعے کی صحت پر ایمان لے آئیں۔

اُن کے ایمان نے رسولؐ کو حوصلہ دیا۔ خدیجہؓ نے اُن سے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ واقعی رحیم و کریم ہے اور اپنے بندوں کا خیال رکھنے والا ہے تو وہ ایک نیک اور سچے انسان کو کبھی کسی عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا۔ وہ ساری رات حضورؐ کے ساتھ جاگتی رہیں اور لمحے لمحے بعد

اُن کو جبریل امین کے الفاظ دہرا دہرا کر باور کراتی رہیں کہ محمدؐ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ اُس رات کو لیلۃ القدر کہتے ہیں، قوت و جبروت کی رات، عظمت و جلالت کی رات۔ اُس رات اللہ غفور الرحیم نے انسان کو روشنی عطا کی اور اس پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمایا۔ اس رات اُس نے جبریل کو کرہ ارض پر بھیجا، اُس رات اُس نے اپنے رسولؐ کو اپنا پہلا پیغام پہنچایا۔ وہ رات حضرت خدیجہؓ کے ایمان لانے کی رات تھی۔ اسی مناسبت سے اس عظیم و برگزیدہ خاتون کو ام المؤمنین کا لقب عطا ہوا۔ بعد میں دیگر ازواج مطہرات نے بھی یہی لقب پایا۔

کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ رات کب آتی ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ رمضان المبارک میں آتی ہے مگر کب؟ رمضان ماہ صیام ہے، نزول قرآن کا مہینہ! کشف اسرار ربانی، عرفان حقیقت اور معرفت الہی کا مہینہ ہے لیکن ایک چاند سے دوسرے چاند تک رمضان کی تیس راتوں میں سے وہ کون سی رات ہے جس کی برکات قرآن کریم کی سورہ قدر میں بیان ہوئی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں سترھویں۔ کچھ کہتے ہیں تیسویں۔ کچھ کا خیال ہے پچیسویں یا ستائیسویں۔ اس پر سب متفق ہیں کہ یہ ماہ رمضان کے آخری پندرہ روزے کی ایک طاق رات ہے۔ سورہ قدر میں اللہ تعالیٰ اس رات کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ رات ہزار مہینوں سے افضل ہے مگر صرف اللہ ہی کو علم ہے کہ یہ رات کون سی ہے۔

اس واقعے کے بعد میں کئی دفعہ جبل التور پر گیا۔ غار حرا کا مدخل اتنا نیچا ہے کہ تقریباً رکوع کی حالت میں اندر داخل ہونا پڑتا ہے۔ اندر، مدخل سے بائیں ہاتھ، چھت بھی اتنی نیچی ہے کہ جھک کر بیٹھنا پڑتا ہے مگر آرام سے نہیں کیونکہ سطح ہموار نہیں ہے۔ اسی ناہموار سطح پر بیٹھ جائیں اس طرح کہ مدخل آپ کے دائیں ہاتھ کی طرف ہو تو بائیں طرف اور سامنے غار کی چٹانوں میں چار چار چھ انگل کی درزیں ہیں، لمبائی کے رُخ پر تقریباً تین چار چار فٹ لمبی۔ ان درزوں سے ہوا بھی آتی ہے اور روشنی بھی۔ ایک خاص رُخ سے بیٹھیں تو بائیں ہاتھ کی درزوں سے خانہ کعبہ کی عمارت صاف نظر آتی ہے۔ سامنے یعنی مدخل سے

دائیں طرف پہاڑی سلسلے اور صحرا نظر آتا ہے۔ یہاں سطح زمین تقریباً ڈیڑھ فٹ نیچی ہے اور چھت بھی ذرا اونچی ہے۔ یہاں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ نیچے ریت ہے۔ اندر کا کل رقبہ اتنا ہوگا کہ دس پندرہ آدمی آجائیں۔ یہی چھوٹا سا غار، مہبط وحی ہے جہاں اللہ کا پہلا پیغام نازل ہوا۔ میں جب وہاں گیا، مجھ پر ہمیت طاری ہو گئی۔ میرے گھٹنے میرا ساتھ نہیں دے پاتے تھے اور مجھے کھڑے رہنے کے لئے کسی چٹان کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

انسان پہاڑ کی بلندی پر کھڑا ہو تو دور دور تک دیکھ سکتا ہے۔ ساری چیزیں کتنی چھوٹی چھوٹی کتنی بدل بدل سی نظر آتی ہیں۔ زاویہ نگاہ بھی چیزوں کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ چرا سے مکے کی طرف دیکھیں اور پھر مکے کی پہاڑیوں سے اُدھر حجاز کی وسعتوں پر نظر دوڑائیں جہاں قبائل آباد ہیں۔ قافلے رواں ہیں، چرواہے صدیوں سے اپنے گلوں کی نمکبانی کر رہے ہیں۔ ایک پوری دنیا بسی ہوئی ہے۔ حسن، حرکت اور جملہ لبثقا کی جیتی جاگتی دنیا۔ مگر یہاں حرا کی بلندی سے یوں لگتا ہے جیسے ساری کائنات جامد و ساکت ہے۔ نہ کوئی حرکت ہے، نہ آواز۔ بس اللہ بول رہا ہے اور ہمہ سن رہا ہے۔

## نزولِ قرآن

طلوعِ اسلام کے اوّلین شاہدوں کی حیثیت سے ہم قابلِ رشک ہیں مگر کئی لحاظ سے ہم قابلِ رحم بھی ہیں، ہم ہمہ وقت اس خوف سے لرزہ بر اندام رہتے تھے کہ ایسا نہ ہو ہمارے ذہنوں میں اس نئے علم کو سمجھنے کی گنجائش ہی نہ ہو۔ نوح علیہ السلام بھی تو اسی الہامی علم کی روشنی سے خوف زدہ ہو کر چھپ گئے تھے۔ ہم محدود صلاحیتوں کے لوگ تھے۔ ہم تو ایک جماعت ترتیب دینے کے بھی اہل نہیں تھے چہ جائیکہ ہم اُن عظیم روحانی صداقتوں کو جو ہمارے دلوں میں اتر چکی تھیں، خانوں خانوں میں رکھ کر اُن کو کوئی نام دیتے اور اُن کو نفسِ مضمون کے اعتبار سے کسی منطقی ضابطے میں لاتے۔ دل سے کسی الہامی سچائی کو محسوس کر لینا اور بات ہے اور دماغ سے اُس کی جزئیات کو سمجھنا اور اس پر عمل پیرا ہو کر اُسے جزو حیات بنا لینا دوسری بات۔ یہ رسالتِ آج کا ہی کام تھا کہ انہوں نے ایک الہامی پیغام کو ایک معاشرتی



پیغامِ الہی کے رموز جاننے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ جو میری سمجھ میں آیا وہ یہ ہے کہ انسان دنیاوی حرص و ہوس سے کنارہ کش ہو کر ذاتِ الہی سے منسلک ہو جائے۔ اگر اُسے اللہ کی ذات کا اس حد تک ادراک نہیں ہو پاتا کہ وہ اُس سے عشق کر سکے تو کم از کم اتنا ضرور ہو کہ وہ اُس کے جلال و ہیبت سے آشنا ہو جائے۔

مجھے جیسے چھوٹے چھوٹے ذہنوں کے کم مائیہ لوگ ماورائی حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے ماڈی علامتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ میں جب خود کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں کسی بلند و بالا، برف پوش پہاڑ پر تنہا، گہرے گہرے سانس لے کر برف سے دھلی صبح کی شفاف اور پاکیزہ فضا کو اپنے وجود میں جذب کر رہا ہوں۔ تازہ فضا سے میرا سینہ کشادہ ہوتا جا رہا ہے اور اس طرح شرح صدر اور کشادگی کے راستے سے اللہ تعالیٰ کا نور میرے اندر سرایت کرنا جا رہا ہے اور پھر جتنا کچھ اس مٹی کے کوزے میں سا جا جائے، اس کی کثافت جتنی لطافت سمیٹ سکے، یہی میرے نزدیک قربِ الہی ہے جس کی ترغیب اور توفیق دونوں ذاتِ الہی سے ملتی ہیں اور جو انسان کو انسانوں کی آقاویت سے نجات دلاتا ہے۔

ہندسچ ہی کہتی تھی۔ میں تو واقعی واعظ بنا جا رہا ہوں۔

میں نے بارہا رسول کو نزولِ وحی کے وقت دیکھا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے، کھڑے کھڑے، لیٹے لیٹے یا جس حال میں بھی ہوں، کانپنے لگتے تھے اور ادھر ادھر کوئی تخیلہ تلاش کرنے لگتے تھے۔ سرد ترین راتوں میں، میں نے اُن کا چہرہ پسینے سے شرابور دیکھا ہے۔ ایک بار نہیں کئی بار میں نے وہ کرب محسوس کیا ہے جس میں وہ مبتلا ہو جاتے تھے۔ سارے بدن پر لرزہ، پریشانی کے عالم میں اپنی پسیلوں کو زور زور سے بچھتے تھے۔ کبھی ایک ایک گھنٹہ خاموش لیٹے رہتے نہ خود کچھ کہتے۔ نہ ہمیں کچھ عرض کرنے کی جرات ہوتی تھی۔

حقیقت بناوید۔ آج کل کے نوجوان بڑے سیانے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں علم کے انہل لگے ہیں۔ ہمارے پاس کیا تھا۔ ہماری ذہنی تاریکیاں اور پہلی پہلی آیتوں کے چھوٹے چھوٹے چراغ

قل هو اللہ احد

اللہ الصمد

لمہ یلد ولمہ یولد

ولمہ یکن لہ کفواً احدہ

لیکن میرے خیال میں اللہ تعالیٰ کا اذلیں مقصد اپنی مخلوق کی حفاظت کرنا ہے، اُسے خارجی علوم سکھانا نہیں ہے۔ اللہ کی ذات کا واسطہ حکمت اور لہدیت سے ہے، خارجی اور ثانوی علوم سے نہیں۔ یہ علوم اللہ تبارک تعالیٰ کی ازلی حکمت کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں، اُس کا متبادل نہیں ہو سکتے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی اسی حکمت اور لہدیت کا صحیفہ ہے۔ ماڈی نفسیات سے بلند تر اور عین حقیقت۔ میرے خیال میں اس کے رموز و اسرار کا انسانی منطقی پر پورا پورا اترا لازم نہیں ہے کیونکہ یہ عین حقیقت کائنات کے دل کی دھڑکن ہے جو مرکز و محور کائنات سے اُھرتی ہے۔ قرآن کریم کا ہر لفظ ایک حوالہ ہے جس سے رشد و ہدایت کے کبھی نہ خشک ہونے والے سوتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ کائنات کی بیرونی حدود پر بسنے والے انسان اگر قرآنی الفاظ کا مکمل ادراک نہ بھی کر سکیں تب بھی یہ حقیقتِ عظمیٰ اپنی جگہ مسلم رہتی ہے۔

قرآن کریم کے ذریعے منشاءِ الہی کی فہم ہم میں سے ہر ایک کو محمدؐ کی ذات سے حاصل ہوئی۔ عائشہؓ نے ایک بار فرمایا تھا کہ وہ قرآن ناطق ہیں۔ اُن کے قول و فعل سے ہم

شخص کو نبوت سونپی جواتی تھا۔ نہ لکھ سکتا تھا، نہ پڑھ سکتا تھا۔ اللہ کا منشا شاید یہ تھا کہ اُس کی آیات کا پیغامبر الفاظ کے اُن ناقص تلازمات میں نہ الجھتا رہے جو ہمیشہ لکھے ہوئے الفاظ کے پس منظر میں سر اٹھاتے رہتے ہیں اور جن سے ہنس مضمون کبھی بگھرتا ہے، کبھی مجرد ہو جاتا ہے۔ وہ ایسا شخص نہ ہو جس نے بحر علم کے چند موتی چن رکھے ہوں جن کی چمک دمک اُس کی نگاہوں کو خیرہ کئے رکھتی ہے اور وہ اپنی نیم علمی کو اتنی اہمیت نہ دے بیٹھے کہ اصل علم کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔

دوسرے الفاظ میں رمز شاید یہ تھی کہ ایک ارفع پیغام کو نازل کرنے کے لئے جس ظرف کا انتخاب کیا جائے وہ اس سے پہلے کسی کم تر مقصد کے لئے استعمال نہ ہوا ہو۔ وہ ایک ایسا کورا کاغذ ہو جس پر اولیس تحریر الہامی قلم سے لکھی جائے تاکہ اُس کی شرح بشری تاویلات سے میرا اور عین منشاء الہی کے مطابق ہو۔

محمدؐ نبی بھی تھے اور رسول بھی۔ نبی وہ ہوتا ہے جو ایک محدود پیغام لے کر آتا ہے۔ رسول قدرت الہی کے لامحدود امکانات کے لامحدود شواہد کی مدد سے مخلوق کو خالق کی عظمت و جلالت، اس کی شوکت و جبروت اور اس کی قوت و قدرت کے ساتھ منضبط اور مرتبط کرتا ہے۔ اس حیثیت سے رسول کا دائرہ کار، قوانینِ فطرت کے علاوہ انسان کے تمام روحانی تجربات اور مادی حرکات و سکنات تک پھیلا ہوا ہے۔ انسان کو آخرت کا شعور دینا بھی رسول کا کام ہے۔ اس لئے وہ اُن سب عوامل سے بھی براہِ راست منسلک ہے جن کے ذریعے انسان یہ شعور حاصل کرتا ہے۔

نبوت کا استحکام رسالت کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ محمدؐ اپنی حیثیتِ نبوی میں اتنی تھے، اپنی حیثیتِ رسالت میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک امی کو نبی بنا کر اُسے نبوت کے ایک

نزولِ وحی اچانک ہوتا تھا۔ رسول کریمؐ کو پہلے سے کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ بھی گفتگو کے دوران میں، کبھی اپنے گھر کے اندر چلتے پھرتے، کبھی اونٹ پر بیٹھے بیٹھے۔ ایسے موقعوں پر وہ فوراً اونٹ سے اتر آتے تھے اور اپنے آپ کو اپنی عبا میں چھپا لیتے تھے۔ نزولِ وحی کے وقت کبھی انہیں گھنٹیاں سی سنائی دیتیں، کبھی پردوں کے پھڑ پھڑانے کی آواز، کبھی زنجیروں کی جھنکار۔

ایک فرشتہ اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے ہم کلام ہوتا لیکن ہم جو اُن سے صرف ایک ہاتھ کے فاصلے پر بیٹھے ہوتے تھے نہ سن سکتے تھے، نہ کچھ دیکھ سکتے تھے۔

رسول پاکؐ اس روحانی تجربے کے کرب سے باہر آنے کے بعد اُس الہام کو بیان فرماتے تھے۔ اس پیغام کا ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف، ایک ایک زیر، من و عن ارشادِ الہی کے مطابق۔ اس کے بعد یہ آیات ربانی کسی کھال پر یا چھال پر یا کسی صاف بڑی پر جو بھی اُس وقت موجود ہو لکھ کر محفوظ کر لی جاتی تھیں۔ بعینہ جیسے جبریل علیہ السلام انہیں لے کر آتے تھے۔ ایسے موقعوں پر جب میں اُن کے کرب کی کیفیت دیکھتا تو مجھ سے برداشت نہ ہوتا۔ کبھی کبھی اُن کی محبت، کلامِ الہی کی افادیت پر غالب آنے لگتی۔ میرا جی چاہتا کہ میں اُن کے پاس جاؤں اور اُن کو اس تکلیف سے نجات دلاؤں لیکن میرے پاؤں من من بھر کے ہو جاتے، ہندے کی کیا مجال کہ وہ اللہ کے کاموں میں دخل دے۔ ایک بار انہوں نے ہمیں بتایا کہ نزولِ وحی کے وقت ہر بار انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی طاقت اُن کی روح کو ان سے نوچے لئے جا رہی ہے۔

وحی کے بعد وحی نازل ہوتی رہی، یہاں تک کہ ہمارا دین مکمل ہو گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی کہ اُس نے اپنا پیغام نازل کرنے کے لئے ایک ایسے

مثالی درجے پر فائز کر دیا تاکہ رسالت کے وسیع تر مقاصد کے لئے اُس کی کامیابی کی بدرجہ اتم ضمانت مہیا ہو جائے۔

مجھے پتہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا نہیں۔ لوگوں نے کبھی کبھی انہیں زمین پر انگلی سے کچھ لکھتے تو دیکھا لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ واقعی کوئی تحریر تھی یا محض ایک غیر شعوری عمل۔ یہ تو طے ہے کہ اُن کے ہاتھ کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔

## نفرت کا سبب

یہ لوگ آخر ہم سے کیوں نفرت کرتے تھے۔ کیوں بغض لئے پھرتے تھے ہمارے خلاف! یہ بُرے لوگ نہیں تھے۔ اپنی قدیم روایات کے پاسدار، اپنی خاندانی اور قبائلی وضعدار یوں پر قائم، وعدے کے پابند، بات کے دھنی، غیرت کے پتلے، عزت کی خاطر جان پر کھیل جانے والے، جفاکش، جرأت مند، جری، مہمان نواز۔ کچھ حد تک کرخت اور اکھڑ لیکن وہ اُن کی صحرائی زندگی کی سختیوں کا تقاضا تھا۔

بات دراصل یہ تھی کہ انہیں ہم سے نہیں ہمارے تہوہر و حدانیت سے نفرت تھی۔ انہیں اپنے ان گنت خداؤں سے اتنی محبت تھی یا انہیں اُن کی اتنی ضرورت تھی کہ وحدہ لاشریک کا تصور ہی اُن کے دلوں میں نفرت کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے کافی تھا۔ بت پرستی کی تاریخ میں بتوں سے اتنا پیار کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ خداؤں کا استحصال بھی کرتے تھے، انہیں سجاتے سنوارتے بھی تھے۔ یہ لین دین کا ایک ایسا نظام تھا جس میں انسان

ایک سوداگر تھا۔

”بہل تم میرا اونٹ تلاش کر دو۔ میں تمہاری پرستش کروں گا، تمہارا احترام کروں گا، تمہارے لئے تحفے لے کر آؤں گا اور بار بار تمہارے در پر حاضری دے کر تمہیں خدائی مقام پر فائز رکھوں گا۔“

جس خدا کے ماننے والے نہیں رہتے تھے، اُسے خدائی سے خارج تصور کر کے

پھینک دیا جاتا تھا۔

لیکن میں بلال جو خود بھی کبھی ان خداؤں کو مانتا تھا، شاید پوری بات نہیں کہہ سکا۔ ان خداؤں کا معاملہ اتنا سادہ بھی نہیں تھا۔ ان کی کمزوریاں تھیں تو قوت بھی تھی۔ میں اس موضوع پر ذرا وضاحت سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

ہم لکڑی اور پتھر کے خداؤں کی بات تو کرتے ہیں لیکن جاہلیت کے دور میں بھی لوگ اس قدر احمق نہیں تھے کہ وہ پتھر کی پوجا کرتے جسے وہ ریزہ ریزہ کر سکتے تھے یا لکڑی کی پرستش کرتے جسے وہ پل بھر میں جلا کر راکھ کر سکتے تھے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ پتھر یا لکڑی کے اندر ایک روحانی جوہر بسا ہوا ہے۔ وہ اس غیر مادی جوہر کی عبادت کرتے تھے لیکن اس عقیدے کی کمزوری یہ تھی کہ یہ غیر مادی جوہر جسے خدا مانا جاتا تھا، ایک شے کے اندر موجود تھا۔ لکڑی میں یا پتھر میں، گویا یہ مادی چیزیں اس خدا کا مسکن تھیں، جیسے خانہ کعبہ اللہ کا گھر ہے مگر اپنے لکڑی یا پتھر کے مسکن سے باہر اُن کی خدائی ختم ہو جاتی تھی اور اُن کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس غیر مادی جوہر کی خدائی، اس کی معبودیت، اُس کے مادی مسکن کی حدود تک محدود تھی۔ اُن حدود سے باہر اُن کا اختیار ختم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ہر قبیلے کے، ہر شہر کے، ہر معبد کے اپنے اپنے خدا تھے جو اپنی اپنی مادی حدود کے اندر خدائی کرتے تھے۔ ایک خدا جو کئے میں دروازہ کھول سکتا تھا، وہ مدینے میں بند نہیں کر سکتا تھا۔ یہ

اس سے بھی بدتر صورت حال یہ تھی کہ خدا اپنی خدائی کے لئے بندوں کے محتاج تھے۔ اہل روم بھی اپنے بت پرستی کے دور میں جانتے تھے کہ اُن کے خداؤں کا اپنے پرستاروں پر کس حد تک انحصار ہے۔ مثال کے طور پر اگر خداؤں کا نام نہ رکھا جائے، یا اُن کے پرستش کرنے والے نہ رہیں تو وہ خدائی سے خارج ہو جاتے تھے۔ جو لیس سیزر کے اپنے خدا تھے، آگسٹس سیزر کے اپنے۔ شخصیتوں کے ساتھ خداؤں کا آنا جانا لگتا تھا۔ بدہ خداؤں کو ماننا رہے، اُن کا احترام کرتا رہے، اُن پر چڑھاوے چڑھاتا رہے، اُن کی پرستش کرتا رہے تو وہ خدا اور اگر وہ یہ سب کچھ نہ کرے اور اُن کے سامنے سے بغیر جھکے گزر جائے تو وہ کچھ بھی نہیں، گویا خداؤں کی ساری طاقت، بندوں کے ہاتھ میں تھی۔ پھر خدائی کیا رہ گئی!

یہ وہ شرک تھا جو ایک اللہ کو تسلیم کرنے کے باوجود تھا۔ میں نے سنا ہے پرانے وقتوں میں عمرو بن لُحی نام کا ایک کاہن تھا جو بت پرستی کی رسم شام سے لے کر آیا تھا۔ یہ رسم آہستہ آہستہ عرب کا مذہب بن گئی۔ پہلے شاید دو چار بت آئے پھر اُن کی تعداد بڑھتی گئی۔ ایک بت کے ماننے والوں کا آپس میں خلوص محبت کا رشتہ بڑھا اور وہ ایک گروہ بن گئے۔ بتوں میں اضافہ ہوتا گیا اور انسانیت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی گئی۔ ظاہر ہے یہ بتوارہ اللہ وحدۃ لا شریک کی شیت کے خلاف تھا کیونکہ وہ جو کل عالموں کا رب ہے ساری انسانیت کو محبت اور مودت کے رشتے میں پرونا چاہتا تھا۔

بت پرستی کی ایک وجہ میری سمجھ میں یہ بھی آتی ہے کہ مشرکین نے بتوں کو مرکز محسوس بنا کر انہیں پوجنا تو شروع کر دیا مگر بت اُن کے لئے مرکز ہدایت نہ بن سکے۔ یہ بھی گویا ایک طرح کی آسانی تھی کہ انہیں اپنی بد اعمالیوں پر بتوں کی طرف سے کسی سرزنش، عیب گیری یا تادیب کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ بت انہیں کسی بات پر نہیں ٹوک سکتے

گویا زمین لرز رہی تھی، وہ مجھے اور بھی خوفناک لگا۔ شیطان میں بھی شاید تھوڑا بہت حلم ہو مگر اس شخص میں اس کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ ابنِ خلف اور ابو لہب یہ سوچنے سے قاصر تھے کہ اُن کی دنیاوی اہمیت تو شاید آخرت میں نہ منتقل ہو لیکن اُن کے وجود کا شاید کوئی حصہ وہاں پہنچ جائے۔

میں جس جس کافر سے ملا ہوں اُس کی منطق میں، میں نے تکبر کی ایک جھلک ضرور دیکھی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کی عزت و منزلت قلتِ فکر کی مرہونِ منت ہے اور اس کی کج کلاہی محض اس کی کج فہمی پر قائم ہے وہ غیب پر یقین لانے کا تاویل نہیں ہوتا تھا مگر دلیل یہ دیتا تھا کہ زندگی صرف یہاں کی زندگی ہے اور جو مر جاتا ہے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔ مرنے کے بعد اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی آخرت زیرِ زمین، ایک قبر ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

جو لیس سیزر جیسے انسان نے بھی اپنی عظیم فتح کے دن قربان گاہ کے نزدیک کھڑے ہو کر یہی کہا تھا:

”موت ہر چیز کے خاتمے کا نام ہے!“

اس سوچ میں یہ تقاضا فرما ہے کہ انسان گویا اپنے وجود اور عدم وجود پر خود قادر ہے۔ اس میں زندگی سے ہرزاری کی کیفیت بھی ہے جو خود کشی کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی روح کو خطرے میں ڈال سکتا ہے، اسے آلودہ کر سکتا ہے، اُس کی تذلیل کر سکتا ہے، اُسے سیاہ کر سکتا ہے لیکن اُسے مار نہیں سکتا ہر شخص اپنے اندر ایک لدیت رکھتا ہے جس کو وہ جواب دہ ہے۔ یہ لدیت اُس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے کیونکہ اسے قائم رکھنے کی ضمانت اللہ جل شانہ دیتا ہے۔ ادھر ابو لہب اور اُمّی بن خلف تھے کہ وہ ایک ہڈی کو چورا کر کے مصلحتِ الہی اور تخلیقِ کائنات کے مقاصدِ جلیلہ کی نفی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تھے گویا من مائیاں کرنے کے کھلے مواقع حاصل تھے۔ کسی قبیلے کا بت سارے قبیلوں کو ایک مرکز پر نہیں لاسکتا تھا، لہذا خانہ کعبہ میں بتوں کا میلہ لگ گیا اور اس کثرت میں قریش نے اپنے لئے شہرت، عزت اور مالی منفعت کی راہیں ڈھونڈ لیں۔ غرض زندگی چین سے کٹ رہی تھی کہ محمدؐ کے کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ نے بنیادی ہلا کر رکھ دی۔

ہم سے نفرت کی خاص وجہ یہی تھی کہ وحدہ، لا شریک کا تصور اُن کی عقل میں نہیں آتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ جب رسالتِ مآبؐ جنسوں کے دوبارہ اٹھائے جانے کی بات کر رہے تھے تو یہ لوگ کیسے جڑبڑ ہو رہے تھے۔ ابو لہب بھی موجود تھا۔ وہ نہایت تضحیک آمیز لہجے میں محمدؐ کی باتوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس دن اُمّی بن خلف کہیں سے انسانی ہڈی کا ایک بوسیدہ ٹکڑا لے آیا تھا۔ اُسے اپنی انگلیوں سے چُورا چُورا کرتے ہوئے وہ سرورِ عالم سے کہنے لگا:

”تم اسے کہتے ہو کہ یہ ہڈی دوبارہ اپنی اصلی حالت میں انسان کے جسم کا حصہ بنا کر اٹھائی جائے گی؟۔ اس سے بنے گا انسان دوبارہ؟“

اور یہ کہتے ہوئے اس بد بخت نے ہڈی کے چُورے کو اپنی ہتھیلی سے پھونک مار کر رسولِ خداؐ کے چہرے پر اُڑا دیا۔ رسول کریمؐ نے نہایت تحمل سے اپنا چہرہ صاف کیا اور ابنِ خلف سے مخاطب ہوئے:

”جس نے ایک دفعہ انسان کو تخلیق کیا ہے، وہی اُسے دوبارہ بنائے گا۔“

اس کے بعد وہ سورۃ نبی اسرائیل کی پچاسویں اور اکیاونویں آیتیں پڑھتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

ابو لہب کا چہرہ غیظ و غضب سے لال بھو کا ہو رہا تھا۔ اُس کا بھاری بھر کم وجود غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں اس سے ہمیشہ جائف رہتا تھا۔ اُس دن جب اُس کے غصے سے

نام سے وہ لرزہ بر اندام رہتے تھے محمدؐ پر کوئی عذاب نازل نہیں کر پارہے تھے، جو علی الاعلان ان کے منکر تھے۔ محمدؐ کی گفتگو میں ان خداؤں کے بارے میں بہت سے تضحیک آمیز پہلو نکلتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ بے خوف و خطر اپنے مشن کی راہ پر گامزن تھے۔ وہ کبھی کبھار سوچتے کہ شاید محمدؐ ہی ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ شاید ان معبودوں کے بارے میں ان کا عقیدہ درست نہ ہو لیکن ان کے عمل میں ان کی اس سوچ کی ہمیں کوئی شہادت نہ ملتی۔

آج میں سوچتا ہوں کہ کفار مکہ کی نفرت کا ایک جواز اور بھی تھا۔ یہ انسانوں کی بد نصیبی ہے جو تقریباً ایک کلے حیثیت رکھتی ہے کہ جب ان کے سامنے صداقت سر اٹھاتی ہے تو وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اس کا سر قلم کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں، جیسے ان کے اندر کوئی عفریت داخل ہو گیا ہو۔ انسانوں کو حق کی پہلی جھلک ہمیشہ معاندانہ لگتی ہے۔ اُسے دیکھتے ہی ان کے اندر نفرت کا ایک سیلاب اُٹھ پڑتا ہے اور وہ پاگلوں کی طرح اُس کی بیخ کنی کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں۔

اس ماحول میں ہماری چھوٹی سی بے وسیلہ جماعت سب کے لئے تفریح اور استراحت کا سامان نبی ہوئی تھی۔ وہ ہمارا مذاق اڑاتے، ہم پر پھبتیاں کہتے، ہمیں طعنے دیتے، ہمیں طنز و تشبیح کا نشانہ بناتے، ہم پر نفرتوں کی بو چھاڑ کرتے، ہم پر غلاظتیں بھینکتے اور ہماری باتوں کو شراب کے پیالوں میں غرق کرتے رہتے تھے۔ غلاظتیں دھل جاتی تھیں لیکن اپنے نبی مکرمؐ کی توہین ہمیں خون کے آنسو زلاتی رہتی تھی۔ یہ ہماری برداشت سے باہر تھا کہ ایک شخص جو خالقِ ارض و سما کا محبوب ہو، فرشتے جس کا احترام کرتے ہوں، سارا مکہ جس کے حسنِ اخلاق اور انصاف پسندی کا معترف ہو، چند راہ گم کردہ بندوں کے ہاتھوں رسوا ہو۔ ہمیں لگتا تھا کہ روشنی کی راہ میں کچھ حاصل ہو گیا ہے لیکن رسول کریمؐ یہ سب کچھ نہایت صبر اور تحمل کے ساتھ سہتے رہتے تھے۔ صبر پیغمبروں کا ہتھیار بھی ہے اور ان کی ڈھال بھی۔ یہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ مجھ ناچیز کو یہ دعویٰ نہیں تھا۔ ایک دفعہ عکرمہ اور چھ اور آدمیوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ سب میرے گرد کھڑے ہو گئے، ایک دائرے کی صورت میں۔ سب خاموش کھڑے مجھے گھورتے رہے، مجھ پر انگشت نمائی کرتے رہے، کوئی لفظ نہیں، کوئی آواز نہیں۔ سب کے چہروں پر ایک شرارت آمیز طنز یہ مسکراہٹ تھی۔ میں خوف زدہ ہو گیا، پتہ نہیں ان کا کیا ارادہ ہے۔ میں دائیں طرف مڑا تو بائیں طرف سے کسی نے میری پسلیوں میں انگلیاں چنھو دیں۔ ادھر دیکھا تو دائیں طرف سے یہی حرکت ہوئی۔ چاروں طرف سے انگلیاں چنھنے لگیں تو میں ان کے درمیان لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ وہ قہقہے لگاتے رہے، میں ان کے زرخے میں بے بس ان کے اشاروں پر ادھر ادھر اچھلتا رہا۔ پھر مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر سب ہنستے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ انہیں مجھ جیسے سابق غلاموں سے نمٹنا آتا تھا۔

ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ ان کے وہ خدا جن کے

## ابتدائے انقلاب

ابوسفیان، ابولہب، امیہ، عقبہ اور تمام مشرکین مکہ کا سرغنہ ابو جہل معمولی لوگ نہیں تھے۔ یہ سب نہایت سیانے، سنجیدہ لوگ تھے۔ انہیں ابتدا ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلام کوئی عارضی، جزوقتی تحریک نہیں ہے بلکہ ایک انقلاب ہے۔ محمد صرف اللہ ہی کا ایک نیا تصور لے کر نہیں آئے ہیں بلکہ وہ انسان کا بھی ایک نیا تصور پیش کر رہے۔ اسلام اپنے نظامِ زکوٰۃ کی وجہ سے چھوٹی بڑی ہر جائیداد اور ملکیت کے لئے ان کی نظر میں خطرہ تھا۔ جو صاحبِ نصاب ہیں وہ غریبوں کو اپنی دولت میں شریک کریں۔ یہ انقلاب نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ اسلام غریبوں کی داور سی پر ہی اکتفا نہیں کرتا تھا، ان کے حقوق بھی جتا تھا۔ اسلام یہ بھی تسلیم نہیں کرتا تھا کہ حسبِ نسب کے اعتبار سے کچھ قبیلوں کو دوسرے قبیلوں پر پیدا انشی برتری حاصل ہے۔ اسلام کا مساوات کا سبق عرب کی ساری معاشرتی اقدار کے لئے چیلنج تھا۔ عرب ایسے قوانین کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

ابو جہل نے کوشش کی، ابوسفیان اور ابولہب نے بہت سہارا دیا کہ محمدؐ راہِ راست پر آجائیں۔ راہِ راست سے اُن کی مراد یہ تھی کہ وہ مشرکین کے نکتہ نظر کو تسلیم کر لیں اور اپنے دین کی اشاعت سے باز آجائیں۔ انھوں نے انہیں رشوت، منصب، اختیار، یہاں تک کہ کعبے کی آمدنی کا حصہ تک پیش کیا۔ وہ بے وقوف شاید یہ سمجھتے تھے کہ رسالتِ زمین سے نکلنے والی دھاتوں کے عوض خریدی جاسکتی ہے۔ سارے حربے بے اثر ہوئے اور ایک دن مکے کے طول و عرض میں محمدؐ کا یہ اعلان گونج اٹھا:

”اگر تم میرے دائیں ہاتھ پر سورج لا کر رکھ دو اور بائیں ہاتھ پر چاند تب بھی میں پیغامِ الہی کی تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا۔“

ہر شخص اس اعلان کی بات کر رہا تھا۔ کوئی علی الاعلان اور کوئی سرگوشیوں میں اس بیان کی قطعیت پر تبصرہ کر رہا تھا۔ مشرکین مکہ نے جب محمدؐ کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ اُن کو لگا جیسے ساری اساطیر الٰہی جا رہی ہے۔ یہ کہتے ہوئے محمدؐ کو اُن پر ترس بھی آیا کہ وہ کیوں اس سادہ سی حقیقت کو سمجھ نہیں پارے۔ چلتے چلتے انھوں نے مشرکین سے یہ بھی کہا:

”اور تم اپنی اولاد کے قتل سے باز رہو!“

اولاد کے قتل سے کیا مراد ہے، یہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ دراصل محمدؐ کی تعلیمات نے گزشتہ تیس سال میں دنیا کو اس تیز رفتاری سے آگے بڑھایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ ہم ابھی تک زمین پر کیسے موجود ہیں۔ زمانے کی برق رفتاری نے کرہٴ ارض سے ہمارے پاؤں اکھاڑ کر ہمیں کسی اور سیارے پر کیوں نہیں پھینک دیا۔ اولاد کا قتل صرف تیس سال پرانی بات ہے لیکن محسوس یہ ہوتا ہے جیسے کسی صدیوں پرانے رواج کا ذکر ہو رہا ہو۔ جب نبی کریمؐ نے یہ الفاظ کہے تھے تو اُن کا بعینہ یہی مطلب تھا۔ اسلام سے پہلے صحرائے عرب میں بچے کے

مستقبل کا فیصلہ شہمِ مادر سے باہر آتے ہی ہو جاتا تھا۔ لڑکا ہے تو اُسے زندہ رہنے دیا جائے گا۔ اُس کی ولادت پر جشن ہو گا۔ لڑکی ہے تو مستقبل تاریک۔ اُس پر سرگوشیاں ہوں گی۔ اگر خاندان میں پہلے ہی لڑکیاں کافی ہیں یا قبیلے کے خیموں میں اُن کی خاطر خواہ تعداد موجود ہے تو نوزائیدہ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی صحرا میں لے جایا جائے گا اور اُس پر ریت ڈال کر اُسے زندہ دفن کر دیا جائے گا۔

اُن کے پاس اس ہیمنانہ رسم کے باقاعدہ جواز تھے۔

”ہم زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے زندگی کو ختم کرتے ہیں۔“

”لڑکیوں کا قتل دراصل صحرائی معیثیت کا تقاضا ہے، اُن کا اپنا فیصلہ نہیں ہے۔“

”غربت میں بچی کو زندہ رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ ایک بھوکے پیٹ کا اور اضافہ ہو

گیا۔“

”لڑکی آبادی میں مزید اضافے کا باعث ہوتی ہے۔“

”ہم لڑکیوں کو قتل کر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اپنے خداؤں کے پیدا

کئے ہوئے عدم توازن کو درست کرتے ہیں کیونکہ ہمارے یہاں لڑکے کم اور لڑکیاں زیادہ

پیدا ہوتی ہیں۔“

اُن کی باتیں سن کر دکھ ہوتا تھا۔ قدرت کے عملِ تخلیق کی اُن کے ذہن میں

کوئی تقدیس نہیں تھی۔ کچھ اور برائیاں بھی تھیں اُن کے معاشرے میں مثلاً سود، جوا،

شراب خوری، عورتوں کے بارے میں اُن کا غیر منصفانہ رویہ، غلاموں کے ساتھ انتہائی

بہیمانہ سلوک، جانوروں سے بے رحمی کا برتاؤ وغیرہ۔ لیکن یہ برائیاں محض باہر سے آنے

والوں کو نظر آتی تھیں۔ اہل مکہ کے مزاج میں یہ اس قدر راسخ ہو چکی تھیں کہ انھیں ان

کے شر کا احساس تک نہیں تھا۔



گا اپنے لھر۔ کون ان کی کفالت کرے گا۔ کون ان کی دیکھ بھال کرے گا۔ صحرائی زندگی میں کثرتِ ازدواج کا رواج محض اس لئے نہیں تھا کہ مرد حریص تھے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ فیاض تھے۔ یوں بیویوں کی تعداد پر پابندی کو شروع شروع میں عورتوں کے ساتھ زیادتی بلکہ سراسر ظلم کا نام دیا گیا۔

محمدؐ نے بات یہیں ختم نہیں کی بلکہ اُسے آگے بڑھایا کہ یہ فرمانِ الہی تھا۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ عورتیں ہر چند مردوں سے ہیئت میں مختلف ہیں، پھر بھی وہ مردوں کے برابر ہیں، ان کے مساوی حقوق رکھتی ہیں۔ انہوں نے تعلیم دی کہ عورتیں مردوں کی زینت ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے محافظ اور نگہبان ہیں، دونوں کو آخرت میں اپنا اپنا حساب دینا ہے اور وہاں بھی دونوں کے ساتھ یکساں سلوک ہو گا۔

آج لوگ ان سادہ اور منصفانہ خیالات پر محمدؐ سے محبت کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں انہی باتوں پر لوگ ان سے نفرت کرتے تھے۔ ایک دور ایک بات کا مذاق اڑاتا ہے، دوسرا اُسے قابلِ ستائش سمجھتا ہے۔ شاید اس لئے کہ پھل میٹھا ہونے سے پہلا کڑوا ہوتا ہے۔

لیکن اس حمام میں کچھ اور لوگ بھی ننگے تھے۔ جب عربستان میں محمدؐ مردوں اور عورتوں کو مساوات کی تعلیم دے رہے تھے تو انہی دنوں فرانس میں عیسائی بَشپوں کی ایک کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں زیرِ بحث موضوع یہ تھا کہ عورتیں روح رکھتی ہیں یا نہیں۔ یہ پتہ نہیں کہ بلا آخر فیصلہ کیا ہوا۔ یہاں شام میں باتیں تو سب پہنچ جاتی ہیں لیکن تفصیلات نہیں ملتیں۔ پھر بھی اس ضمن میں، میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسانی مذاہب میں خواتین کے بارے میں کیسے کیسے تضادات ملتے ہیں۔ ایک طرف تو عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریمؑ کی اتنی تعظیم اور دوسری طرف حوا کی دوسری بیٹیوں کے بارے میں یہ سوچ کہ پتہ نہیں ان کی روح بھی ہے یا نہیں۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ آخر یہ نسلِ انسانی کی مائیں ہیں۔

ان کے خداؤں سے انکار پر بھی انہیں غصہ تھا۔ بچیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع کرنے پر بھی وہ معترض تھے لیکن اب تو غصے کی ایک اور وجہ پیدا ہو گئی تھی۔ محمدؐ نے بیویوں کی تعداد محدود کر دی تھی۔ اب تک رواج یہ تھا کہ لوگ اپنی خواہش اور مالی وسائل کے مطابق جتنی چاہیں شادیاں کر لیتے تھے۔ بعض کے تو دس دس بیس بیس بیویاں بھی تھیں۔ اسلام نے بیویوں کو چار تک محدود کر دیا، جس فرمان کے تحت یہ تعداد مقرر ہوئی اُس کی رُو سے آسانیاں ایک ہی بیوی کے رکھنے میں تھیں۔ حکم یہ تھا کہ سب بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا جائے اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کسی کو کسی پر فوقیت نہ دی جائے اور اگر مرد یہ نہ کر سکے تو پھر وہ ایک ہی بیوی رکھے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب عورتوں کو یہ اعزاز بخشا گیا تو وہ اس کا خیر مقدم کرتیں لیکن ہوا یہ کہ وہ بھی اللہ کے رسولؐ کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ گھر گھر بحث چھڑ گئی کہ اگر کسی کی چار سے زیادہ بیویاں ہیں تو جنہیں علیحدہ کیا جائے گا وہ کون ہوں گی۔ انہیں کون رکھے

# میری دُعا تیں

محمدؐ کے پیغام کے بارے میں کھار کو اب کوئی غلط فہمی نہیں رہی تھی۔ جو تھوڑی بہت خوش فہمیاں تھیں، وہ بھی دور ہو چکی تھیں۔ قریش کے تمام سرداروں پر اس پیغام کے مضمرات آشکار ہو چکے تھے اور اب براہ راست تصادم ناگزیر تھا۔ اسلام کا کلمہ لا الہ الا اللہ ایک انتہائی انقلابی نعرہ تھا۔ نہایت مختصر لیکن اتنا عمیق اور دور رس کہ اُس کی ضرب کاری جاہلیت کی بنیادیں ہلانے کی طاقت رکھتی تھی۔ اس کلمہ پر ایمان رکھنے والا علی الاعلان پکار رہا تھا کہ اب اللہ وحدہ لا شریک کے علاوہ کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا جائے گا۔ کوئی ایسا نظام، کوئی ایسی طرز معاشرت قبول نہیں کی جائے گی جو غیر اللہ کی ایجاد ہو۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی حاکمیت تسلیم نہیں کی جائے گی۔ تمام فوق الانسانی حقوق ختم کر دئے جائیں گے۔ نسلی، قومی اور قبائلی وحدتوں کی روایات، پجاری اور جاگیر دار طبقوں کی امتیازی مراعات اور خود ساختہ مفروضوں پر قائم تمام عظمتیں اور بالادستیاں مناکر قافلہ انسانیت کو

ایک اور چھوٹی سی دُعا جو میں ہر رات سونے سے پہلے مانگتا ہوں میرا زندگی بھر کا وظیفہ ہے:

’بیاری تعالیٰ مجھ سے میری برائیاں دُور کر دے اور مجھے بُری عادتوں سے چھٹکارا دلا دے۔‘

فجر کی اذان سے پہلے جب میں مسجدِ نبویؐ سے ملحق ایک چھت پر بیٹھا اذان کے وقت کا انتظار کیا کرتا تھا تو ہمیشہ یہ دُعا مانگا کرتا تھا:

’اے اللہ میں تیری حمد کرتا ہوں اور قریش مکہ کے بارے میں تجھ سے مدد مانگتا ہوں کہ وہ تیرے دین کو قائم کریں‘

لیکن یہ مدینے کی دُعا ہے، اُس وقت مکہ میں تو ہر وقت میری یہی دُعا تھی کہ اللہ تعالیٰ قریش کو نیکی کی ہدایت دے اور وہ اپنے ظلم سے باز رہیں۔

اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت فلاح و ارتقا کی راہ پر گامزن کیا جائے گا۔

یہ ایک نظریہ حیات تھا۔ ایک فلسفہ تھا جس کا جواب یہ ہونا چاہئے تھا کہ اس کے مقابلے پر ایک متبادل نظریہ پیش کیا جاتا اور دلائل سے اُس کی فوقیت تسلیم کرائی جاتی لیکن یہ نہ ہو اور وہ زچ ہو کر کھلم کھلا ظلم پر کمر بستہ ہو گئے۔

رسول اللہؐ نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تھا تو رخصت کے وقت انہیں سب سے بڑی نصیحت یہ کی تھی:

”معاذ! مظلوموں کی بددعا سے ڈرتے رہنا۔ یاد رکھنا کہ اُن کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔“

لیکن ظالم شاید یہ نکتہ نہیں سمجھتے۔

آج میں ضعیف اور قریب مرگ ہوں لیکن آج بھی ظلم پر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ مجھے ظلم سے بہت نفرت ہے۔ میں بلال جس نے بہتوں سے زیادہ ظلم سے ہیں، ظلم سے محفوظ رہنے کے لئے دعائیں مانگتا رہتا ہوں۔ بلال حبشیؓ کی یہ دُعا ہے:

”یا اللہ! ظالم کو مجبور کر دے کہ وہ اپنے آپ کو اُس بدن میں دیکھے جس پر وہ ظلم ڈھا رہا ہے۔“

’یا اللہ! غلط فیصلے کرنے والوں کو اپنے فیصلوں کے نتیجے خود بھگتنے پڑیں۔‘

’یا اللہ! عدل چاہنے والے مجبور کل خود کرسیِ عدل پر متمکن ہوں۔‘

’یا اللہ! کوئی منصف قانون کے معاملے میں من مانی نہ کرے کیونکہ دنیاوی قانون

بھی تیری رحمت ہی سے بنے ہیں۔‘

’یا اللہ! ہر ظالم کو اُس کے ظلم کی دہری سزا دے۔‘

’یا اللہ! ظالم کو اسی وقت سزا دے جب وہ ظلم کر رہا ہو۔‘

## پہلی ہجرت

اب تشدد کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ پہلے سے کہیں زیادہ قساوت لئے ہوئے۔ قتل تک نوبت پہنچنے لگی۔ کوئی دن نہیں گزرتا تھا کہ ہم مسلمانوں پر کوئی نہ کوئی ظلم نہ ہوتا ہو۔ ہم جب آنحضرتؐ کی طرف دیکھتے تو ہمیں لگتا تھا کہ چشم فلک ان کی آنکھوں میں گر رہا ہے لیکن وہ جس راہ پر گامزن تھے اُسے چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ رضائے الہی یہی ہے کہ اُس کے پیغمبر سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر راستہ بنائیں اور ان کی پیروی کرنے والے خون پسینے سے بنے ہوئے اس جادۂ پیمبری کو فلاح اور بہتری کا ایک آسان راستہ سمجھتے ہوئے، اُن کے نقش قدم پر چلتے جائیں۔ دنیا میں ایسے بہت سے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے بدی سے نفرت کی لیکن وہ بدی کا مقابلہ کرنے پر تیار نہ ہو سکے اور جان کی سلامتی کے لئے دنیا ہی تاج پہنٹھے۔ غاروں اور گھاؤں میں جا بسے، جوگی اور راہب بن کر زندگی گزار دی۔ محمدؐ ان میں سے نہیں تھے۔

جانے پہچانے راستوں سے ہٹ کر سفر کر رہا تھا کیونکہ قدم قدم پر دشمنوں سے خطرہ تھا۔ جو راستہ انہوں نے اختیار کیا تھا بڑی صعوبتوں کا راستہ تھا۔ اس پر نہ کنویں تھے نہ کوئی آبادی خالد بن حزامؓ تو راستے ہی میں انتقال کر گئے۔ ان ماجروں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کے سروں پر بگدھوں کے پروں کے علاوہ کسی چیز کا سایہ نہ تھا۔ یہ گدھ راستے بھر ان کے سروں پر منڈلاتے رہے، اس آس پر کہ کب ان میں سے کوئی نڈھال ہو کر گرے اور ان کا لقمہ بنے۔

ایسی بات گھمبھی کہاں رہ سکتی تھی۔ دن چڑھتے ہی خبر پھیل گئی۔ ابو جہل کے تن بدن میں آگ لگ گئی، اُس نے فوراً دارالندوہ میں اپنے حلیفوں کو اکٹھا کیا، انہیں غیرت دلائی اور بالآخر سب سے یہ طے کر لیا کہ ولید بن عقبہ کی قیادت میں گھڑ سواروں کا ایک دستہ ان کے پیچھے بھیجا جائے جو انہیں گرفتار کر کے واپس لائے یا وہیں صحرا میں ختم کر دے۔ اس سے چند ماہ قبل بھی سترہ مسلمان ہجرت کر کے حبشہ جا چکے تھے۔ ان میں عثمانؓ، حضورؐ کی صاحب زادی رقیہؓ، ابو سلمہؓ، مصعب بن عمیرؓ، عبد الرحمن بن عوفؓ اور زبیر بن العوامؓ شامل تھے۔ اُس مرتبہ قریش نے اس مسئلے پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی بلکہ اسے ایک طرح سے اپنی کامیابی تصور کیا تھا۔ اب پورے ایک سو مسلمانوں کا ایک بارگی ان کے چنگل سے یوں نکل جانا ان کی صریح شکست کے مترادف تھا۔

ولید اور اس کے گھڑ سواروں نے صحرا کا راستہ لیا اور کچھ دور جانے کے بعد انہیں ان کے قدموں کے نشان مل گئے بلکہ ایک میل تک تو وہ ان کے متوازی چلتے رہے لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا کہ اس کی راہ میں گھربار چھوڑنے والے ایک سو نفوس موزیوں کے ہتھے چڑھ جائیں۔ ہوا یہ کہ دشمنوں کے گھوڑے تک ان کی خوشبو نہ پاسکے اور جعفرؓ اپنے چھوٹے سے قافلے کو دشمنوں کی تلواروں اور گھوڑوں کے سمنوں سے محفوظ حفاظت کے ساتھ صحرا سے نکال لے گئے۔ اسے اگر معجزہ کہنا چاہیں تو کہہ لیجئے۔ میں تو اتنا

اسلام کی راہ میں سب سے پہلے ایک خاتون نے شہادت پائی۔ اُسے اسی وقت جنت کی بشارت مل گئی جب ہمارے دشمن ازلی، ابو جہل نے جمالت کے جوش میں اس کی پیلیوں میں اپنا نیزہ گاڑ دیا تھا۔ اُس کا نام سُمیہ تھا۔ سُمیہ بنتِ خطاب۔ عمار کی والدہ سُمیہ کا جرم یہ تھا کہ اُس نے ہبل کی پرستش سے انکار کیا تھا۔

اور بھی تھے جنہیں میدانوں میں کھبے گاڑ گاڑ کر ان کے ساتھ باندھا گیا اور کوڑے مار مار کر شہید کر دیا گیا یادہ مؤا کر کے سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔

اب صورتِ حال اتنی بدل چکی تھی کہ کچھ کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ مسلمانوں کی صفوں سے ایک ایک کر کے کئی اہل ایمان رخصت ہو چکے تھے یا معذور کر دئے گئے تھے۔ یہ محمدؐ کے لئے لمحہ فکریہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا۔ فیصلہ یہ تھا کہ جو لوگ کمزور ہیں اور جنہیں کئے میں کسی کی پشت پناہی حاصل نہیں وہ ہجرت کر جائیں۔ صرف وہ رہ جائیں جنہیں خون خرابے کے ڈر سے کوئی ہاتھ لگانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ وہ جو کسی کئی خاندان کے فرد تھے یا جنہیں کئے کے کسی خاندان کی سرپرستی حاصل تھی محفوظ تھے، اس لئے کیونکہ ان پر ہاتھ اٹھانے سے خاندانی بلکہ قبائلی محاذ آرائیوں کا خدشہ تھا۔ میں ابو بکرؓ کی سرپرستی میں تھا اس لئے کئے میں رہ سکتا تھا۔

ایک مقررہ رات کو علیؓ کے بڑے بھائی جعفرؓ تراسی مردوں اور سترہ عورتوں کو لے کر صحرا میں نکل گئے۔ ان میں جعفرؓ کی بیوی اسماء بنت عمیسؓ بھی تھیں، سودا بنت زمعہؓ بھی اور مقداد بن اسودؓ، ابو عبیدہ بن جراحؓ جیسے عظیم صحابی اور ام المومنین خدیجہؓ کے بھتیجے خالد بن حزامؓ، حکیم بن حزام کے بھائی بھی شامل تھے۔ وہ کئے سے ہجرت کر کے حبشہ جا رہے تھے۔ حبشہ سمندر پار میرے اجداد کا وطن تھا جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس ملک پر ایک عیسائی بادشاہ نجاشی کی حکومت تھی۔ نجاشی کے عدل کا دور دور شہرہ تھا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ

## نجاشی کا دربار

سردارانِ قریش نے یہ منصوبہ بنایا کہ شاہِ نجاشی کے پاس ایک سفارتی وفد بھیجا جائے جو مسلمانوں کو واپس لائے۔ اس وفد کی قیادت کے لئے انہوں نے قبیلہ سہم کے عمرو بن العاص کا انتخاب کیا کیونکہ وہ پہلے حبشہ ہو آیا تھا اور شاہِ نجاشی اور اس کے چند جرنیلوں اور درباری عمدہ داروں سے اُس کے نجی مراسم تھے۔ چڑے کی مصنوعات کی حبشہ میں بڑی پذیرائی تھی۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ عمرو و سائے مکہ کی طرف سے نجاشی اور اس کے منصب داروں کے لئے چڑے کے پیش بہا تحفے لے کر جائے۔ تمام شہر سے چڑے کی بہترین مصنوعات خرید کر عمرو کے حوالے کی گئیں اور عمرو حبشہ روانہ ہو گیا۔

حبشہ پہنچتے ہی عمرو بن العاص نے ایک ایک کر کے سب منصب داروں سے ملاقات کی۔ ہر ایک کو پیش قیمت تحفے پیش کئے اور تحفہ دیتے وقت ہر ایک سے کہا:

”ہمارے شہر کے چند نادان نوجوانوں نے یہاں حبشہ میں پناہ لے لی

ہی کہوں گا کہ جعفرؓ صحرا کے چپے چپے سے واقف تھے۔ وہ صحرا کی ہر رمز جانتے تھے۔ اُس کی چند ہیادینے والی دھوپ کو، اُس کے چھوٹے بڑے، بٹے بگڑتے ریت کے ٹیلوں کو، ان ٹیلوں کے سایوں کو۔ جعفرؓ کا علم ہی اُن کا معجزہ تھا۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ صحرا میں جعفرؓ اپنے آپ کو اپنے سائے میں چھپا سکتے تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جعفرؓ کو بڑی توفیق عطا کی تھی۔

بالآخر ولید اور اُس کے تھکے ہارے گھڑ سوار بے نیل و مرام مکے واپس آگئے۔ اُن کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں اور سب اپنی ناکامی پر بے حد شرمسار تھے۔ اُن کی ناکامی سے ہماری ہمت بڑھی اور ہجرت کو ہم نے باقاعدہ اپنی حکمت عملی بنا لیا۔ دو دو چار چار کر کے قافلے صحراؤں کے نادیدہ راستوں پر چلتے چلتے حبشہ پہنچتے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہمارے بہت سے ساتھی سمندر پار کر گئے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ حبشہ میں بھی بہت محفوظ نہیں تھے۔ ابو جہل برابر اُن کے خلاف منصوبے بنا رہا تھا۔ سردارانِ قریش کے ساتھ مباحثے کرتا تھا۔ انہیں اکساتا تھا، غیرت دلاتا تھا۔ ابو جہل اور اس کے حلیفوں کو ہماری چھوٹی چھوٹی کامیابیاں گھن کی طرح اندر ہی اندر سے کھائے جا رہی تھیں۔ ابوسفیان کا لہجہ اتنا دھیمہ پڑ گیا تھا کہ اُن دنوں اس کی گفتگو مشکل سے سنائی دیتی تھی لیکن جو کچھ سنائی دیتا تھا اس میں لفظوں کا وہی خوبصورت انتخاب، فقروں کی وہی چستی اور روزمرہ کا وہی دروست ہوتا تھا جو اُس کی گفتگو کا خاصہ تھا۔ اُدھر ابو جہل تو غصے میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اُس کے وقار کو دھچکا لگا تھا۔ مسلمانوں کی کامیاب ہجرتیں اُس کے لئے انا کا مسئلہ بن گئی تھیں۔ مسلمانوں کا اس طرح مکے سے فرار ہو کر کسی ہم سایہ ملک میں جا بسنا اور وہاں کھلے بندوں دندناتے پھرنا مکے کی تجارتی ساکھ کے لئے بھی اچھا نہیں تھا۔ چنانچہ ابو جہل نے ایک بار پھر دارالندوہ میں قریش کے سرداروں کو بلوایا اور یہ فیصلہ کروایا کہ اگر مسلمان صحرا اور سمندر میں گرفت سے بچ نکلے ہیں تو انہیں حبشہ

نہیں کیا اور کہا:

”وہ ہماری پناہ میں ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ اُن کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔ اگر اُن کے خلاف کوئی اثر لیا جائے تو ہم چاہیں گے کہ انہیں بلوایا جائے تاکہ وہ اُن کا جواب دے سکیں۔ اگر الزام درست ثابت ہوئے تو انہیں واپس بھیج دیا جائے گا۔ اگر نہیں تو انہیں اجازت ہوگی کہ وہ جب تک چاہیں ہماری پناہ میں رہیں۔“

مسلمانوں کو دربار میں بلوانے کے احکامات دے دئے گئے۔ مذہب کا معاملہ تھا اس لئے نجاشی نے اپنے بھتیگوں کو بھی بلوایا جو اپنی مذہبی کتابیں لے کر دربار میں پہنچ گئے۔ عمرو ہر قیمت پر یہ ملاقات رکوانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نجاشی کے اہل مکہ سے تجارتی اور سیاسی تعلقات ضرور تھے لیکن دل ہی دل میں وہ انہیں کفار اور بت پرستوں کے زمرے میں سمجھتا تھا۔ وہ ایک خدا کو ماننے والا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے تصور وحدانیت کی وجہ سے اُسے ہمدردی پیدا ہو جائے۔

آج عمرو بن العاص کو ہم فاتح مصر کے لقب سے جانتے ہیں، اور اُن کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کہتے ہیں۔ اُن دنوں میں وہ ایک ہوشیار، چرب زبان نوجوان تھا اور شاید یہی ضرورت سے زیادہ ہوشیاری اور چرب زبانی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اُس کی چالاکی اُس کے گلے کا ہار نہ بن جاتی تو سارے کے سارے مسلمان زنجیروں میں جکڑے کئے کے راستے پر ہوتے اور وہ خود دوزخ کا کندہ بنا ہوتا۔ رب کریم نے عمرو کو ناکام بنا کر اُس پر بڑی رحمت فرمائی۔

مہاجرین دربار میں داخل ہوئے تو پہلی ہی نظر میں وہ نجاشی کو اچھے لگے۔ اُن کے لباس کی سادگی، آداب کی شانستگی، چروں پر نور، مردباری دیکھ کر پاکیزگی اور تقدس کا احساس

ہے۔ اُن میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی ہیں۔ انہوں نے اپنا آبائی مذہب بھی چھوڑ دیا ہے، آپ لوگوں کا مذہب بھی اختیار نہیں کیا بلکہ اپنا ہی ایک الٹا مذہب ایجاد کر لیا ہے جسے نہ آپ جانتے ہیں نہ ہم۔ کئے کے شرفانے اس سلسلے میں مجھے آپ کے پاس بادشاہ سلامت سے یہ درخواست کرنے کے لئے بھیجا ہے کہ وہ انہیں واپس کئے بھجوا دیں۔ آپ سے میری اتنی التجا ہے کہ جب میں بادشاہ سلامت سے اُن کے بارے میں عرض کروں تو آپ بھی انہیں یہ مشورہ دیں کہ وہ انہیں ہمارے حوالے کر دیں اور اُن سے کوئی بات نہ کریں۔ ہم اُن کے عزیز ہیں۔ خود ہی انہیں سمجھا لیں گے۔“

سب نے عمرو کی درخواست مان لی۔ اب عمرو شاہ نجاشی کے تحائف لے کر دربار میں پہنچا۔ یہ تحائف منصب داروں کے تحائف سے کہیں زیادہ گراں قدر تھے۔ تحائف پیش کرنے کے بعد عمرو نے کچھ عرض گزارنے کی درخواست کی۔ اجازت ملنے پر اُس نے اپنا سلسلہ کلام شروع کیا۔ اسی انداز سے جیسے اُس نے جرنیلوں اور درباری منصب داروں سے بات کی تھی:

”آپ کی سلطنت میں کئے سے آئے ہوئے مہاجرین کے قریبی عزیزوں نے، جو ہمارے شہر کے سربر آوردہ لوگ ہیں، آپ سے التجا کی ہے کہ حضور اُن کے عزیزوں کو اُن کے پاس واپس بھجوا دیں۔“

سب منصب داروں نے یک زبان ہو کر نجاشی کو مشورہ دیا کہ عمرو کی درخواست مناسب ہے، منظور فرمائی جائے۔ یونکہ یہ مسئلہ مہاجرین اور اُن کے قریبی عزیزوں کے درمیان ہے اور اُن کے اعتراض ہی اس کی نزاکت کو سمجھ سکتے ہیں۔ بادشاہ نے اُن کا مشورہ پسند

شکست ثابت ہوئی مگر آج جاہ تاربخ کے دوسرے سرے پر بیٹھے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی شکست ہی اُس کی فتح ثابت ہوئی۔

ہو ایوں کہ جعفر نے عیسیٰ علیہ السلام کا بیان شروع کیا۔ بالکل اُس انداز سے جیسے ہم مسلمانوں کی تعلیم ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام نبیوں کے سلسلے کے ایک نبی تھے جو خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ سے پہلے تشریف لائے تھے۔ اُن کے پیروکار اُن سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اتنی محبت کہ اُنھوں نے غلطی سے اُنھیں اپنا معبود بنا لیا اور اُن کی عبادت کرنے لگے۔

حبشہ میں بھی عیسیٰ علیہ السلام کے لئے دلوں میں اتنی محبت تھی کہ اُن کا نام آتے ہی نجاشی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ عمرو نے بھی یہ آنسو دیکھے لیکن اُن کو محض آنکھوں کی چمک سے تعبیر کیا۔ جعفر نے مجھے بتایا کہ اُن کا بیان سنتے ہی عمرو نے اپنی عبا کو ایک جھینکے سے درست کیا اور اس طرح قدم گاڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی لکڑہارا اکھاڑی کے وار سے پہلے پینتر اجماتا ہے۔ یہ موقع تھا عمرو کو اپنی آخری جنت پیش کرنے کا جو اُس نے نہایت حتمی اور فیصلہ کن انداز میں پیش کی:

”یہ لوگ آپ کے پیغمبر کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ دوسرے پیغمبروں کی طرح کے ایک پیغمبر تھے۔ یہ لوگ انھیں خدا کا بیٹا بھی تسلیم نہیں کرتے۔ آپ نے خود سنا ہے کہ یہ اُن کی معبودیت سے منکر ہیں اور یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ شہید نہیں ہوئے تھے۔“

کتنی مہارت رکھتا تھا، عیوں کا یہ پجاری! کتنا عبور تھا اُسے دونوں مذاہب کے عقائد پر اور کتنی چابک دستی سے اُس نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلافات اور تضادات کو

ہو تا تھا۔ اُن کے مقابلے میں عمرو کا انداز نجاشی کو کرخت، غیر مہذب بلکہ چمچھورا معلوم ہوا۔ عیسائی علماء کا بھی مسلمانوں کے بارے میں پہلا ردِ عمل یہی تھا۔ انہیں وہ اپنے جیسے لگے۔ صاحبِ ایمان اور تمام اہلِ قریش سے مختلف جن سے وقفا و ققان کا سا بھہ پڑتا رہتا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے تو نجاشی نے عمرو کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے نکتہ نظر کی وضاحت کرے۔

عمرو بن العاص نے اپنے دلائل شروع کئے۔ اس کا بیان ختم ہوا تو نجاشی نے مسلمانوں سے سوال کیا کہ اس تقریر کے بعد کیوں نہ انہیں واپس کئے بھجوا دیا جائے۔ جعفر نے اُس وقت وہ حالت تھی جو دانیال علیہ السلام کی تھی جب اُنھیں شیروں کے پنجرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ بات کرنے لگے تو پہلے اُن کی زبان لڑکھائی، پھر لفظ ٹونے لگے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے ذرا آگے بڑھے تو ٹھوکر لگ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ حالات اُن کا ساتھ نہیں دے رہے۔

ادھر عمرو تھا کہ ہریات کی تردید کر رہا تھا۔ دلائل پر دلائل دئے جا رہا تھا۔ غصے سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے جعفر کو بھجھوڑا اور غدار کہا۔ اُن پر الزام لگایا کہ اُنھوں نے نعوذ باللہ ایک جھوٹے نبی کا بیانا تراش کے کئے کے سماجی نظام کو درہم برہم کر دیا ہے اور تان یہاں توڑی کہ یہ مسلمان جس مذہب کی پیروی کرتے ہیں وہ شروع سے آخر تک ایک لایعنی اور نامعقول مذہب ہے۔ عمرو تھا تو بت پرست مگر اُس نے انجیل کا سبق بہت اچھا یاد کر رکھا تھا۔ عیسائی مذہب سے واقفیت اور اپنے طنز و استہزا کی صلاحیت سے اُس نے سماں باندھ دیا۔ اس کے ہر دوسرے تیسرے فقرے پر دربار قہقہوں سے گونج اٹھتا تھا۔

ہو شیراری اور حماقت دونوں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں اور کبھی کبھی یہ دونوں باتیں ایک ہی انسان میں بھی مل جاتی ہیں۔ عمرو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُس کی فتح ہی اُس کی



سے ادا کیا کہ واقعی محسوس ہونے لگا یہ اللہ جل شانہ کے الفاظ ہیں۔ وہ جو وحدہ، لا شریک ہے!

اور کتاب میں مریم کا بھی ذکر کرو،  
جب وہ اپنے خاندان سے الگ ہو کر  
ایک مشرقی مکان میں چلی گئیں  
اور اپنے لوگوں سے پردہ کر لیا  
تو ہم نے ان کے پاس  
انسان کی شکل میں ایک فرشتہ بھیجا۔  
جب مریم نے اُسے دیکھا  
تو یوں لگی اگر تو خدا ترس ہے  
تو میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔  
فرشتے نے کہا:  
میں اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں  
کہ تمہیں ایک پاکیزہ بیٹا دوں۔  
مریم نے کہا:  
میرے یہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے،  
مجھے تو آج تک کسی انسان نے چھوا بھی نہیں  
اور میں بدکار بھی نہیں ہوں۔  
فرشتے نے کہا:  
یوں ہی ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے  
اُس کے لئے سب کچھ آسان ہے

سامنے لاکھڑا کیا اور انہیں ہوا دے کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ بادشاہ نے جعفرؑ کی طرف  
دیکھا اور کہا:

”بتاؤ، حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے؟“

یہ کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ کے اشارے سے محافظوں کو کہا کہ وہ جعفر کو آگے لے  
آئیں لیکن جعفرؑ اشارہ دیکھتے ہی خود محافظوں کے درمیان سے نکل کر آگے آگے۔

”قرآن حکیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو تحریر ہے وہ میں پیش  
کر دیتا ہوں اس کے علاوہ مجھے کچھ علم نہیں۔“

جعفرؑ نے جب بادشاہ کو ہمہ تن گوش دیکھا تو ان کی آواز مزید بلند ہوئی۔ اُن کی واحد  
امید یہ تھی کہ وہ حاکم وقت کو، اُس کے وزیروں، حواریوں، درباریوں کو، عمرو بن العاص کو،  
بادشاہ کے عالی شان تخت کے دونوں طرف پتھر کے بنے ہوئے چار دھاڑتے ہوئے  
شیروں کے جسموں کو، سب کو سنائیں کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں کیا ارشاد فرماتا ہے۔ کچھ  
لوگوں کا کہنا ہے کہ جعفرؑ نے آیات قرآنی اس خوب صورتی سے ادا کیں کہ بلال یاد آ گیا۔ یہ  
مجھے اس واقعے کے دس سال بعد خود عمرو بن العاص نے کہا تھا۔ بہر کیف میں اس تقابل کی  
معافی چاہتا ہوں۔ بلال تو محض ایک نقارہ ہے، اہل ایمان کو نماز کے لئے بلانے والا مؤذن جسے  
اپنی آواز دور تک پہنچانے کے لئے ایک بلند جگہ مہیا کی جاتی ہے۔ ویسے عمرو کی گفتگو اب تک  
وہی ہی لگتی رہی ہے۔

میں نے اور لوگوں سے بھی سنا کہ اُس روز جعفرؑ کی آواز بڑی اثر انگیز تھی۔ انہوں نے  
سورہ مریم کی آیات کی تلاوت کی تو محفل پر سحر چھا گیا۔ دربار کا ہر فرد حیرت زدہ، مبہوت،  
جعفرؑ کے منہ سے نکلتے ہوئے ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا تھا۔ عیسائی علماء کی آنکھوں میں  
بھی آنسو تھے۔ انہوں نے ہر لفظ کو اُس کے معنی اور سیاق و سباق کے لحاظ سے اس حسن اور اعتماد

اور وہ سچ کو اسی صورت میں پیدا کرے گا۔

تاکہ اُسے لوگوں کے لئے

اپنی نشانی اور رحمت بنائے

اور یہ سب طے ہو چکا ہے۔

ہر آنکھ سے آنسو رواں تھے اور خاموشی ایسی کہ دلوں کی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں۔ جب ان آیات کا ترجمہ سنایا گیا تو سب پر دوبارہ رقت طاری ہو گئی۔ نجاشی اپنے تخت سے اٹھا اور اُس نے جعفرؓ کو گلے لگا لیا۔

بادشاہ وقت کے بازو اُن کے گرد حائل تھے۔ اور عمرو تھا کہ انہیں زنجیریں پہنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

”ہم سونے کے پہاڑ کے عوض بھی تمہیں اہل مکہ کے حوالے نہیں کریں گے“

یہ کہہ کر نجاشی نے اپنی چھڑی کی نوک سے فرش پر ایک لکیر کھینچی اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”قرآن اور انجیل کا فرق اتنا ہی باریک ہے، آپ لوگ جب تک چاہیں یہاں رہیں۔“ یہ کہہ کر بادشاہ نے عمرو کے تحائف اُسے لوٹا دیئے۔

عمرو آخر عمرو تھا۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اُس نے ہار نہیں مانی۔ ڈھٹائی کے ساتھ بادشاہ کی طرف مسکرا کر دیکھتا رہا گویا یہ سب کچھ محض ایک کھیل تھا، ایک جو ا تھا جس میں اُس کا پانسہ ذرا غلط پڑ گیا تھا۔

یہ تھا حبشہ، شیروں کا مسکن، شہد کا منبع اور انصاف کا گھر، میرے اجداد کا وطن لیکن مکہ قافلوں اور تاجروں کا شہر تھا۔ یہاں کی ترازوؤں میں انصاف نہیں ریشم، مصلالے اور خوشبو میں تلتی تھیں۔ آیات الہی اُن کے پاس بھی پہنچی تھیں لیکن اُن کے ذہنوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ اُن کے کان اُنھیں سنتے تھے مگر اُن کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔

## معاشرتی مقاطعہ

اب اڈیتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا جو کوڑوں سے کہیں زیادہ اذیت ناک تھا۔ یہ ایک اجتماعی سزا تھی۔ محمدؐ کے سارے خاندان یعنی بوہاشم کے سب افراد کو شہری زندگی سے خارج کر دیا گیا۔ یہ محض ایک معاشرتی مقاطعہ نہیں تھا، اللہ کی زمین پر ایذا رسانی کی ایک انتہائی ہولناک صورت، انسان پر انسان کے ظلم کی ایک بدترین مثال تھی۔ بوہاشم سے ہر قسم کا لین دین، شادی بیاہ ممنوع کر دیا گیا۔ کوئی ان کو مہمان نہیں ٹھہرا سکتا تھا، کسی صورت میں ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ نہ روپے پیسے کی صورت میں، نہ جنس اجناس کی صورت میں، نمک اور شکر کی چٹکی بھی اُنہیں نہیں دی جاسکتی تھی۔ یہاں تک کہ کوئی انہیں سایہ تک مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ غرض یہ کہ انہیں ذات، قبیلہ، بزداری، تجارت، دوستی، مروت، رواداری ہر تعلق سے خارج کر کے بے یار و مددگار سپرد صحرا کر دیا گیا تھا۔ انہیں صرف اتنی رسد لے جانے کی اجازت تھی جو وہ اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جاسکیں۔ اس فیصلے کا اطلاق بوہاشم

اس دو سال سے زیادہ کے عرصے میں ہم پر جو گزری وہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا اللہ۔

ہم نے بھوک لور صحرائی پیاس برداشت کی۔ خاردار جھاڑیوں کے پیچھے عارضی پناہ گاہوں میں وقت گزارا۔ دن کی تپش سے بچنے ہلاک ہوئے تو رات کی سردی میں کئی ضیعفوں نے جان دے دی۔ قدم قدم پر مشکلات کا سامنا تھا۔ آسمانوں سے ہم پر موسیٰ علیہ السلام کی لنت کی طرح کوئی من وسلوئی نہیں اترتا تھا لیکن ہم نے حوصلہ نہ ہارا اور ہر لنت برداشت کرتے رہے۔ اس برداشت میں بھی ہمارے لئے سبق تھا کہ اگر صعوبتیں بالکل ہی انسان کی کمر نہ توڑ دیں تو وہ آزمائش سے مضبوط تر ہو کر ابھرتا ہے۔ ہمارے لئے یہ سبق شاید من وسلوئی سے بھی بہتر تھا۔

کے ہر فرد پر ہوتا تھا۔ اس کے لئے محمدؐ کے پیغام پر اعتقاد رکھنا، ان کی باتیں سننا، سننا، ان کو پسند کرنا، نہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ حضورؐ کے ساتھ سب کو سزا دی گئی تھی اور سزا کے لئے اتنا ہی جرم کافی تھا کہ وہ ان کے اہل خاندان ہیں۔ یہاں تک کہ عم زلو کا عم زلو بھی مستثنیٰ نہیں تھا۔ سب کو یوں صحرائی دھکیل دیا گیا تھا جیسے وہ چھوت کے کسی خوف ناک مرض میں مبتلا ہوں۔ جو مطلب نے اس اقدام کی مخالفت کی تو انہیں بھی اس مقاطعے میں شامل کر دیا گیا۔ صرف ابو لیب، ابو ہاشم ہونے کے باوجود اس سے مستثنیٰ تھا کیونکہ وہ علی الاعلان پیغام رسالت کا منکر تھا۔ مقاطعے کے اعلان کے فوراً بعد جب محمدؐ اور خدیجہؓ ابو اسد کا خاندانی مکان چھوڑ کر ابو ہاشم کے محلے میں اُنھ آئے تو ابو لیب کو ان کی ہمسائیگی اس درجہ ناگوار گزری کہ اُس نے اپنی بیوی ام جمیل سمیت نکلنے کے کسی لور محلے میں رہائش اختیار کر لی جہاں اُس نے پہلے ہی سے ایک گھر خرید رکھا تھا۔

مقاطعے کے ختم ہونے کی شرط یہ تھی کہ یا ابو ہاشم خود محمدؐ کا مقابلہ کریں یا محمدؐ رسالت کے دعوے سے باز آجائیں۔

مشرکین کی سوچ یہ تھی کہ اسلام کو صحرا کے حوالے کر دیا جائے جہاں وہ اپنی تمام جزیات سمیت سورج کی ہولناک تپش میں جل بھن کر اپنی موت خود مر جائے۔ اس حکمت عملی کی ایجاد کا سر ابو جہل جیسے سازشی دشمن کے علاوہ کس کے سر ہو سکتا تھا۔ اسی نے یہ منصوبہ بنایا، اسی نے قریش کے سرداروں کا اجتماع کیا، اسی نے اس کے حق میں دلائل دے کر سب کو قائل کیا اور آخر کار چالیس سرداروں کے دستخط سے یہ معاہدہ طے پا گیا۔ سب سردار اس کے حق میں تھے مگر ابو جہل کے جوش و خروش کے آگے سب نے اپنے اپنے اعتراض واپس لے لئے، سوائے ابو مطلب کے جن کو ابو ہاشم کے ساتھ ہی شامل کر دیا گیا۔ یہ تھا سفارتِ حبشہ کی ناکامی پر ابو جہل کا ردِ عمل!

## حمزہ رضی

جب ہم شہری زندگی سے کٹ کر وقت گزار رہے تھے تو ہمیں مکے کی بہت کم خبریں ملتی تھیں۔ چھپے چوری کسی سے مل لیتے تھے تو پتہ چلتا تھا کہ مکے میں جہاں ہمارے خلاف کئی محاذ قائم تھے، وہاں اکاد کا آوازیں ہمارے حق میں بھی ابھرتی رہتی تھیں۔ بہت نحیف، بہت کمزور مگر ان کا وجود ضرور تھا۔ کسی گلی کے موڑ پر، کسی بازار کوپے میں، کوئی نہ کوئی ہماری بے بسی کا رونا بھی رو لیتا تھا۔ کہیں کہیں لوگ دلی زبان میں اس مقاطعے پر نکتہ چینی بھی کر لیتے تھے۔ تھوڑی دیر کو ڈھارس بندھ جاتی تھی مگر ابھی ہم پر بہت عذاب آتا تھا۔ سختیوں کی انتہا ابھی باقی تھی۔ نئے حادثات، نئی مشکلات ہماری منتظر تھیں لیکن اس عرصے میں ہمیں حمزہ اور عمر کی وجہ سے بڑی تقویت رہی۔ دونوں مقاطعے سے چند روز پہلے اسلام لے آئے تھے۔ ایک اور جھونکا تھا ٹھنڈی ہوا کا جو آتا تھا تو ہمارے دل و دماغ کا ایک ایک گوشہ کھل اٹھتا تھا۔ یہ وحی الہی تھی جو ہمارے نبی پر و قنوقنا نازل ہوتی رہتی تھی اور ہمیں احساس

رہے تھے۔ ایک مردہ شیر اُن کے گھوڑے پر بندھا ہوا تھا۔ کئے میں داخل ہوتے ہی انہیں ابو جہل کی ہرزہ سرائی کی خبر ملی۔ اسی حالت میں گھوڑے پر سوار ابو جہل کے پاس پہنچے۔ جو اب حطیم میں اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ابو جہل اُن کے تیور دیکھ کر بھی صورتِ حال کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا۔ جب حمزہؑ نے اُسے لکارا اور پوچھا کہ تم کیا کہہ رہے تھے محمدؐ کو، تو اُس نے جو کچھ کہا تھا من و عن دہرا دیا۔ بس پھر ایک آواز آئی۔ حمزہؑ کی کمان کی جوانموسوں نے ابو جہل کے سر پر ماری تھی۔ ابو جہل کا چہرہ خون سے لت پت ہو گیا اور وہ ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے تیوراً کر زمین پر گر پڑا۔ حمزہؑ سے بدلہ لینے کی اُس میں جرأت نہ تھی۔ صرف دانت پسین کر رہ گیا۔ حمزہؑ شاعر ضرور تھے مگر بحثِ مباحثے میں پڑنا اُن کی عادت نہیں تھی۔ بہت مختصر بات کرتے تھے۔ انہوں نے کعبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”جب میں راتوں کو کھلے آسمان تلے، صحرا کی وسعتوں میں

شکار کی تلاش میں پھرتا ہوں تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ کسی

کمرے میں بند نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے نیچے اتر آئے اور زمین پر پاؤں گاڑ کر سب کے چہروں پر نظر دوڑائی جو یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے:

”میرے بھتیجے کا مذہب میرا مذہب ہے، اُس کا اللہ میرا اللہ ہے۔ کسی میں ہمت ہے تو مجھ پر ہاتھ اٹھائے۔“

کس میں جرأت تھی کہ اُس پھرے ہوئے شیر کے مقابلے پہ آتا۔ ہجوم میں حرکت ضرور ہوئی لیکن اس لئے کہ ہر شخص جلد از جلد حمزہؑ کے راستے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ حمزہؑ وہاں سے سیدھے رسولِ کریمؐ کے پاس گئے اور اسلام لے آئے۔

ابو جہل کی بد بختی کا ایسا ہی ایک منظر کچھ دنوں بعد دوبارہ دیکھنے میں آیا۔ بنو ہاشم کے معاشرتی

دلائی رہتی تھی کہ وہ جو ساری قدرت، ساری طاقت، سارے اختیار کا مالک ہے ہمارے ساتھ ہے۔ وہ جب ہماری اس التفات سے نشوونما کر رہا ہے تو پھر ہمیں کیا غم۔ کوئی انسانی طاقت، کوئی معری سازش ہمارے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی۔ جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اگر اُس نے کرہ ارض پر اپنی مشیت کے مطابق نظام قائم کرنے کے لئے ہم کو منتخب کر ہی لیا ہے تو اُس کے فیصلے پر عمل ہو کر رہے گا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ حمزہؑ اور عمرؓ دونوں کے اسلام لانے کے موقع پر بات غصے سے شروع ہوئی اور دونوں مرتبہ خون بھی بہا۔ حمزہؑ نے پہل کی۔ حمزہؑ رسالتِ مآب کے چچا بھی تھے اور دودھ شریک بھائی بھی۔ بہت کچھ شمیم، قوی الجبہ۔ سارے عربستان میں شیروں کے شکاری کی حیثیت سے اُن کا ڈنکا جاتا تھا۔ شجاعت اور علمِ حرب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ کوئی تلوار اُن کی تلوار سے زیادہ وزنی نہیں تھی، نہ کوئی نیزہ اُن کے نیزے سے زیادہ تیز رفتار۔ اُن کی کمان سے نکلا ہوا ہر تیر، تیر قضا تھا۔

شکار میں کوئی اس شیروں کے شکاری سے زیادہ شجاع اور تیز نظر رکھنے والا نہیں تھا۔ قوتِ شامہ کا یہ عالم تھا کہ ہوا کو سونگھ کر جانور کا محل وقوع بتا دیا کرتے تھے۔ زمین پر پاؤں اتنے ہلکے پڑتے تھے کہ چاپ نہیں سنائی دیتی تھی۔ شجاعت اور قوت کے اس عظیم پیکر کی زندگی کا ایک اور رُخ بھی تھا۔ وہ نہایت مرنجاں مرنج، خوش مزاج، نرم خوار و حساس طبیعت تھے۔ گھوڑے پر جاتے جاتے سامنے کسی جھاڑی پر کوئی پھول کھلا دیکھتے تو اس خیال سے کہ وہ روندانہ جائے، گھوڑا اس کے گرد گھما کر لے جاتے۔ کبھی کبھی رزمیہ شاعری بھی کرتے تھے جو اُن کی شخصیت سے بہت مناسب رکھتی تھی۔

لیکن اُس دن جب ابو جہل نے کوہِ صفا کے دامن میں محمدؐ کو جھوٹا، دغا باز اور جانے کیا کیا کہا تھا، خوش مزاجی حمزہؑ سے کوسوں دور تھی۔ حمزہؑ صحرا سے شیر کا شکار کر کے لوٹ

ابو الجتری کے مکوس اور ٹھوکروں کی زد میں زمین پر پڑا کر رہا تھا۔ حمزہؓ کو دیکھ کر ابو الجتری نے ہاتھ روک لیا اور بغیر مزید کچھ کہے نئے وہاں سے چل دیا۔ حمزہؓ نے ابو جہل پر ایک نظر ڈالی۔ میں بھی پہنچ گیا اور میں نے غلام کو آنے کی بوری اٹھوائی۔ حمزہؓ اور حکیم دونوں ابو جہل کو اسی حالت میں چھوڑ کر چل دیئے اور میں اور غلام دونوں ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ کچھ فاصلے پر جا کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ابو جہل ایک بوے سے پتھر کے سارے آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور انتہائی بے بسی کے عالم میں ہماری سمت نکتے جا رہا تھا۔ اُس دن بھی کم و بیش وہی منظر حمزہؓ کے سامنے تھا جو اپنے قبولِ اسلام کے دن انہوں نے حطیم میں دیکھا تھا۔

مقابلے کے ابتدائی ایام تھے۔ مقابلے پر عمل شروع ہو چکا تھا لیکن مقابلے کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اس پر پوری طرح عمل درآمد ممکن نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ بنو ہاشم کے یہاں بیابانی ہوئی خواتین اپنے آبائی خاندانوں کی افراد بھی تھیں اور اس حیثیت میں ان پر اصولاً بنو ہاشم کے معاشرتی مقابلے کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک دن بنو اسد کے حکیم بن حزام جو مولود کعبہ تھے ایک غلام سے آنے کی بوری اٹھوائے حملہ بنو ہاشم کی طرف جارہے تھے کہ راستے میں ابو جہل نے انہیں دیکھ لیا اور لگاوا ہی تباہی بننے۔

”یہ اناج ہمارے دشمنوں کے گھر نہیں جاسکتا“ وہ غصے سے بولا

اسی موقع پر بنو اسد کا ایک اور فرد ابو الجتری اُدھر آ نکلا۔ گو وہ بھی مسلمان نہیں تھا

لیکن معاملے کی نوعیت جاننے کے بعد اُس نے ابو جہل سے کہا:

”انہن ہشام، حکیم بنو اسد کا فرد ہے اور اپنی پھوپھی کا سامان لے کر جا رہا ہے۔ تم

کون ہوتے ہو اُسے روکنے والے“

بات اصول کی تھی مگر ابو جہل کی خردماغی کو پسند نہ آئی۔ تلخ کلامی بڑھی تو بات ہاتھ پائی تک پہنچ گئی۔ ابو جہل نے پہل کی۔ ابو الجتری نے سڑک کے کنارے پڑی اونٹ کی ایک بڑی ہڈی اٹھا کر ابو جہل کے سر پر دے ماری۔ ابو جہل چکر اکر گڑ پڑا۔ اُس کے گرتے ہی ابو الجتری نے اُسے پے در پے ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ میں یہ سارا تماشا گلی کی نکل سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دیکھتی آنکھوں سے نہ دیکھنے والے یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنے اعتقادات کی کم مائیگی اور بے بضاعتی کو جانتے ہوئے بھی راہِ فلاح اختیار نہیں کرتے اور محض چند ذاتی مفادات کی خاطر ایک ایسے شخص کی زندگی اجیرن کئے ہوئے ہیں جس کی شرافت، نجابت، دیانت اور امانت کے وہ قائل بھی ہیں۔ انہیں خیالات میں غلطیاں تھا تو دیکھا حمزہؓ چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے شاید مجھے نہیں دیکھا اور سیدھے اُدھر کا رخ کیا جہاں ابو جہل،

## ابنِ خطاب

حزہ کے اسلام لانے کے بعد ابو جہل، ابو لہب، امیہ، عقبہ سب لوگ سناٹے میں آ گئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب مسلمانوں سے کیسے نمٹا جائے۔ بازار میں بھی جہاں دو آدمی کھڑے ہوتے گفتگو کا موضوع یہی ہوتا کبھی باوا زبند، کبھی سرگوشیوں کے انداز میں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ حمزہ سے ٹکر لے۔ تین روز ہو چکے تھے حمزہ کو اسلام لائے۔ ہمارے لئے یہ سکون کے دن تھے۔ یہ تو ہمیں پتہ تھا کہ یہ دور رہے گا نہیں۔ ہمارے دشمن ضرور کوئی نہ کوئی چال سوچ رہے ہوں گے مگر فی الوقت طوفان ختم گیا تھا۔ اگر کوئی رمل میں مل بھی جاتا تو طرح دے جاتا، منہ پھیر لیتا، ناک بھونچڑھایا تاکر کہتا کچھ نہیں۔

عموں پر غم سننے کی تو ہمیں عادت سی ہو گئی تھی مگر خوشی پر خوشی ہمارے لئے نئی بات تھی۔ ابھی ہم حمزہ کے قبولِ اسلام پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہی ادا کر رہے تھے کہ مکے کی گلیوں میں ایک شخص نظر آیا۔ آنکھوں میں خون اتر اہوا، ہاتھ میں ننگی تلوار لہراتا، اسلام اور

رسول اسلام کے خلاف زہر اگلتا۔ وہ اعلان کر کے آیا تھا کہ آج وہ ایک ہی ضرب میں قریش مکہ کی ساری پریشانیوں دور کر دے گا۔ یہ مہم جو نوجوان اتنا طویل القامت تھا کہ کھڑے کھڑے اُچھل کر گھوڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔ مزاج سنجیدہ مگر غصیلا۔ پیشہ بازنطین سے پتھروں اور مصالحوں کی تجارت، عمر چھبیس سال، نام عمر ابن خطاب۔

جس وقت یہ نوجوان مکے کی گلیوں سے گزر رہا تھا، رسول اللہ اِراقم میں تھے۔ ابو قیس کی پہاڑی کے دامن میں، حرم کعبہ کے نزدیک، اِراقم کا گھر کچھ عرصے سے ہماری مسجد بھی تھا، ہماری پناہ گاہ بھی۔ چند صحابہ حضور کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ مجھے وہ نظر آیا۔ اُس کی اسلام دشمنی کے تو ہم پہلے ہی کئی وار سہہ چکے تھے۔ اس وقت اُس کے یہ تیور دیکھے تو میں نے فوراً رسول اللہ کو مطلع کیا۔ میرا خیال تھا وہ یہ خبر سنتے ہی فوراً کچھ حفاظتی انتظامات کا حکم دیں گے مگر انہوں نے نہایت دھیرج سے جواب دیا:

”عمر کے مجھ تک پہنچنے کے وقت کا انتخاب اللہ تعالیٰ کرے گا۔“

میں پھر دوڑ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ وہ تلوار لئے چلا آ رہا تھا، سیدھا ہماری طرف۔ میں نے عرض کی:

”یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے وقت کا انتخاب کر دیا ہے۔ عمر آ گیا ہے۔“

یہ سن کر حمزہ نے کہا:

”آنے دو۔ اگر نیک نیتی سے آیا ہے تو خیر ورنہ اسی کی تلوار سے اُس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔“

سب لوگ چوکے ہو کر بیٹھ گئے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چولے پر ایک دیچار کھا تھا جس میں پانی کھول رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر خدا نخواستہ ضرورت پڑی تو شاید یہ بھی کام آجائے۔ ویسے مجھے ہی نہیں ہم سب کو حمزہ کی موجودگی سے برا حوصلہ تھا۔

میں پھر کھڑکی کے پاس جا کہ کھڑا ہو گیا۔ وہ لمبا ترنگا نوجوان اب ہمارے دروازے سے کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر ہو گا۔ اُس کے اپنے حساب سے زیادہ سے زیادہ چالیس قدم۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک ضعیف آدمی جس کی پشت ہماری جانب تھی، اُس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ مجھے لگا کوئی بھکاری ہے۔ یہ بھکاری بھی بھیک مانگتے وقت کوئی موقع محل نہیں دیکھتے۔ یہ شمشیر بخت نوجوان اپنی غصیلی طبیعت کے باوجود ایک مخیر انسان تھا لیکن اُس نے اس بوڑھے کو کچھ دینے کی بجائے، اُسے جھنجھوڑ کر راستے سے ہٹا دیا۔ پھر پتہ نہیں کیسی کیسی قسمیں کھا کر چلایا:

”میں اُس بد نصیب عورت کے گلے کر ڈالوں گا۔“

اس فقرے میں تانیث کا صیغہ سُن کر مجھے گونہ اطمینان ہوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ایک مڑا لور لٹے پاؤں اسی راستے پر چلا گیا جدھر سے آیا تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اگلتا تھا جیسے اُس کے اندر کوئی عفریت داخل ہو گیا ہے۔

بظاہر خطرہ مٹ گیا تھا مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج بات یہیں ختم نہیں ہو گی۔ میں اُس نوجوان سے واقف تھا۔ سارا مکہ اُسے جانتا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو کسی کام کا عزم کرنے کے بعد اُسے اُدھورا چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ میں کھڑکی کے پاس انتظار کرتا رہا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ وہی بزرگ چلے آ رہے ہیں جنہوں نے عمر کا راستہ روکا تھا اور جنہیں میں دُور سے بھکاری سمجھا تھا۔ یہ مکے کے ایک درمیانے درجے کے تاجر تھے۔ نعم بن عبد اللہ جو کچھ عرصہ پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر ابھی اس کا اعلان نہیں کیا تھا۔ وہ دروازے سے داخل ہوتے ہی سیدھے حضور کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور اُنہیں عمر سے اپنی ملاقات کا سارا ماجرا سنایا۔ کہنے لگے:

”میں نے باہر گلی میں عمر کو ہاتھ میں تلوار لئے ادھر آتے دیکھا تو پوچھا



یہ کہہ کر وہ کمرے کے وسط میں جا کہ کھڑے ہو گئے، سارے صحابی بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں حسبِ حکم دروازہ کھولنے کے لئے پہنچا ہی تھا کہ باہر سے دستک سنائی دی۔ عمر تلوار کے دستے سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے فوراً چٹنی اتار کر دروازہ کھول دیا۔ اب جو میں نے دیکھا اس پر مجھے آج تک یقین نہیں آتا۔ وہ جھک کر دروازے سے داخل ہوا۔ اُس کے اندر قدم رکھتے ہی رسول اللہ خود آگے بڑھے اور اس کا دامن جھٹک کر اُس سے پوچھا:

”کیوں عمر، کس ارلوے سے آئے ہو؟“

ساری کائنات کی قوت سمٹ آئی تھی اس مختصر سے سوال میں۔ عمر سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ اُس نے رسالت مآب کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔ پھر پیچھے کھڑے حاضرین کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔ اُس کے بعد اُس نے نظریں نیچی کر لیں اور اپنی تلوار کو دیکھتا رہا۔ اُس کے اندر ایک بیجان برپا تھا، ایک لاوا تھا جو پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔ ہم سب کی نظریں اُس پر جمی تھیں۔ یکایک اُس نے تلوار ہاتھ سے گرا دی اور کہنے لگا:

”میں اعلان کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمد اُس کے رسول ہیں۔“

یہ سنتے ہی رسول کریم نے اور اُن کے ساتھ مل کر ہم سب نے اتنے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا کہ بوقیتس کی چٹانیں گونج اٹھیں۔

عمر عورتوں مردوں میں اسلام لانے والے چالیسویں فرد تھے۔

عمر کے قبولِ اسلام کا تو میں چشم دید گواہ ہوں لیکن اُن کے پہلی مرتبہ آنے اور دوسری مرتبہ آنے کے درمیان ایک گھنٹے میں کیا معجزہ رونما ہوا، اس کی تفصیل مجھے بعد میں خواب نے بتائی۔

خباب بن ارتؓ لوہار تھے اور اپنے فولاد کی طرح سچے اور قابلِ اعتماد۔ جس وقت عمرؓ اپنی ہمیشہ کے گھر پہنچے تو خبابؓ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ اکثر ان میاں بیوی کو

کہ تلوار کیوں میان سے نکال رکھی ہے۔ اُس نے جواب دیا اُس کو قتل کرنے کے لئے جس نے قریش میں تفرقہ ڈال رکھا ہے۔ میں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ اس پر وہ نہایت غضب ناک ہو کر پوچھنے لگا۔ کون سے گھر کی؟ میں اپنے مسلمان ساتھیوں کا راز فاش نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس صورتِ حال میں مجھے اور کچھ نہ سوجھا۔ میں نے کہہ دیا اپنی ہمیشہ اور بیوی کی جو محمدؐ کی رسالت پر ایمان لاپکے ہیں۔ یہ سنتے ہی اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے مجھے جھنجھوڑ کر پرے کیا اور اپنی ہمیشہ کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ شدید اشتعال کے عالم میں چیخا چلا تا اور اپنی ہمیشہ کے قتل کی دھمکیاں دیتا۔ اللہ ان دونوں میاں بیوی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے!“

عمر کے اسی اشتعال کا مظاہرہ میں نے دُور سے دیکھا تھا۔ نغم کی روداد اُن کر ہم سب دل ہی دل میں اپنے ساتھیوں کی خیریت کی دعائیں مانگ رہے تھے کہ اتنے میں میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ عمر دوبارہ چلا آ رہا ہے۔ کھینچی ہوئی تلوار اب بھی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے فوراً ہماگ کر دروازہ بند کر دیا اور چٹنی لگا دی۔ رسول اللہ نے صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے کہنے لگے:

”دروازہ کیوں بند کر دیا بلال؟“

میں نے کہا:

”عمر پھر آ رہا ہے تلوار لہراتا ہوا۔“

انہوں نے ایک لمحے کے لئے مجھے خاموش نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا:

”پیغمبر کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں ہوتا۔ اللہ سے ڈرو بلال اور دروازہ کھول دو۔“

آیت پر پہنچے۔ تو وہ سر سے پاؤں تک لرز گئے۔

اِنْبٰی اَنَا اللّٰه لا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاَعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ،

(۱۴ ك طه ۲۰)

(بیشک میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو میری عبادت کیا کرو

اور میری یاد کے لئے نماز پڑھا کرو)

عمرؓ نے خود مجھے بعد میں بتایا کہ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قرآن کی شوکتِ الفاظ اور حکمتِ ابدی کا دریا انہیں تنکے کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ انہیں اپنے اندر ایک حلاوت سی سرایت کرتی محسوس ہوئی۔ ظاہر و باطن ایک ہو گیا تو سب کو ان کی کیفیت کا علم ہو گیا۔ خبابؓ بھی باہر نکل آئے اور ان سے محاذب ہو کر کہنے لگے :

”رسول اللہ نے کل ہی دُعا کی تھی کہ یا اللہ! من خطاب یا لکن ہشام میں سے کسی ایک

کے ذریعے اسلام کو تقویت پہنچا“

اور پھر جس جس طرح اللہ تعالیٰ نے عمر کے ذریعے اسلام کو تقویت بخشی اس کا

حال اظہر من الشمس ہے۔

قرآن سنانے جایا کرتے تھے۔ عمرؓ دروازے پر ہی ان کی آواز سن کر بھٹنے۔ عجیب و غریب دم کے الفاظ ان کے کانوں میں پڑے تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ سمجھ گئے کہ نعم کی اطلاع ٹھیک تھی۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئے، خبابؓ ان کی آہٹ سن کر گھر میں کہیں چھپ گئے اور جاتے جاتے قرآنی آیات کا مسودہ فاطمہ بنت خطابؓ کو دے گئے۔ فاطمہؓ نے فوراً وہ تحریر اپنے کپڑوں میں چھپالی اور سہم کر اپنے شوہر سعید بن زیدؓ کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ عمرؓ سعیدؓ کی طرف بڑھے تو فاطمہؓ پیچ میں آگئیں۔ عمر نے اس زور سے ان کے منہ پر تھپڑ مارا کہ ان کا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ پھر عمر نے کہا مجھے بتاؤ یہاں کیا پڑھا جا رہا تھا۔ مجھے وہ تحریر لا کر دو کہ میں خود پڑھوں، اس میں کیا لکھا ہے۔ فاطمہ نے نہایت پر اعتماد لہجے میں کہا کہ آپ بتوں کے پجاری ہیں۔ میں یہ تحریر ناپاک ہاتھوں میں نہیں دے سکتی۔ ہمیشہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر عمر انہیں غور سے دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے سے اب بھی خون بہ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے گئے اور غسل کر کے واپس آگئے۔ فاطمہؓ کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ان کے غصے کی شدت کم ہو گئی ہے۔ انہوں نے وہ تحریر ان کے حوالے کر دی اور عمر نے آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کر دیا۔ فاطمہؓ اور سعیدؓ کی نظریں ان پر گڑی ہوئی تھیں۔ دونوں ان کے چہرے سے ان کے قلبی تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ قرآن حکیم کی سورہ طہ کا ایک صفحہ تھا جو حال ہی میں نازل ہوئی تھی۔ حسن و مزیت کے اس مرقعے کو انہوں نے شرح و تفسیر سے ماوراء پایا۔

اللّٰه لا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (ك طه ۲۰)

(وہ معبود حق ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اُس کے سب نام اچھے ہیں)

عمر پڑھتے جاتے تھے اور ہر لفظ کے ساتھ حیرت میں ڈوبتے جاتے تھے۔ کلام الہی کا

جلال، اُس کا جمال ان کے رگ و پے میں پیوست ہو کر شمعیں روشن کرتا جاتا تھا۔ جب اس

## ابو جہل

غلاموں اور آزاد لوگوں کی سوچ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آزادی اور غلامی، زندگی کے دو دھارے ہیں جو الگ الگ بہتے رہتے ہیں اور اپنے بہاؤ کی سمتیں خود متعین کرتے ہیں، ہم غلام کیا تھے، چند حشرات الارض جو آتے جاتے موسموں کے ساتھ پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔ ہمارا دائرہ حیات بہت محدود تھا۔ ہماری خرید، ہماری فروخت، ہماری قیمت، ہمارا آقا، ہمارے آقا کا مزاج، اپنے غلاموں سے اُس کا سلوک اور بس۔ یہی ہماری ساری کائنات تھی، یہی ہماری زندگی کا محور۔ اس کے علاوہ ہمارے ارد گرد جو بھی ہوتا رہتا تھا، اُس کے ہم خاموش تماشائی تھے۔ دوسرے غلاموں سے ہمارے میل جول کے مواقع بہت کم ہوتے تھے مگر ہم جب بھی ملتے، یہی چند موضوع ہماری گفتگو کا مرکز بنتے۔ یہ ہم غلاموں کو بھی علم تھا کہ کئی زندگی ایک انقلاب سے دو چار تھی۔ ایک طرف محمد بن عبداللہ تھے اور دوسری طرف مکے کے بڑے بڑے سردار، رئیس، تاجر۔ سارے کے سارے سانپوں اور

جو اُس کے ہر فلرو عمل کے پس منظر میں جھلکتی رہتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے ضعیف چچا، ولید کی وفات کے بعد خاندان مخزومی کا سربراہ بن جائے۔ اس منصب کا وہ اتنی شدت سے متمنی تھا کہ اس کے لئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتا تھا۔ وہ صاحب ثروت تھا مگر اپنی دولت کی ایک ایک پائی اور اپنا سارا وقت اپنی ذاتی شہرت اور نیک نامی حاصل کرنے پر خرچ کرتا تھا۔ یہی اُس کی مہمان نوازی اور سخاوت کا پس منظر تھا، یہی اس کی میل ملاقات کا۔ قریش کے مذہبی عقائد کا وہ پابند ضرور تھا لیکن اُن کا تحفظ اُس کے نزدیک اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ اپنے تقریر اہلی کے لئے فضا ہموار کرنے کا کام۔ وہ اکثر اپنے ہم منصبوں کی ضیافت کا اہتمام کیا کرتا تھا مگر مہمان نوازی کی عظیم عرب روایت کے سلسلے میں نہیں، محض اس لئے کہ قریش کے سرداروں میں اثر سوخ رہے۔ دوسروں کے کام آنے میں بھی اُس کا بیلوی مقصد یہی تھا کہ صاحب الرائے حضرات میں اُس کی ساکھ بڑھے اور وقت آنے پر اُن کی رائے اُس کے حق میں ہو۔

ذاتی کردار اُس کا یہ تھا کہ شہر کی ہر سازش اُس کے ذہن سے شروع ہوتی تھی۔ بڑوں سے اُس کا رویہ خوشامدانہ تھا، ہم مرتبت لوگوں سے مصالحتانہ اور کم حیثیت افراد سے معاندانہ بلکہ سفاکانہ۔ سارے کلمے میں وہ ظلم و تشدد کی علامت بنا ہوا تھا۔ مخالفین سے نمٹنے کے لئے وہ انتہائی پیدردی کا مظاہرہ کر گزرتا تھا۔

مسلمانوں سے اُس کا بیزاری بھی، جو اُس کی پہچان بن چکا تھا، محض اس لئے نہیں تھا کہ وہ اُس کے خداؤں کو جھٹلاتے تھے بلکہ اس لئے کہ داعی اسلام، محمدؐ، خاندان عبد مناف کے فرد تھے۔ ولید کی جانشینی کے معاملے میں عبد مناف کا خاندان ابو جہل کا حریف تھا۔ فیصلہ ان ہی دونوں میں ہونا تھا۔ ابو جہل نے اس ضمن میں بھرپور کوشش کر رکھی تھی اور عبد مناف کے اُمیدواروں کے مقابلے میں دعوتوں اور مہمان نوازیوں کی وجہ سے اُس کی ساکھ خاصی حد تک بہتر تھی مگر محمدؐ کے دعویٰ رسالت کے بعد تو اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ

بچھوؤں کی طرح محمدؐ کی تحریک کو زک پہنچانے کے درپے تھے۔ سانپوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ کم زہریلی، کچھ زیادہ اور کچھ اتنی بس بھری کہ اُن کا کاٹنا پانی نہیں مانگتا۔ اس آخری قسم میں اُس وقت چار لوگ تھے۔ ابو جہل، ابو لہب، اُمیہ اور ابو سفیان۔ اور بھی بہتر سے سانپ تھے مگر اُن کے زہر کا توڑ ہو جاتا تھا بلکہ کبھی کبھی ایک کا زہر دوسرے کے زہر کا تریاق ہو جاتا تھا مگر ان چاروں کے کاٹنے کا کوئی منتر نہیں تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار بچھو تھے جو محض عاداتاً ڈنک مارتے رہتے تھے۔ مخالف میں دم خم ہوا تو وار سہہ گیا، نہیں تو تڑپتا رہا۔ ان موذیوں میں سر فرست بلکہ ان کا سر غنہ، مو مخزوم کا ابو جہل تھا۔ ان میں سے ابو سفیان پر تو بعد میں اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہوا۔

ابو جہل کا معاملہ باقی مشرکین مکہ سے مختلف تھا۔ وہ خود بھی اُن سب سے مختلف تھا۔ قریش کے سرداروں کی کچھ خاندانی اور قبائلی قدریں تھیں جنہیں وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ عرب کی وسیع تر ثقافت کا حصہ بھی تھے۔ اور اس مناسبت سے اُن پر صحرائے عرب کی مجموعی روایات کی پاسداری کی بھی ذمے داری تھی۔ یہی نہیں، محافظ کعبہ ہونے کی حیثیت سے قریش مکہ سارے عرب قبائل میں ایک مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کا سب قبائل سے براہ راست واسطہ تھا۔ متولیان کعبہ ہونے کا اعزاز اور قبائل سے قریبی تعلق اس امر کے متقاضی تھے کہ وہ نہ صرف عربوں کی اجتماعی روایات کے علمبردار ہوں بلکہ اس ضمن میں وہ کردار پیش کریں جو مثالی اور قابل تقلید ہو۔ قریش مکہ کا خمیر انہی اجزائے ترکیبی سے اٹھا تھا۔ یہ ساری قدریں ابو جہل کو بھی وراثت میں ملی تھیں اور وہ بظاہر اُن پر عمل پیرا ہونے کا دعوے دار بھی تھا مگر اُس کی اپنی سوچ میں اپنے اجداد کے مذہب اور روایات کے تقدس کی بجائے ذاتی منفعت اور خود غرضی کا جذبہ مقدم تھا۔

ابو جہل تمام عمر ایک خواہش کی آگ میں جلتا رہا۔ یہ اُس کی زندگی کی واحد خواہش تھی

سر عام اُن کی تذلیل کی کوششیں، گالی گلوچ، طعنہ بازی، مذاق، پھبتیاں، اُن میں سے اکثر کا ذمہ دار ابو جہل تھا۔

جس مذموم حرکت میں وہ خود شریک نہیں ہوتا تھا، اُس کے چیلے چاننے اُس کی کمی پوری کر دیتے تھے۔ مخالف اور بھی تھے مگر کوئی اس حد تک گراہوا نہیں تھا۔ ویسے تو ابو لہب اور اُس کی بیوی بھی اسلام دشمنی اور عدوتِ محمدؐ میں حد سے گزرے ہوئے تھے مگر شدت کے باوجود ابو جہل کے مقابلے میں اُن کا دائرہ کار اتنا وسیع نہیں تھا۔ رہا ابو سفیان تو اُس نے دشمنانِ اسلام کی قیادت ابو جہل کے بعد سنبھالی مگر ابو سفیان میں عربوں کی بہت سی قبائلی رواداریاں بھی تھیں۔ شائستگی، تحمل اور مثبت سوچ کے انداز بھی تھے جو بعد میں اُس کی شخصیت کا سامان بنے۔

پہلی ہجرتِ حبشہ کے موقع پر ابو جہل ہی تھا جس نے قریش کے سرداروں سے ساز باز کر کے مہاجرین کو گرفتار یا قتل کرنے کے لئے گھڑ سواروں کا ایک دستہ بھجوا لیا تھا۔ یہی تھا جس نے عمرو بن العاص کو تحفے تحائف دے کر شاہِ حبشہ کے پاس بھیجا تھا تاکہ مسلمان مہاجرین حبشہ سے پابہ زنجیر مکہ لائے جاسکیں۔ جب اُس کا یہ حربہ ناکام ہوا تو اُس نے، جو ہاشم کے معاشرتی مقاطعے کا منصوبہ تیار کیا۔ بہت سے قریشی سردار اس انتہائی اقدام کے حق میں نہیں تھے مگر ابو جہل نے اپنے موقف کی اتنی مدد و روکالت کی کہ مخالفت کے باوجود یہ معاہدہ طے پا گیا۔ دو سال بعد جب اس مقاطعے کو ختم کرنے پر تقریباً سبھی رضامند تھے، ابو جہل نے اس کی حمایت کرتا رہا مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جب معاہدے کا مسودہ جو خانہ کعبہ میں رکھا تھا منگولیا گیا تو اسے دیکھ چاٹ چکی تھی۔ صرف پہلی سطر باقی تھی اور وہ تھی ”اے اللہ! تیرے نام پر“۔ رہے نام اللہ کا!

اُس وقت جب رسول اللہؐ خاندانِ نوفل کے سردارِ مطعم بن عدی کی سرپرستی میں

سوچنے لگا کہ اگر محمدؐ کی روحانی پیشوائی کو قبول عام حاصل ہو گیا تو اُس کی ساری عمر کی محنت اکارت جائے گی۔ عبد مناف کے اُمیدواروں کے مقابلے میں وہ زیادہ خرچ کر سکتا تھا، زیادہ دعوتیں کر سکتا تھا، لوگوں سے مل جل کر اپنے بارے میں اُن کی رائے ہموار کر سکتا تھا بلکہ وہ یہ سب کچھ کر بھی چکا تھا مگر پیغمبری کے مقابلے میں وہ بالکل بے بس تھا۔ اِس کا اُس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ چنانچہ اِس نے یہ تہیہ کر لیا کہ جان رہے یا جائے محمدؐ کے دین کو کامیاب نہیں ہونے دینا۔ ہمارے دین کی سچائی کے لئے اُس نے سردھڑ کی بازی لگادی تھی اور وہ ہمارے خلاف ہر ظلم، ہر سازش کی جڑ تھا۔ سارا دن مکے کے مختلف چھوٹے بڑے حلقوں میں اسلام کی برائیاں کرتا پھرتا تھا۔ عوام کو بھڑکاتا تھا، خواص کو آکساتا تھا اور رسول کریمؐ کی کردار کشی میں گھٹیا سے گھٹیا حرکت سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔

داعیٰ اسلام کی مخالفت اب اس کی زندگی کا واحد مقصد بن چکی تھی کیونکہ اسلام اُس کے مقصدِ اولین یعنی ولید کی جانشینی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا جا رہا تھا۔ وہ علی الاعلان کہنے لگا تھا کہ میں مکے کی اینٹ سے اینٹ جا دوں گا مگر محمدؐ کی تحریک کو آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ مکے کے بیشتر تاجر اور سردار اُس کے حلقہء اثر میں تھے اور جہاں کہیں وہ دیکھتا کہ کسی نے محمدؐ کی یا محمدؐ کے دین کی حمایت میں کچھ کیا ہے، یا کچھ کہا ہے یا کچھ کہنے کرنے کا ارادہ کر رہا ہے تو وہ اپنی پوری طاقت سے اُن اثرات کو کچلنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ کائنات کا پہلا شخص تھا جس نے کسی مسلمان کے خون سے ہاتھ رنگے۔

سُئیہ کے قتل سے لے کر جنگِ بدر تک، جہاں وہ لقمہء اجل بنا، مسلمانوں کے خلاف جو جو کچھ ہوا اُس میں ابو جہل کا ہاتھ تھا بلکہ جو کچھ ہوا اِس میں سے بیشتر اُسی کی وجہ سے ہوا، خاص طور پر حضور اکرمؐ کی ذات کے خلاف جتنی کریمہ حرکتیں ہوئیں۔ خانہ کعبہ کی حدود میں اُن پر بہتان تراشی، گلیوں میں اُن کی راہ میں کانٹے چھوٹانا، اُن پر کوڑا کرکٹ پھینکنا،

اگر کوئی کھاتا پیتا تاجر اسلام لے آتا تو ابو جہل فوراً سارے شہر کو اکٹھا کر کے اُس کے ساتھ لین دین بند کر دیتا، یہاں تک کہ وہ اقتصادی طور پر برباد ہو جاتا۔ اگر دائرہ اسلام میں داخل ہونے والا کوئی غریب، بے نوا ہو تا جسے کسی کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی یا وہ اُس کے اپنے خاندان محزومی کا کوئی کمزور فرد ہو تا تو ابو جہل اُس پر ایسے ایسے مظالم ڈھاتا کہ روح کانپ کانپ اٹھتی۔ خود توجو کرتا تھا، کرتا تھا، اپنے تعلقات کی بنا پر دوسرے سرداروں کو بھی اکساتا تھا کہ وہ بھی اپنے اپنے حلقہ اختیار میں یہی حکمت عملی اختیار کریں۔

مجھ ضعیف آدمی سے اگر کوئی کہے کہ ابو جہل کی شخصیت کا چار الفاظ میں احاطہ کرو تو میں کہوں گا۔ مخبر، سازش، خود غرضی اور شقاوت۔ اُس کی فکر میں شر تھا، اُس کی زبان میں زہر بھرا تھا، اس کے لہجے میں کیننگی تھی، اُس کے طنز سے آگ برستی تھی، بات کرتا تھا تو گلستا تھا تیزاب کے چھینٹے اڑ رہے ہیں۔

میری اپنی پرورش تو ایک غلام بچے کی طرح ہوئی تھی لیکن ان بوڑھی آنکھوں نے دنیا دیکھی ہے۔ اگر ہم ابو جہل کو، عربوں اور خصوصاً قریش مکہ کی روایات اور اقدار کی کسوٹی پر پڑھیں تب بھی اُس کی شخصیت میں بہت سے جھول ملیں گے۔

اشرف مکہ غیرت کے پتلے تھے، حمیت پر جان دیتے تھے مگر ابو جہل کی وجہ شہرت یہ نہیں تھی۔ ایک دن محمد خانہ کعبہ کا طواف کرنے گئے۔ ابو جہل اپنے حواریوں سمیت حطیم کے پاس بیٹھا تھا۔ محمد نے جبراً سود کو یوسہ دیا اور طواف کا پہلا چکر شروع کیا۔ جب وہ حطیم کے پاس سے گزرے تو ابو جہل نے اُن پر پھپھتی کسی جس پر اُس کے سارے حواری کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ رسالتماب کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے اُس کی ہرزہ سرائی سن لی ہے مگر وہ اپنے طواف میں مشغول رہے۔ دوسرے چکر میں جب وہ پھر حطیم کے پاس سے گزرے تو ابو جہل نے پہلے سے بھی زیادہ بد تمیزی کی۔ اس بار پہلے سے بھی زیادہ زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

مکے میں رہ رہے تھے، ابو جہل اندر ہی اندر سازشوں میں لگا ہوا تھا مگر بے بس تھا۔ اُس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ وہ خاندان نوفل سے مخالفت لیتا لیکن مطعم کے وفات پاتے ہی اُس نے نبی کریم کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ خاص طور پر قریش سرداروں کا اجتماع کیا جس میں ابو لہب جان بوجھ کر شریک نہیں ہوا تھا۔ اس منصوبے پر سب سردار راضی نہیں تھے لیکن ابو جہل نے جو دامے، درمے، قدمے، سخنے اسلام اور اہل اسلام کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا، ایک بار پھر سب کو رضامند کر لیا۔ یہ اور بات کہ اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔

یہ ابو جہل ہی تھا جس نے حضورؐ کی مکے سے ہجرت کے بعد اعلان کروایا تھا کہ جو محمدؐ کا سر لے کر آئے گا اُسے وہ ایک سوئرخ لونٹ یا ایک ہزار لویہ چاندی انعام دے گا۔ حضرت عمرؓ جو اس کے بھانجے تھے، اُسی کے بھڑکانے پر تلوار میاں سے نکال کر حضورؐ کو قتل کرنے نکلے تھے۔

جنگ بدر کے موقع پر بھی جب خاندان اسد کے حکیم بن جواہر نے جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے، عقبہ کو جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور عقبہ کچھ حد تک رضامند بھی ہو گیا تھا یہ ابو جہل ہی تھا جس نے سب کو از سر نو بھڑکایا تھا اور جنگ پر اصرار کیا تھا۔ عقبہ کو اُس نے بڑی کے طعنے دئے تھے۔ یہ بھی کہا تھا کہ عقبہ جنگ سے اس لئے بھاگنا چاہتا ہے کہ اُس کا بیٹا ابو حذیفہ مسلمانوں کی طرف سے صف آرہے۔ ابو جہل کو کیا خبر تھی کہ اس جنگ میں خود اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ جنگ کی شدہ دینے کے باوجود جہاں نبرد آزمائی کے لئے عقبہ، شیبہ اور ولید صفوں سے نکل کر باہر آئے، ابو جہل نے ایسی کسی شخصی شجاعت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

مردم آزادی اور ایذا رسانی کو ابو جہل نے ایک فن بنا رکھا تھا۔ اگر کوئی نو مسلم کسی طاقت ور قبیلے یا مقتدر خاندان کی پشت پناہی میں ہے تو وہ صرف اس پر اکتفا کرتا تھا کہ اُس کی توہین کرنے، اس پر آوازے کسے، اُسے بُرے نتائج کی دھمکیاں دے اور اُس کا مذاق اُڑائے۔

اس بار بھی نبی کریمؐ خاموشی سے گزر گئے اور اپنا طواف جاری رکھا لیکن جب سرورِ دو عالمؐ تیسرے چکر میں حطیم کے پاس سے گزرے اور ابو جہل نے ویسے ہی تضحیک آمیز الفاظ کہے تو رسول اللہؐ رک گئے اور ابو جہل کی ٹولی سے مخاطب ہو کے کہا:

”سنو قریش کے لوگو! میں اُس ذاتِ باری کے نام پر جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ تم کو کشت و خون کی وعید سناتا ہوں۔“

ان الفاظ نے اور جس لہجے میں وہ کہے گئے، ابو جہل اور اُس کے حواریوں کو سحر زدہ کر دیا۔ نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا اور نہ کسی کو یولنے کی جرأت ہوئی۔ یہ تو تھا غیرت اور حمیت کا معاملہ۔ رہی شجاعت تو اس کا مظاہرہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ حمزہؑ کی کمان کی ضرب کھا کر ابو جہل کس قدر خوف زدہ ہوا تھا اور جب حمزہؑ نے اُسے مقابلے کی دعوت دی تو اُس نے آنکھ تک اوپر نہیں اٹھائی۔ ابو جہل لڑتا کم، لڑواتا زیادہ تھا۔ وہ جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ اُس کی اصل طاقت اس کا سازشی ذہن تھا اور سازش اور شجاعت کا کبھی میل نہیں ہوتا۔ ابو جہل کے بارے میں، میں اور میرے جیسے زخم خوردہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اُس میں منافقت کے علاوہ ہر برائی موجود تھی۔

## مصیبت پر مصیبت

ویسے تو ہماری زندگی تھی ہی غموں سے عبارت لیکن ایک سال ہمارے لئے ایسا چڑھا تھا جو ہمارے لئے بڑی تکلیفیں لے کر آیا تھا۔ اذیتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ یہ عام الحزن کہلاتا ہے۔ غم و اندوہ کا سال۔ اس سال ہماری پریشانیوں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ ہمارا دین تک اُس کی زد میں آ گیا تھا۔ ہم آسمانوں کی طرف نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھتے تھے اور پوچھتے تھے یا اللہ ہمیں کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ نبوت کے چھ سال میں ہماری تعداد بڑھتے بڑھتے سو تک پہنچ گئی تھی۔ دنیا کی آبادی میں ایک سو کی کیا حیثیت ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی تھا جب ہم صرف دس تھے۔ آج دمشق میں میرے عہدِ ضعیفی کی سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ میں اپنے برآمدے میں بیٹھا، اپنی چھڑی کی مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے باہر سڑک پر مسلمانوں کے آتے جاتے ہجوم دیکھتا رہتا ہوں، تیس سال پہلے ہماری تعداد اتنی تھی کہ ہم ایک چراغ کے گرد جمع ہو سکتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ہر ایک کو دس دس لاکھ

سے ضرب دے دی ہے۔ میں رب العزت کا شکر گزار ہوں کہ ابھی تک اُس کی زمین پر چل پھر رہا ہوں لیکن عام الخزن میں کئی بار میرا جی چاہا کہ میں اس زمین میں دفن ہو جاؤں۔

پہلے اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔ پچیس سال تک وہ رسول اللہ کی رفیقہ حیات رہیں اور اُن کی مشیر، اُن کے بچوں کی ماں، علیؓ اور زیدؓ سمیت، اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ایک وقت وہ تھاجب اول المسلمون یعنی رسول اللہ کے علاوہ دنیا میں صرف ایک مسلمان تھا اور وہ حضرت خدیجہؓ تھیں۔ اولیں نزولِ وحی کی رات جب رسول کریمؐ انتہائی کرب و تذبذب کے عالم میں تھے، حضرت خدیجہؓ ہی تھیں جنہوں نے اُنہیں دلاسا دیا تھا۔ بعثت سے پہلے انہوں نے اپنی ساری دولت حضور کے قدموں میں ڈال دی تھی کہ وہ اُسے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ خود اپنی ذات میں وہ اُمّ المؤمنین تھیں۔

حضرت خدیجہؓ اچانک بیمار پڑیں اور اسی دن انتقال کر گئیں۔ رات سے پہلے پہلے انہیں دفن بھی کر دیا گیا۔ عالم اسلام سے اسلام کی اولین شہادت ایک دن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس کے بعد ابو طالب کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی ساری زندگی کا احاطہ کیا جائے تو دو لفظ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ محبت اور ناکامی۔ انہیں نبی اکرمؐ سے بے حد پیار تھا لیکن پھر بھی اُن کی وفات حالتِ ایمان میں نہیں ہوئی۔ وہ اپنے مُردہ اجداد کے مُردہ مذہب کا طوق کبھی گلے سے اتار کر نہ پھینک سکے۔ اُن کی تربیت ہی ایسی پختہ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ رسول اللہ کا بہت بڑا سہارا تھے۔ میں سمجھتا ہوں ربِ حکیم نے خود انہیں اس حالت میں رکھنا مناسب سمجھا تاکہ وہ ظلمت کے پردے میں رہ کر نور کی بہتر خدمت انجام دے سکیں۔ اگر ابو طالب ہم میں شامل ہو جاتے تو کفار انہیں بھی ہمارے زمرے میں شمار کر لیتے اور اُن کے کسی مشورے کو قابلِ اعتنا نہ سمجھتے۔ اُن کی نظروں میں شاید اُن کی غیر جانب دار حیثیت ختم ہو

جاتی اور وہ اسلام اور مسلمانوں کی کسی اعانت کے قابل نہ رہتے۔ اُن میں سے ایک ہونے کی حیثیت سے وہ ہمارے لئے دو کے برابر تھے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں الحاد کی باتیں کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے!

ابو طالب کی شدید علالت کی خبر ملی تو قریش کے سردار عیادت کے لئے پہنچے۔ ابو جہل، عقبہ، اُس کا بھائی شیبہ، ابو سفیان وغیرہ انہوں نے ستر مرگ پر لیئے ابو طالب سے کہا:

”ابو طالب تمہیں معلوم ہے ہم تمہارا کتنا احترام کرتے ہیں۔ تمہاری علالت کی وجہ سے ہم سب بہت فکر مند ہیں۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے بچھڑے ہمارے مراسم کیسے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم اُسے بلاؤ۔ ایک تحفہ تم ہم سے لو اُس کے لئے اور ایک تحفہ اُس سے لے کر ہمیں دو تاکہ وہ اپنی جگہ خوش رہے، ہم اپنی جگہ خوش۔“

ابو طالب نے کسی کو کہا کہ وہ محمدؐ کو بلا لائے۔ جو ساتھ ہی کے کمرے میں تھے وہ آگے اور بچا کے پلنگ کے ساتھ کھڑے ہو گئے، یوں کہ پلنگ کے اک طرف وہ تھے اور دوسری طرف اُن کے سامنے سردار ان قریش۔

ابو طالب نے نہایت نقاہت بھری آواز میں کہا:

”قریش کے سردار تمہیں کچھ دینے اور تم سے کچھ لینے آئے ہیں۔“

رسول کریمؐ نے کہا:

”ضرور۔ یہ لوگ صرف ایک لفظ کہہ دیں جس کے بعد عرب و عجم دونوں ان کے

زیرِ نگیں ہوں گے۔“

ابو جہل بولا:

”یہ بات ہے تو ہم دس لفظ کہہ دیتے ہیں۔ بتاؤ کیا کہنا ہے۔“



جہنمی ہونے کی وعید سن لی تھی۔ سورہ لہب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے

اور وہ برباد ہو گیا۔

نہ اُس کا مال اُس کے کام آیا، نہ اُس کی کمائی۔

وہ ایک شعلہ زن آگ میں پڑے گا،

وہ بھی اور اُس کی بیوی بھی،

لکڑیاں لاد کر لانے والی۔

اُس کی گردن میں رستی پڑی ہوگی،

خوب بٹھی ہوئی۔

ابو لہب کی بیوی اُمّ جمیل بھی اسی کی طرح بد تھی۔ مجھے یاد ہے میں چہ تھا اور اُمّ جمیل چھتری لے کر غلاموں کی سزائیں دیکھنے آیا کرتی تھی۔ یہ وہ ہولناک مناظر تھے جن کو دیکھنے کا حوصلہ مردوں میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اُس سے خوف آتا تھا۔ بعد میں وہ خاردار جھاڑیوں کی گٹھریاں باندھ باندھ کر حضورؐ کے گھر کے سامنے جلایا کرتی تھی۔ اسلام دشمنی کی قدر مشترک ہی کی مناسبت سے باری تعالیٰ نے میاں بیوی کو جہنم میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رکھا۔

مجھے اُن پر افسوس ہے۔ اُن بد نصیبوں کی واحد فضیلت یہ تھی کہ انہوں نے رسول اللہؐ کا زمانہ دیکھا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ ابو لہب اپنے بارے میں قرآن کریم کے واضح ارشاد کے بعد اگر چاہتا تو اس صحیفہ آسمانی کو باطل ثابت کرنے کے لئے منافقت ہی میں اسلام لے آتا۔ وہ اس آیت کے بعد کئی سال زندہ رہا مگر اس سارے عرصے میں اُسے ایک لمبے کے لئے بھی یہ نکتہ نہ سوچا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کر لیتا تو اس سے قرآن حکیم کی آیات مقدسہ کی بدرجہ اتم نفی ہو جاتی اور

حضورؐ نے فرمایا:

”صرف اتنا کہ اللہ ایک ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں۔“

ابو سفیان نے کہا:

”محمد عقل سے کام لو۔ اتنے سارے خداؤں کا ایک خدا بناتے رہتے ہو۔“

اللہ کے رسولؐ کے لئے مُت پرستی سے مصالحت ممکن نہ تھی۔ کم و بیش یہی صورت حال مخالفین اسلام کی تھی۔ وہ بھی اپنے خداؤں کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔ محمدؐ نے جیسے ہی دوبارہ بات شروع کی، سب نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور بڑبڑاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اسی شور شرابے میں ابو طالب نے دم دے دیا اور وہ اپنے دل پر اس آخری کوشش کی ناکامی کا داغ لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابو طالب کی وفات کے بعد حضورؐ کا نہایت کمینہ دشمن ابو لہب خاندان بنو ہاشم کا سردار بن گیا۔ اہل مکہ کی اسلام دشمنی میں مزید شدت آگئی۔ سردار بنو ہاشم کی حیثیت سے اُس نے رسول اللہؐ کی پشت پناہی تو برقرار رکھی لیکن محض برائے نام۔ وہ سارا دن مکے میں دندناتا پھرتا تھا۔ صبح و شام، موقع بے موقع لات، منات اور عزیٰ کی تعریفیں کرتے اُس کا منہ نہیں تھکتا تھا۔ اُس کی اسلام دشمنی میں ذرا بھی کمی آتی تو ابو جہل اُسے اکساتا اور نفرت کے بخار کو کم نہ ہونے دیتا۔

بدبخت ابو لہب! لات و منات کی عبادت اُس کے کسی کام نہ آئی اور بالآخر وہ اپنے ہی غصے کی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا۔ موت کے وقت وہ ایسی بیماری میں مبتلا تھا جس سے اُس کا چہرہ پھول کر پہلے سے بھی زیادہ سُرخ ہو گیا تھا اور آج اُس کی روح جہنم کی آگ میں سب کے لئے عبرت کا سامان بنی ہوئی ہے۔ اُس نے اپنی زندگی ہی میں اللہ کی طرف سے اپنے

اس سے بڑی اس کی خواہش کیا ہو سکتی تھی۔ مگر اس کو جو اسلام دشمنی میں سب کچھ کر گزرنے پر  
میل کر رہا تھا یہ تو فیق نہ ہوئی اور قرآن حکیم کی ازلی سچائی قائم و دائم رہی۔

## ابو بکرؓ کی آزمائش

کئی میں زندگی گزارنا اب پہلے سے بہت زیادہ مشکل ہو گیا تھا اور ان کے لئے تو  
تقریباً ناممکن جن کا کوئی ولی وارث نہیں تھا۔ محمدؐ خود جن سختیوں سے دوچار ہو رہے تھے اس  
سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ ہر روز ان کو ایذا پہنچانے کے لئے نئے ستم ایجاد کئے جاتے۔ ایک  
دن ایک رلو گیر نے ان کے گھر کے دروازے سے ہاتھ بڑھا کر ان کے کھانا پکانے کے برتن میں  
نمایت بدبو دار، سڑے ہوئے گوشت کا لو تھڑا پھینک دیا۔ ایک دن وہ اپنے گھر میں عبادت کر  
رہے تھے کہ عبد شمس کے غنیم نے جو عثمان بن عفان کا سوتیلا باپ تھا، خون لور غلاظت سے آلودہ  
بھید کی لوجھڑی بن پر پھینک دی۔ وہ اسی حالت میں اس غلیظ لوجھڑی کو ایک چھڑی کے سرے پر  
لٹکا کر باہر لائے اور اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر زور زور سے چارا:

”اے عبد مناف کے بیٹو دیکھو، کیا اسی کو پشت پناہی کہتے ہیں؟“

ایک دن وہ کعبے سے گھر آ رہے تھے کہ کسی شخص نے زمین سے خاک اٹھا کر ان کے

سردار تھا۔ اور ابو بکرؓ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس نے کئے میں اُن کی بڑی شان، شوکت دیکھی تھی۔ انہیں اس طرح حال سے بے حال دیکھ کر اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس کے متعدد سوالوں کے جواب میں ابو بکرؓ نے صرف یہی کہا کہ مجھ پر میرے شر والوں نے بہت ستم ڈھائے ہیں اور میں مجبور ہو کر کئے سے نکل آیا ہوں۔ اب میری یہی تمنا ہے کہ میں زندگی کے باقی دن کہیں یادِ الہی میں گزار دوں۔

ان اللہ غنۃ نے حیران ہو کر پوچھا:

”ایسا کیسے ہو گیا ان ابو قحافہ! تم تو اپنے قبیلے کے سر کا تاج ہو۔ راست باز، بے بسوں کے مددگار، غریبوں، مسکینوں کے غم گسار۔ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ تم واپس کئے چلو۔ میرے ساتھ، میری پشت پناہی میں۔“

کئے والوں کو اس بدوی سردار کا بڑا لحاظ تھا۔ انہوں نے اُس کی پشت پناہی کو تسلیم تو کر لیا لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی رکھ دی۔ وہ یہ کہ ابو بکرؓ اپنا اسلام اور اپنی عبادتیں اپنے گھر ہی میں رکھیں۔ شہر کے چوٹ چوٹیوں کو گمراہ نہ کریں۔ ان اللہ غنۃ نے بھی اسی بات پر زور دیا تو ابو بکرؓ نے اُس کی پناہ واپس کر دی۔

چہرے پر پھینک دی۔ منہ، سر، آنکھیں سب مٹی میں اٹ گئیں۔ وہ اُس ناخوار کو دیکھ بھی نہ پائے۔ کئی بار گلیوں میں اُن پر اُوپر کی منزلوں سے کوڑا پھینکا گیا۔ میرے محسن ابو بکرؓ کا حال بھی حد درجہ ناگفتنی تھا۔ اسلام لانے سے پہلے وہ کئے کی ایک نہایت بااثر اور بارسوخ شخصیت تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حمزہؓ اور عمرؓ کی طرح لوگ اُن سے خائف نہیں تھے لیکن اُن کے روحانی مرتبے اور خوش اخلاقی کی وجہ سے سارے شہر میں اُن کا بڑا احترام تھا۔ اسلام لانے کی دیر تھی کہ شہر کا شہر اُن کا دشمن ہو گیا۔ اور لوگ بھی مسلمان ہوئے تھے اور وہ سب دشمن ہی شمار کئے جاتے تھے لیکن ابو بکرؓ سے انہیں زیادہ کد اس لئے تھی کہ وہ نہ صرف خود مسلمان ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے بقول قریش اور بھی بہت سے لوگوں کو درغلابا تھا۔ اسود بن نوفلؓ کے اسلام لے آنے کے بعد تو ابو بکرؓ کے خلاف نفرت کی شدت بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک دن خود نوفلؓ نے جو خدیجہؓ کے سوتیلے بھائی تھے۔ ابو بکرؓ اور طلحہؓ پر حملہ کروادیا۔ کچھ لوگوں نے ان دونوں کو پکڑا اور سر سے پیر تک رسیوں سے جکڑ کر بازار میں پھنکوادیا۔ یہ سب کچھ سب کے سامنے سر بازار ہوتا رہا مگر ابو بکرؓ کے اپنے قبیلے یم کے کسی فرد نے اسد قبیلے والوں سے مزاحمت نہیں کی اور کھڑے کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے بھی اپنے قبیلے کے ان دو سربر آوردہ لوگوں کو اسلام لانے کی بنا پر اپنی حمایت سے خارج کر دیا تھا۔

ایسے اور بھی کئی حادثے ہوئے۔ میرا سابقہ آقا میہ تو ابو بکرؓ پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ بنو نَجْم کے محلے میں ابو بکرؓ کا گھر اُس کے گھر کے پاس ہی تھا۔ آئے دن آتے جاتے کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا تھا۔ آخر ایک دن ابو بکرؓ نے بھی حضورؐ کی اجازت سے حبشہ ہجرت کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ابو بکرؓ حیرۃ الاحمر کے سفر کے لئے کئے سے روانہ ہوئے تو راستے میں اُن کی ملاقات ان اللہ غنۃ سے ہوئی جو کئے سے تھوڑی دُور صحرا میں چند چھوٹے چھوٹے قبیلوں کا مشترکہ

## سب سے بُرا دن

رسول کریم کی تبلیغ پر پابندی لگادی گئی تھی۔ انہیں کسی اجتماع سے خطاب کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ مشرکین مکہ کے سرداروں کا فیصلہ تھا۔ اس صورت حال میں وہ خود بھی مکے سے ہجرت کر کے کسی اور شہر جا بنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ کوئی ایسا شہر جہاں کے لوگوں کے دل اتنے سخت نہ ہوں، نفرتیں اتنی گہری نہ ہوں۔ ٹھکے میں اتنی شدت نہ ہو۔ وہ جو خالق کائنات کے اتنے پیارے تھے، مکے کے گلی کوچوں میں ایک پل کے لئے بھی محفوظ نہیں تھے۔ وہ اکثر سوچا کرتے تھے کہ وہ طائف چلے جائیں، مکے سے جنوب میں ایک سرسبز، ہڈ فضا شہر جو ایک پہاڑی پر آباد تھا۔ صحرا کی جھلسا دینے والی حدت سے دور، پھلوں، باغوں، شہد کی مکھیوں اور تیلیوں کا شہر۔ اس شہر میں لات کی پرستش ہوتی تھی۔

آخر ایک دن انہوں نے طائف کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔ طائف مکے سے ستر میل دور تھا اور حضورؐ، زید کو ساتھ لے کر پایادہ وہاں کے لئے روانہ ہو گئے۔ مکے کا یہ تاجر

کے تین بیٹے طائف کے سب سے بااثر سردار تھے۔ وہ اُن کے یہاں پہنچے تو دربار سا لگا ہوا تھا۔ تینوں بھائی گدوں پر بیٹھے تھے۔ سامنے انواع و اقسام کی اشیائے خوردنی رکھی تھیں۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ انہوں نے رسالت مآبؐ کو نہایت حقارت سے دیکھا، اس انداز سے گویا کوئی کھیل ہاتھ آگیا ہے اور اب تفریح کر رہے گی۔

محمدؐ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو ایک بھائی بولا:

”اگر اللہ نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو میں کعبے کے تعلقات نوچ کر پھینک دوں گا“

دوسرا کہنے لگا:

”اللہ کو تم سے بہتر کوئی نہیں ملا تھا؟“

تیسرے بھائی نے توبت ہی ختم کر دی:

”اگر تم اللہ کے رسول ہو تو ہمارا منصب نہیں ہے کہ ہم تم جیسے فرشتوں سے بات کر سکیں اور اگر تم رسول نہیں ہو تو تم جھوٹے اور فریبی ہو۔ اُس صورت میں بھی ہمیں تم سے بات نہیں کرنا چاہئے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کنکر پتھر جو ہاتھ میں آیا اٹھا اٹھا کر رسول اللہؐ پر پھینکنے لگے۔ اُن کے چواری بھی اس شغل میں اُن کے شریک تھے۔ محلے کے بچے بھی شامل ہو گئے۔ چیختے چلاتے، طوفان برپا کرتے تھے جنہیں کچھ ہوش نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، بہت بڑی تفریح سمجھ کر اُن پر پتھروں کے وار پر وار کئے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ زخموں سے نڈھال، وہاں سے جان چھاکر نکلے اور صحرا کی راہ لی۔ اُس دن کے بارے میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وہ اُن کی زندگی کا بدترین دن تھا۔

جو ایک زمانے میں کئی تیز رفتار اونٹوں کا مالک تھا، آج اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اتنا مفلس ہو گیا تھا کہ اُس کے پاس سفر کے لئے کوئی سواری نہیں تھی۔ اُس کرتے پر جو اُس نے پہن رکھا تھا، جگہ جگہ پوند لگے ہوئے تھے، ایک رومال تھا جو چہرے کو، اُڑاڑ کر پڑنے والی گرم ریت سے چھانے کے کام آتا تھا۔ اس لباس میں وہ اتنے حسین لگ رہے تھے کہ میں نے کسی کو، کسی لباس میں اُن سے خوب صورت نہیں پایا۔ یہ پھٹے پرانے کپڑے اُن کے بدن پر زرتار پوشاک کی طرح سجے ہوئے تھے۔

جب وہ اس بے سروسامانی میں رخصت ہو گئے تو ہم نے سوچا کہ اُن کا اس طرح جانا مناسب نہیں ہے۔ اُن کے ساتھ کچھ اور لوگ ہونے چاہئیں۔ چنانچہ ہم اُن کے پیچھے پیچھے گئے اور تھوڑی دیر میں انہیں جا لیا۔ انہوں نے ہمیں دیکھا تو واپس بھاگ دیا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھتے تھے۔ سفر کے لئے صحرائے عرب کی روایتی ناسازگاری اور ناموافقت، دھوپ کی جھلسا دینے والی تپش، بادِ سموُم راستے کے کئی ناگمانی خطرات۔ کبھی راستے میں کنویں بھی سوکھے ملتے تھے اور پھر سب سے زیادہ دشمنوں کا خوف۔ ہزار باتیں تھیں جن کا رہ کر خیال آتا تھا۔

ہمارے خدشات درست ثابت ہوئے۔ دو ہفتے بعد جب وہ واپس آئے تو پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ کمزور، نحیف، سارے بدن پر رستے ہوئے زخم۔ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہے تھے۔ آتے ہی ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگا۔ پانی پی کر خاموشی سے اندر چلے گئے اور جا کر بستر پر لیٹ گئے۔ نہ انہوں نے کچھ کہنا مناسب سمجھا، نہ ہمیں ہی کسی سوال کی جرات ہوئی۔ زیدؓ نے ہمیں تمام ماجرا سنا لیا۔

وہ خیر و عافیت سے طائف پہنچ گئے تھے۔ راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ وہاں پہنچ کر وہ سیدھے عمرو بن أمیہ کے بیٹوں سے ملاقات کے لئے اُن کے گھر گئے۔ عمرو

## عقبہ کی گھاٹی میں

ایک رات جب چاندنی چٹکی ہوئی تھی، ہم لوگ عقبہ کی ایک گھاٹی میں بیٹھے تھے۔ رسول کریمؐ بھی تشریف فرما تھے۔ یہ جگہ ہماری خفیہ آماجگاہ تھی جہاں ہم اپنے دشمنوں کی نظروں سے دور آپس کے مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ مگر اُس رات وہاں ہمارے کچھ مہمان بھی تھے۔ یہ بارہ آدمیوں کا ایک وفد تھا جو مدینے سے آیا تھا۔ مدینے کا نام اُن دنوں یثرب تھا۔ میں نے ان میں سے کسی کو بھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اُن کے آنے کوئی اطلاع نہیں تھی لیکن اُن کے آنے کی ایک خاص وجہ تھی۔ وہ اللہ کے رسولؐ کو مدینے میں قیام کی دعوت دینے آئے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ حضورؐ اُن کے شہر میں رہنے بنے لگیں اور اہل یثرب کے درمیان، جو مستقل طور پر باہمی عناد اور نزاع کا شکار رہتے تھے، مصالحت کرادیں۔ یثرب میں دو قبیلے آباد تھے اوس اور خزرج۔ ہر اوس کے دل میں خزرج کا لگایا ہوا کوئی نہ کوئی زخم تھا اور ہر خزرج کے دل میں کوئی نہ کوئی صدمہ تھا جو اُسے اوس سے

اُس دن اُن پر صرف ایک کرم ہوا۔ جب وہ شہر سے باہر صحرا کی طرف جا رہے تھے تو تفصیل شہر سے باہر ایک باغ میں عداس نامی ایک عیسائی غلام کام کر رہا تھا۔ اُس نے اُن کی یہ حالت دیکھی تو انگوروں کا ایک خوشہ انہیں لا کر دیا۔ کیا خوش نصیب انسان تھا عداس جس نے انگوروں کے ایک خوشے کے عوض جنت کا سودا کر لیا۔ زندگی کتنا بڑا اجڑا ہے اور حادثات کسی کسی کے لئے کتنے خوش آئند ہو سکتے ہیں۔ سوچا جائے تو جنت کا راستہ طویل بھی ہے، مختصر بھی۔ مجھے پتہ نہیں عداس کا راستہ کون سا ہے لیکن میرے دل میں اُس کے لئے بڑا پیار ہے۔

کے سامنے آئے تو بہت موٹے اور کھر درے کپڑے کا لباس پہنا ہوا تھا، اُس پر بھی بے شمار پوند لگے تھے۔ حضورؐ نے جو ہمیشہ اُن سے بہت شفقت فرمایا کرتے تھے، اُن کی طرف دیکھا اور اپنے آنسو پیتے ہوئے نہایت دلاویز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا:

”مصعب تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے کپڑے پہننے لگے ہو!“

یہ کہہ کر آنسو پونچھتے ہوئے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

حضورؐ نے مصعبؓ کے ساتھ ابن امّ کلثومؓ کو بھی مدینے روانہ کیا۔

اُس ایک سال میں ہم نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ وہ گھٹن تھی کہ اللہ کی پناہ اور سال تھا کہ ختم ہی ہونے پر نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی تو ہم سوچتے تھے کہ مدینے سے ہمیں کوئی دعوت آئی بھی تھی یا محض ایک خواب تھا۔ ہماری حالت قابلِ رحم تھی۔ بولسب کا اب بھی یہ خیال تھا کہ اپنے خداؤں کی عظمت منوانے کے لئے اُس کا کوڑا کافی ہے۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں میں محصور تھے۔ اللہ اللہ کر کے ایک سال پورا ہوا مگر ہمیں یوں لگا جیسے ایک نہیں پانچ سال گزر گئے ہوں۔

مدینے والے واپس آئے۔ ٹھیک ایک سال کے بعد۔ ایک دن، ایک گھنٹہ بھی آگے پیچھے نہیں، ایک تہائی رات گزر جانے کے بعد، وہیں عقبہ کے خفیہ مقام پر جہاد گزشتہ سال آئے تھے مگر اس بار وہ بارہ نہیں پھرتے تھے۔ مصعبؓ بھی اُن کے ساتھ تھے۔ اربعین معرورہ اُن کی قیادت کر رہے تھے۔

یہ سن نبوت کا تیرھواں سال تھا۔

ہم سارے ڈرے سب سے لوگ تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ ہمارے لئے کوئی جہاد چھایا گیا ہے۔ آخر اتنے بہت سارے لوگ کیوں آئے ہیں۔ دن رات خوف میں زندگی گزارتے گزارتے میں ہوا سے بھی ڈرنے لگا تھا۔ اتنے میں زیوروں کی جھکاک میرے کانوں

پہنچا تھا۔ انہوں نے بیخوشی میں کسی سے سنا تھا کہ مکہ میں ایک پیغمبر ہے جو اخوت کا سبق دیتا ہے۔ اسی شہرت کی بنا پر وہ رسالت مآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اس امید پر کہ شاید اُن کی توجہ سے یہ فساد ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور اہل مدینہ چین سے زندگی گزارنے لگیں۔ انہیں اس تعلق کا بھی علم تھا کہ محمدؐ کے والد اور والدہ دونوں مدینے میں دفن ہیں۔

رسول اللہؐ نے اُن کی گفتگو نہایت اطمینان سے سنی۔ وہ لوگ اُن کو اُس چیز کی پیش کش کرنے آئے تھے جس کی تلاش میں انہوں نے طائف کا انتہائی اذیت ناک سفر گوارا فرمایا تھا، یعنی مکہ کے علاوہ کوئی اور شہر جہاں وہ سکونت اختیار کر سکیں اور بلا خوف و خطر اپنے دین کی تبلیغ کر سکیں لیکن یہ اُن کے شایانِ شان نہیں تھا کہ وہ فوراً ہی حامی بھر لیتے گویا وہ اس انتظار ہی میں تھے کہ کہیں سے کوئی پیش کش ہو اور وہ فوراً اُسے قبول کر لیں۔ انہیں ہزار باتیں سوچنا تھیں۔ انہوں نے مدینے والوں سے کہا اس سے بیشتر کہ میں ہاں کہوں، آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ میرے موقف کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ حتیٰ فیصلہ آپ سوچ چار کے بعد کیجئے گا۔ فی الحال آپ میرے ایک نمائندے کو ایک سال کے لئے اپنے ساتھ لے جائیے۔ یہ آپ کو دین اسلام سے آگاہ کرے گا۔ ایک سال بعد بھی اگر آپ کا خیال یہی ہو کہ میں آپ کے شہر میں آباد ہوں تو مجھے آکر بتا دیجئے گا۔

اُن کے ساتھ روانہ کرنے کے لئے اللہ کے رسولؐ نے مصعب بن عمیرؓ کا انتخاب کیا جو عبدالدار کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جسے کلید بردار کعبہ ہونے کا شرف حاصل تھا۔ مصعبؓ کا ایک ذاتی شرف یہ بھی تھا کہ وہ ہم مثل رسولؐ تھے۔ اتنی مشابہت تھی کہ جب وہ اُحد میں شہید ہو کر گرے تو شور مچ گیا کہ نبی اکرمؐ شہید ہو گئے ہیں۔ مصعبؓ نہایت جامہ زیب تھے۔ مکہ میں وہ سب سے زیادہ خوش پوش تسلیم کئے جاتے تھے مگر یہ ان کے دائرہ اسلام میں آنے سے پہلے کی بات ہے۔ بعد میں ایک دن مدینہ میں جب وہ رسالت مآبؐ

میں پڑی۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو اُن کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ اس سے ذرا حوصلہ ہوا۔ عورتوں کی موجودگی میں عام طور پر لوگ جھگڑا فساد نہیں کرتے۔

مدینے سے آئے ہوئے وفد نے وہی پیش کش دہرائی کہ وہ اُن کے شہر میں آکر رہیں اور اُن کے باہمی تنازعے چکائیں۔ ایک لمحے کے لئے محفل پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ہر فرد کی نگاہیں رسالت مآب کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ اس ایک لمحے کے توقف کے بعد حضور نے اپنے سر کی ہلکی سی جنبش سے اُن کی درخواست منظور کر لی۔ اُس وقت ہم وہ نہیں جانتے تھے جو ہم نے بعد میں جانا۔ اُس ایک لمحے نے جس میں آنحضرت نے اُن کی پیش کش پر غور فرمایا، دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ یہ ایک لمحہ صدیوں پر محیط تھا۔ اقوامِ عالم کا مستقبل، انسان کی دینی و دنیوی نشوونما، عالمِ انسانیت کا فکری ارتقا، تہذیب و تمدن کے آفاقی معیار کا فروغ، کیا کچھ اپنے اندر لئے ہوئے تھا وہ ایک لمحہ جو بظاہر آنحضرت کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

سرورِ کائنات نے اُن سے ایک وعدہ لیا جسے تاریخ میں بیعتِ عقبہ ثانی کہتے ہیں۔ یہ نام اتنا بھاری بھر کم ہے کہ لگتا ہے اس معاہدے میں فریقین نے بڑی کڑی کڑی شرطیں رکھی ہوں گی جو بہت مشکل سے طے پائی ہوں گی۔ شاید کچھ خون خرابہ بھی ہوا ہو۔ جو میرے سامنے ہوا، اس کی نوعیت تو ایک درخواست کی سی تھی جو رسولِ کریم نے نہایت حلم سے اہلِ مدینہ کے سامنے پیش کی تھی۔ اُنہوں نے فرمایا:

”آپ لوگ وعدہ کریں کہ صرف اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کریں گے، خواتین کے ساتھ نیک سلوک کریں گے، اپنی بیٹیوں کو قتل نہیں کریں گے، جھوٹ نہیں بولیں گے، چوری نہیں کریں گے، اللہ کے قوانین پر کاربند رہیں گے لوزان لوگوں کو تحفظ دیں گے جو اللہ

کے رسول کے ساتھ مدینے جائیں گے۔“

آپ نے انہیں یہ بھی فرمایا کہ اُن کے مدینے جا کر رہنے کا یہ مطلب نہیں ہو گا کہ وہ صرف مدینے والوں کے لئے وقف ہو گئے۔ وہ ہر قوم، ہر نسل، ہر رنگ کے لوگوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

اتنے انکسار سے ادا کئے گئے اتنے دو ٹوک الفاظ میں نے کبھی نہیں سنے۔ دوسرے لفظوں میں وہ فرما رہے تھے کہ اپنے خداؤں کو آگ لگا دو، اُن کا وجود ختم کر دو، نبی کے لئے اگر جنگ بھی کرنا پڑے تو کرو۔ مصعب انہیں بتا چکے تھے کہ قوانینِ الہی کیا ہیں۔ دوسروں کو اپنے مال و دولت میں شریک کرنا، یہاں تک کہ ایک کھجور میں سے بھی دوسرے کو حصہ دینا۔

مدینے والوں نے سوال کیا:

”اس کے عوض ہمیں کیا ملے گا؟“

آپ نے ایک لفظ میں اس کا جواب دیا:

”جنت“

براء بن معرور نے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا:

”یا رسول اللہ! خدائے واحد کی قسم، ہم جان و مال سے آپ

کی حفاظت کریں گے، ہم نے تلواروں کی چھاؤں میں پرورش پائی ہے

اور جنگ آزمائی ہمیں ورثے میں ملی ہے۔“

اُن کی بات ابھی جاری تھی کہ ابوالبیہثم بن السہیان نے کہا:

”رسول اللہ! کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ آپ قوت اور اقتدار

پر ہمیں چھوڑ دیں اور واپس اپنے قبیلے میں چلے جائیں؟“

حضور نے مسکرا کر جواب دیا:



”میرا خون، تمہارا خون۔ تمہاری ذمے داری، میری ذمے

داری۔ تمہارا دشمن، میرا دشمن، تمہارا دوست، میرا دوست، میں

تمہارا، تم میرے۔“

یہ سن کر سب سے پہلے کعب بن مالکؓ، ابوالمیثمؓ اور سعد بن زہراءؓ نے بیعت کی۔ پھر آپ نے ہر شخص کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا اور خواتین کی بیعت سر کے اشارے سے قبول کی۔

اس وفد میں کئی نوجوان بھی تھے۔ معاذ بن عمروؓ، شہید اجد عمرو بن جوحؓ کے بیٹے

اور ایک اور نوجوان اُن کا نام بھی معاذؓ تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر۔ کیا جیلا نوجوان تھا۔ مجھے

اُس کا وہ چہرہ آج تک یاد ہے۔ روشن سیاہ آنکھیں، سرخ و سپید رنگ، چہرہ ایسا شگفتہ جیسے کوئی

پھول کھلا ہو۔ دانت اتنے چمکدار کہ نور کی شعاعیں پھوٹی تھیں۔ یہ معاذ بن جبلؓ تھے جن

سے بعد میں ہماری بڑی بڑی صحبتیں رہیں۔ وہ اسلام کے اتنے جید عالم بنے کہ امام القسما اور

امام العلماء کہلائے۔ نبی کریمؐ نے ایک بار فرمایا تھا کہ معاذؓ قیامت کے دن علماء کے امام

ہوں گے۔ اسی مناسبت سے انہیں امام العلماء کا لقب ملا۔ عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت

میں ایک بار کہا تھا کہ اگر معاذؓ نہ ہوں تو عمر ہلاک ہو جائے۔

سفر شام میں جلیبہ کے مقام پر جہاں میں بھی موجود تھا، عمر فاروقؓ نے خطبہ

ذیے ہوئے کہا تھا:

”جسے فہد سیکھتا ہو وہ معاذؓ کے پاس جائے۔“

یہ تھی بیعتِ عقبہ ثانی جو عقبہ کے مقام پر پہاڑیوں کے درمیان، دریا کی ایک سوکھی

گودی میں لی گئی۔ لیکن مجھ سا نوجوان غلام کا خیال ہے کہ ہم اُس رات عقبہ کی کسی گھاٹی میں نہیں بلکہ

رب ذوالجلال والا کرام کی رحمتوں کے جوڑ میں بیٹھے تھے۔ عقبہ کی اس بیعت کے بعد ہماری دنیا ہی

بدل گئی۔ اب ہم ایک ٹولہ، ایک گروہ، ایک جماعت نہیں بلکہ ایک قوم، ایک ملت تھے۔

## سُوئے مدینہ

میں اُمیہ کا یہ کام سا نوجوان غلام اب انسانوں کا ایک ذمے دار قائد تھا۔ میں جب یہ سوچتا ہوں تو دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں۔ اللہ مجھے کبھی تکبر نہ دے!

کئے سے ہجرت کا معاملہ تھا اُس وقت جب ہر شخص ہمارے خون کا پیاسا دکھائی دیتا

تھا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے والی بات تھی۔ ایک مہم کے لئے مجھے قائد چنا گیا تھا۔ چھپ

چھپا کر کئے سے نکلتا تھا اور چھپتے چھپاتے مدینہ پہنچتا تھا۔ اس ذمے داری کے لئے ایک سا نوجوان

غلام سے بہتر قائد اور کون ہو سکتا تھا کیونکہ غلام کے تو خون ہی میں فرار کی خواہش شامل

ہوتی ہے۔ ایسی مہم کی کامیابی کا انحصار قائد کی صلاحیتوں کے علاوہ دو اور باتوں پر بھی ہوتا

ہے۔ ایک تو یہ کہ منزل مقصود کتنی خوش آئند اور پرکشش ہے اور دوسرے یہ کہ جس

غزلب سے فرار مطلوب ہے وہ کس حد تک جان لیوا ہے۔ ہماری منزل مقصود مدینہ تھی۔

شمال کا ایک خوب صورت، شاداب شہر اور جس کے خوف سے ہم فرار چاہتے تھے وہ تھا

کیں۔ ہم اور تھے، سب سے مختلف، سب سے جدا۔ ہم خاص لوگ تھے۔ ہم اپنے ساتھ تجارت کا سامان نہیں اللہ کی سونپی ہوئی ذمے داری لے کر جا رہے تھے۔ جب تک دنیا میں گھڑیاں چلتی رہیں گی، جب تک وقت کی گردش جاری رہے گی۔ ہمارے نقش قدم قائم رہیں گے۔ ہواؤں کے تیز سے تیز جھکڑ بھی انہیں نہیں مٹا سکیں گے، اس لئے کہ ہم اسلامی تقویم کے پہلے سال کے نقیب تھے۔ وقت کی ابتدا ہی ہمارے قدموں کی چاپ سے ہوئی۔

سخت گرمی کا مہینہ تھا۔ صحرائی سفر کے لئے سال کے بدترین دن مگر اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے یہ سفر آسان کر دیا تھا۔ کوئی باؤِ سوموم کا جھونکا ہم تک نہیں پہنچا، کوئی طوفانِ باد ہم سے نہیں لٹکرایا، کسی نے ہمارا پیچھا نہیں کیا۔ مطلع صاف رہا اور ستارے ہماری رہنمائی کرتے رہے۔ پانچویں دن ہمیں دُور افق کے پاس چند بدوی نظر آئے۔ تین یا چار جو فوراً ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک دن بچوں نے ریت پر بیٹھے ہوئے ایک شتر مرغ کو اٹھا دیا۔ میں اُس کے پیچھے لپکا کہ شکار کر کے کھائیں گے مگر اُس کے تعاقب میں، میں ریت پر گر گیا اور وہ غائب ہو گیا۔ چھ دیر تک میری حالت پر قہقہے لگاتے رہے بس اس کے علاوہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ چھوٹی موٹی بیماریاں لگی رہیں۔ گرمی کے سفر میں کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے۔ تینوں چنے باری باری بیمار پڑتے رہے لیکن بیماری میں جب ہم انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلتے تو ساری بیماری بھول جاتے۔

ہمارے ایک ساتھی کے پاؤں میں زخم تھا جو خالصاً بجز چکا تھا۔ تین دن تک وہ پیدل چلتا رہا اور اُس نے اپنی تکلیف ہم سے چھپائے رکھی۔ چوتھے دن میں نے اُس کے پاؤں کا درد اُس کی چال میں نہیں، اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جیسے ہی اُسے یہ احساس ہوا کہ مجھے اُس کی تکلیف کا علم ہو گیا ہے، اُس نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دئے، یہاں تک کہ وہ ہم سے بہت آگے نکل گیا۔

ابو جہل۔ جب مہم کے لئے حالات اتنے سازگار ہوں تو میری کامیابی یقینی تھی۔ آگ اگلتا ہوا، پھٹکارا ہوا ابو جہل جیسا ابلیس پیچھے لگا ہو تو کون ہے جو جان کی بازی نہیں لگا دے گا۔ کئے سے مسلمانوں کی ہجرت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ سب کو مدینے جانا تھا۔ حکمتِ عملی یہ تھی کہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی وقت صحرا میں نکل جائیں اور الگ الگ راستوں سے ہوتے ہوئے مدینہ پہنچ جائیں۔ ہر ٹولی کی ہجرت کی رات اور وقت رسول کریم خود متعین فرماتے تھے۔ یہ سب کام انتہائی احتیاط اور رازداری سے کیا جا رہا تھا۔ حضور مہاجرین کی ہمت بڑھاتے تھے اور اُن کے رازِ سفر کا انتظام کرتے تھے۔ اُن کو سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ دشمن کیسے صحرا میں مسلمانوں کو گھیر کر اُن کا قتل عام نہ کر دیں۔ ہمیں حکم تھا کہ ہماری ٹولیاں فاصلے فاصلے سے چلیں اور جب تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ اب دشمن کی دسترس سے باہر ہیں تب تک کسی جگہ اکٹھے نہ ہوں۔ ہر ٹولی کا ایک قائد مقرر کیا جاتا تھا۔ مجھے بھی حضور نے ایک ٹولی کا قائد بنا دیا۔ چھ مرد، دو عورتیں اور تین چنے۔ رحمتِ دو عالم نے خود ایک چنے کو گود میں اٹھایا اور ایک میل تک ہمارے ساتھ کئے سے باہر آئے اور ہمیں دُعاؤں کے ساتھ رخصت کر کے واپس لوٹ گئے۔ میں سوچتا ہوں حضور نے مجھ پر بڑا اعتماد فرمایا تھا۔ خوشی کے مارے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ مجھ میں وہ جرأت پیدا ہو گئی تھی کہ اگر شیر بھی سامنے آتا تو میں ہبتا اُس سے لڑ پڑتا۔ میں غلام ابنِ غلام بلال انسانوں کا سربراہ بنا دیا گیا تھا۔

کئے سے مدینہ تقریباً دو سو پچاس میل دور ہے۔ گرمیاں ہو تو اونٹوں پر یہ سفر نو دس دن کا ہے، چنے ساتھ ہوں تو گیارہ بارہ دن کا۔ دونوں شہروں کا درمیانی صحرا اقرن ہاقرن سے قافلوں کی رہ گزر ہے، کروڑوں انسان یہاں سے گزر چکے ہیں اور ہواؤں نے سب کے نقش قدم ریت سے ڈھانپ دئے ہیں مگر ہوائیں ہمارے قدموں کے نشان کبھی نہ مٹا

میرا استقامت کے اس بے مثال مظاہرے میں اُس پر کیا گزری اللہ ہی جانتا ہے جو اپنے بندوں کے لئے ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ ہمیں اُس کے پیچھے دوڑ کر اُس کی سماعت کرنا پڑی کہ وہ ہمارے ساتھ چلے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اُس کے پاؤں کی تکلیف کا ذکر کرے لیکن جب ہم مدینے میں داخل ہوئے تو اُس کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا اور وہ ایک ٹانگے سے اُچھل اُچھل کر چل رہا تھا۔

یہ تھی مکے سے میری رخصت، میری ہجرت!

## الوداع مکہ

ہماری ہجرت کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جس پر ہماری نظر نہ تھی۔ مکے سے چلے ہوئے ہمیں چھٹان دن تھا کہ صحرا میں ہماری ملاقات حمزہ سے ہوئی۔ انہوں نے ہمیں جو خبر سنائی، اُس کے لئے ہم بالکل تیار نہیں تھے۔ حمزہ نے بتایا کہ رسول اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک سارے مسلمان ہجرت نہیں کر جاتے، وہ مکے ہی میں قیام فرمائیں گے۔

ہم اس سوچ میں پڑ گئے کہ کھار مکہ کا سارا اعناد تو انہی سے ہے۔ دشمن اُن سے فارغ ہوتے تھے تو ہم کو تختہ مشق بناتے تھے۔ جب ہتھتے کی ملکہ ہی اُن کے پاس ہے تو شہد کی مکھیوں کی انہیں کیا پرواہ۔ وہ جہاں چاہیں اُڑتی پھریں۔ اب صورت حال کا جو نقشہ ہمارے ذہن میں ابھر ا وہ یہ تھا کہ رسول اللہ قاتلوں اور دشمنوں میں کھلے عام پھر رہے ہیں اور جان کا خطرہ مول لے کر تنہا مسلمانوں کی ہجرت کا ہندو بست کر رہے ہیں۔ یہ بے خوفیاً اللہ کی

دین تھی مگر ہم سوچتے تھے کہ اُن کو اس طرح غیر محفوظ پا کر مشرکین مکہ کے زرخیز ذہنوں میں کیسے کیسے منصوبے نہیں آتے ہوں گے۔ اُن کے سر پرست مطمئن عدی کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ جب تک وہ زندہ تھے، ہزار مخالفت کے باوجود کسی کو اُن کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں تھی۔

مکہ میں جو کچھ ہو اس کا علم تو ہمیں بعد میں ہوا لیکن اس کا ذکر یہیں بر محل ہو گا۔ مکہ کے امراء نے ابو جہل کے ایما پر واقعی اللہ کے رسولؐ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایک نہایت جامع منصوبہ جس میں ابو جہل کی تمام مکاری، تمام چابک دستی، تمام فطانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہ ایسا منصوبہ تھا جسے ابو جہل کے شریک اور فتنہ پرور ذہن کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ آنحضرتؐ بھی راستے سے ہٹ جاتے تھے، اور الزام بھی کسی پر نہیں آتا تھا۔

تجویز یہ تھی کہ سات قبیلوں کے سات آدمی، اپنے اپنے قبیلے سے ایک ایک نیزہ لے کر جائیں اور رسول اللہؐ کے جسم میں پھونک کر دیں۔ اس طرح قتل کی ذمہ داری نہ کسی ایک قبیلے پر آئے گی اور نہ کسی فرد واحد پر۔ مکہ کے قانون کے مطابق قاتل کو ڈھونڈ کر اسے قتل کرنا لازم تھا لیکن اس تجویز میں کسی کے قاتل ٹھہرائے جانے کا امکان ہی نہیں تھا۔ سات قبیلوں کے آدمی اگر مل کر کسی کو قتل کر دیں تو محمدؐ کا خون کئی قبیلوں پر تقسیم ہو جائے گا اور اُن سب سے بدلہ لینا ناممکن ہو گا۔ یہ ایسا منصوبہ تھا گویا خود ابلیس نے مرتب کیا ہو۔

لیکن ہوا یہ کہ اُس رات سات نیزے بلند ضرور ہوئے مگر اٹھے کے اٹھے رہ گئے، کسی کو مارے نہیں جاسکے۔ حضورؐ کے بستر پر علیؑ سو رہے تھے اور وہ خود ہجرت فرما چکے تھے۔ مکہ چھوڑنے سے قبل وہ سب کی امانتیں واپس کرنا چاہتے تھے، اس لئے کہ وہ الامین تھے۔ ان

میں سے کئی امانتیں کفار کی بھی تھیں جو تمام اختلافات کے باوجود اب بھی انہیں امین سمجھتے تھے۔ الامین نے ساری امانتیں علیؑ کے سپرد کر دیں کہ اُن کی روانگی کے بعد لوگوں کو واپس کر دیں۔ وہ خود واپس کرتے تو سارے مکہ کو اُن کے جانے کی خبر ہو جاتی اور وہ انہیں ہرگز زندہ نہ چھوڑتے۔ نہ واپس کرنے کا تو مکہ کے امین کے یہاں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یہ تھا پس منظر اُس رات کا جب علیؑ اُن کے بستر پر سوتے ہوئے پائے گئے تھے۔

جس وقت اُن کے گھر میں نیزے لہرا رہے تھے، وہ خود مکہ سے باہر جا چکے تھے مگر ابھی خطرے سے باہر نہیں تھے۔ ابو جہل کو اُن کی ہجرت کی اطلاع ملی تو اُس نے قریش کے سرداروں کو بھڑکا کر اُن سب کی طرف سے یہ اعلان کروادیا کہ جو محمدؐ کو زندہ یا مردہ مکہ لے کر آئے گا اُسے سوا نٹ انعام میں دئے جائیں گے۔ ایک سوا نٹ بہت بڑا انعام تھا۔ مکہ کے سارے گھڑ سوار محمدؐ کی کھوج میں صحرا میں پھیل گئے۔ انعام کے علاوہ کفار کی مردم آزار طبیعت کے لئے محمدؐ کو ان حالات میں ڈھونڈنا لٹا بڑی دلچسپ مہم بھی تھی۔ میں غلام رہ چکا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ انسان جب انسان کا شکار کرنے کی ٹھان لیتا ہے تو بڑی بے رحمی اور خوں خواری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جانور جب شکار کرتے ہیں تو اس سنگدلی کا عشر عشر بھی نہیں نظر آتا لیکن ہوتا یہ ہے کہ نمرود کی طرح آخر میں وہ خود ہی شکار ہو جاتا ہے۔

محمدؐ، ابو بکرؓ اور اُن کے بیٹے عبد اللہؓ کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے تو مدینے جانے کے لئے انہوں نے کھلے صحرا کا انتخاب نہیں کیا۔ قریش کے پھیلانے ہوئے جال میں وہ راستہ اختیار کرنا قطعی نامناسب تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے شمال کی طرف جانے کی بجائے پہلے جنوب کی طرف گئے اور غار ثور میں پناہ لے لی۔ بے شک اللہ بڑا حکمت والا ہے! عبد اللہؓ انہیں غار تک پہنچا کر واپس مکہ آگئے۔ وہ ہر روز رات کے وقت غار ثور جاتے، انہیں کھانا پہنچاتے اور شہر کی خبریں سناتے۔

کر دیکھا اور بولے:

”ہیں اب خاتمہ ہے یا رسول اللہ! باہر آٹھ دس آدمی کھڑے ہیں اور ہم صرف دو

ہیں۔“

حضور نے سرگوشی میں جواب دیا:

”تم غلطی کرتے ہو ابو بکر! اللہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ ہم تین ہیں۔“

یہ وہ وقت تھا جب ایک مکڑی نے عمار ثور کے تنگ دہانے پر جالاتن دیا اور دو سفید کبوتر کہیں سے اپنی چونچوں میں جھنکے پڑے آئے اور عمار کے دہانے پر گھونسل بنا کر بیٹھ گئے۔ محمد اور ابو بکر عمار کی تاریکی میں دبے بیٹھے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی ننھی مخلوق کو جو عمار کے دہانے پر مصروف کار تھی، اُن سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ابو جہل اور امیہ پتھروں پر چڑھتے ہوئے عمار کے منہ تک پہنچ گئے۔ آہٹ مٹ کر کبوتر گھبرا کر اڑے اور مکڑی پتھروں کی کسی درز میں جا چھپی۔ ابو جہل ذرا اور آگے بڑھا تو اس نے عمار کے منہ پر تباہ کنی کا جالا اور ایک گھونسل ادا کھلا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بغیر جالاتن کے کون اندر داخل ہو سکتا ہے! اور جالاتن پورا تباہ ہوا ہے۔ اور پھر یہ گھونسل۔ پرندے انسانوں کے نزدیک گھونسلے بنا کر بسیرا نہیں کرتے۔ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے کھوٹی کو بے فطن سنائیں بیویا اتا ہوا نیچے اتر اور اپنے ساتھیوں سمیت گھوڑوں پر بیٹھ کر واپس مکہ روانہ ہو گیا۔ کھوٹی بھی واپس چلا گیا۔ میں نے سنا ہے اس واقعے کے بعد اُس نے قسم کھالی تھی کہ آئندہ کسی انسان کا کھوج نہیں لگائے گا۔

مکڑیوں اور کبوتروں کے لئے شاید یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو۔ مکڑیاں جالے بستی عمار ہتی ہیں اور کبوتر گھونسلے بناتے ہی رہتے ہیں لیکن اُس روز پختہ اسلام اور دین اسلام، دونوں کی زندگی کیسے نازک رشتوں پر قائم تھی۔ خس آئیں اور تار عنکبوت!

سولونٹ بھر حال سولونٹ ہوتے ہیں۔ یہ انعام چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ویسے تو ہر صحرانورد ریت پر نشان دیکھ کر صورت حال کا جائزہ لینے کا پیرا لکٹی ماہر ہوتا ہے مگر اُن دنوں اتفاق سے کتے میں ایک نہایت ماہر کھوٹی آیا ہوا تھا۔ میری طرح جشہ کار بننے والا سیاہ قام۔ صحرائے عرب میں اُس کی صلاحیتوں کا بڑا شہرہ تھا۔ کہتے ہیں وہ ہوا کو سونگھ کر اڑتے ہوئے پرندوں کی خبر دے دیا کرتا تھا۔ پتھروں پر قدموں کے نشان دیکھ لیتا تھا۔ اُس کے دوست تو کہا کرتے تھے کہ وہ ہوا کو دیکھ بھی سکتا ہے۔ جب سب لوگ شمال کی طرف نکل پڑے تو یہ کھوٹی واحد شخص تھا جو مخالف سمت میں جنوب کی طرف گیا۔ ابو جہل، امیہ اور اُن کے ساتھی جتھوں نے اُس کی خدمات حاصل کی تھیں، اُسے حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر وہ ایک ہی فقرہ کے جاتا تھا:

”میں خود نہیں جا رہا۔ کسی کے قدموں کے نشان مجھے لوہر لئے جا رہے ہیں۔“

ابو بکر نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ ہر روز اُن کے آزلو کردہ غلام عامر بن فہیمہ اُن کی بھیڑیوں لے کر عمار ثور تک جاتے اور واپس بکے آجاتے۔ اس طرح بھیڑیوں کے ریوڑ سے عبد اللہ کی آمدورفت کے نشان مٹ جاتے۔ ہجرت کی شب بھی عامر اپنی بھیڑیوں کا گلہ پیچھے پیچھے لے کر گئے تھے مگر کھوٹی نے بھیڑیوں کے چھوٹے چھوٹے نشانوں میں لونٹوں کے کچھ بڑے بڑے نشان بھی دیکھ لئے تھے۔

کھوٹی چلتے چلتے عمار ثور تک پہنچ گیا اور وہاں پہنچ کر بیٹھ گیا۔ اُس کا کام ختم ہو چکا تھا۔ کشت و خون کسی اور کا کام تھا۔

ابو جہل، میرا سابقہ آقا امیہ اور دیگر کفار جو اُن کے ساتھ تھے، عمار ثور کے باہر کھڑے صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے مگر پھر بھی ابو بکر کے کانوں میں اُن کی آہٹ پہنچ گئی۔ انہوں نے عمار کے اندر سے جھانک

## ثور سے قبا

غارِ ثور میں آپ کا تیسرا دن تھا۔ اُس رات جب عبداللہ آئے تو ان کے ساتھ اُن کی ہشیرہ اسماءؓ بھی تھیں۔ اسماءؓ نے کھانے پینے کا بہت سا سامان ایک تھیلے میں بھرا ہوا تھا۔ عامرؓ بھی اُن کے ساتھ تھے مگر آج وہ اپنی بھویں ساتھ نہیں لائے تھے۔ مکزی کا جالا آہستہ سے ہٹا کر حضورؐ اور ابو بکرؓ غار سے باہر آئے۔ ماہِ صفر کی آخری تاریخیں تھیں اور ستاروں کی روشنی کے علاوہ کوئی اُجالا نہیں تھا۔ چاروں، رات کی تاریکی میں آہستہ آہستہ پہاڑی سے نیچے اترے۔ نیچے پہاڑی کے دامن میں اریظ نامی ایک کافر بدوی تین اونٹنیاں لئے کھڑا تھا۔ ان میں دو اونٹنیاں وہ تھیں جو ابو بکرؓ نے سفرِ ہجرت کے لئے بطورِ خاص خرید کر اریظ کے پاس رکھوائی ہوئی تھیں۔ اریظ، صحرا کے چپے چپے سے واقف تھا اور مسلمان نہ ہونے کے باوجود بے حد قابلِ اعتماد تھا۔ ابو بکرؓ نے رسولِ کریمؐ کو جو اونٹنی پیش کی اُس کا نام قصواء تھا۔ حضورؐ نے کہا:

وہ پھر سوار ہو کر آگے بڑھا تو اس کے گھوڑے کے سامنے کے دونوں پاؤں ریت میں دھنس گئے۔ یہ عربستان کا مشہور سوار سراقہ بن مالک تھا اور اُس کا مرکب سارے عربستان کا مشہور گھوڑا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر اور اپنے گھوڑے پر بہت ناز تھا۔ جب یہ انہو نا واقعہ پیش آیا تو سراقہ نے وہیں بڑھ کر حضور کی بیعت کر لی بلکہ اُس نے اُن سے امان کی ایک تحریر کی بھی درخواست کی جو عام بن فہرہ نے تحریر کی اور جو فتح مکہ کے موقع پر اُس کے کام آئی۔ اُس دن رسول اللہ نے اُسے یہ بشارت بھی سنائی کہ ایک دن کسریٰ کے کنگن اُس کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ پتہ نہیں اللہ مجھے وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ رکھے گا یا نہیں۔ اسی راستے پر ایک شام انہیں حیرہ احمر پر ربیع الاول کا نیا چاند نظر آیا جسے دیکھ کر اللہ کے نبی نے فرمایا:

”اے رحمتوں اور برکتوں کے چاند! میرا ایمان اُس پر ہے جس نے تجھے بنایا ہے۔“

وہ ہمیشہ نئے چاند کو دیکھ کر یہی فرمایا کرتے تھے۔ یہ ساری تفصیل میں نے عامرؓ سے سنی جو اس عظیم ہجرت کے تاریخی سفر کے ایک ایک قدم کے عینی شاہد تھے۔ ایک صبح انہوں نے دیکھا کہ سامنے سے ایک چھوٹا سا قافلہ چلا آ رہا ہے۔ سب پریشانی میں مبتلا ہو گئے کیونکہ اگر وہ کسی دشمن کا قافلہ تھا تو فرار ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مگر جلد ہی اُن کی پریشانی خوشی میں تبدیل ہو گئی جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ابو بکرؓ کے عم زاد طلحہ بن عبید اللہؓ کا تجارتی قافلہ ہے۔ طلحہؓ شام سے کپڑ اور دیگر سامان کئے میں فروخت کرنے کے لئے لا رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے مدینے میں بھی قیام کیا تھا۔ طلحہؓ نے انہیں بتایا کہ مدینے میں رسول اللہؐ کی آمد کا نہایت شدت سے انتظار ہو رہا ہے اور یہ کہ وہ خود بھی اپنا سامان فروخت کر کے مدینے ہجرت کر جائیں گے۔ رخصت سے پہلے طلحہؓ نے حضورؐ اور ان کے ساتھیوں کو شام کا نہایت نفیس سفید کپڑا پیش کیا تاکہ وہ لباس تبدیل کر سکیں۔ طلحہؓ کے رخصت ہونے کے تھوڑی دیر بعد اریقظ نے شمال مغرب کی جائے شمال کی طرف رُخ کر لیا۔ اور یہ چھوٹا سا قافلہ

”میں اس اونٹنی پر سواری نہیں کروں گا جو میری نہیں ہے۔“

ابو بکرؓ نے عرض کی:

”یا رسول اللہؐ یہ آپ ہی کی ہے۔“

حضورؐ نے کہا:

”نہیں ابو بکر! تم نے اس کی کیا قیمت ادا کی ہے؟“

ابو بکرؓ نے رقم بتائی تو اللہ کے رسولؐ نے کہا:

”میں اسے اس قیمت پر خریدتا ہوں۔“

اس سے پہلے حضورؐ نے ابو بکرؓ کی طرف سے کئی تحفے قبول فرمائے تھے مگر اُس

رات ہجرت کے اُس تاریخی لمحے میں اُن کا لہجہ اتنا حتمی تھا کہ ابو بکرؓ نے اصرار مناسب نہ سمجھا۔ یہ ایک پیغمبر کی ہجرت کا لمحہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اللہ کا رسولؐ اپنے وطن، اپنے آبائی شہر سے اللہ کے نام پر، اللہ کی خاطر، رخصت ہو رہا تھا۔ اپنا سارا اچھن، ساری جوانی، ساری زندگی تاج کر وہ ایک قربانی پیش کر رہا تھا۔ یہ اُس کی ذاتی قربانی تھی جو وہ خالصتاً اپنے وسائل سے دینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد آپؐ قصواء پر سوار ہو گئے۔ ابو بکرؓ اور عامرؓ دوسری اونٹنی پر اور اریقظ تیسری اونٹنی پر جو وہ اپنے لئے لایا تھا۔ اسماءؓ اور عبد اللہؓ نے سامان کا تھیلا اریقظ کے حوالے کیا اور پھر تینوں کو اللہ کی امان میں سوئپ کر واپس مکہ چلے گئے۔ تینوں سواروں نے مغرب کا راستہ لیا۔ اب بھی اُن کا رُخ مدینے کی طرف نہیں تھا، بلکہ وہ حیرہ احمر کی طرف جا رہے تھے۔ دو دن میں تقریباً پچاس میل کی مسافت طے کر کے وہ ساحلِ سمندر پر پہنچ گئے۔ یہاں سے وہ ساحل کے ساتھ ساتھ شمال مغرب کی طرف مُڑے اور تمام جانے پہچانے راستوں سے بچتے، کتراتے سفر کرتے رہے۔ ان راہوں میں بھی ایک پیچھا کرنے والے نے انہیں تلاش کر لیا۔ وہ اُن کے پیچھے لپکا لیکن اللہ کی قدرت سے اُس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔

اب آہستہ آہستہ ساحلِ سمندر سے دُور ہوتا گیا۔ کچھ دُور شمال کی طرف چلنے کے بعد اب وہ شمال مشرق کی طرف چلنے لگے۔ یہ مدینے کی سمت تھی۔ اسی راستے میں سورہ القصص کی وہ آیت نازل ہوئی تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو مکہ واپس آنے کی بشارت دی تھی۔ جس نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے۔ سوہ آپ کو آپ کے وطن پہنچا کر رہے گا۔

بارہویں دن فجر سے کچھ دیر پہلے وہ واوئی عقیق میں داخل ہو گئے۔ اُسے پار کر کے انہوں نے سامنے کے سیاہ پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ چڑھائی ختم ہوتے ہوتے سورج نصف النہار پر آچکا تھا اور گرمی کی وہ شدت کہ اللہ کی پناہ! عام حالات میں وہ کچھ دیر کسی چٹان کے سائے میں آرام کرتے اور سورج ڈھلے دوبارہ سفر کا آغاز کرتے لیکن یہ عام دن نہیں تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ چلتے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ سفر کرنے کے بعد انہیں دُور سے یثرب کے باغات اور کھجوروں کے جھنڈ دکھائی دینے لگے۔ اب تو قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے خوابوں کی تعبیر، اُن کی امیدوں کا مرکز اُن کے سامنے تھا۔ سخت تھکن اور حدت کے باوجود وہ آہستہ آہستہ چلتے گئے، ثبائی طرف جو اس سرسبز وادی کی نزدیک ترین آبادی تھی۔

ادھر مدینے میں ہم لوگ سخت بے چین تھے۔ اتنی خبر ہمیں مل چکی تھی کہ وہ مکے سے نکل چکے ہیں۔ ہر صبح ہماری ٹولیاں اُن کی تلاش میں مدینے آنے والے راستوں پر صحرا میں نکل جاتیں اور چند گھنٹوں بعد جب دھوپ کی شدت برداشت سے باہر ہو جاتی تو واپس لوٹ آتیں۔ طلحہ بن عبید اللہ مدینے سے ہو گزرے تھے۔ اُن سے بھی ہم اپنی فکر مندی ہی کا اظہار کر سکے تھے۔ اُن سے ختمی مرتبت کی کوئی خیر خبر نہیں مل سکی تھی۔

اس موسم میں کسی جان دار کا دیر تک دھوپ میں رہنا ممکن نہیں تھا۔ مسافر بھی

سفر روک دیتے تھے اور کسی چھاؤں میں یا اوپر کپڑے تان کر اُن کے نیچے قیام کرتے تھے اور پھر سورج ڈھلنے پر دوبارہ سفر شروع کرتے تھے۔ بچے بچے کی زبان پر تھا کہ اللہ کا رسول آ رہا ہے۔ مسلمان خوش تھے، منافق پریشان تھے اور اہل یہود محتاط۔ دو روز سے ہماری پریشانی بہت بڑھ گئی تھی۔ اُن کو مکے سے چلے تیرہ دن ہو گئے تھے اور خطرات کا ہمیں پورا پورا اندازہ تھا۔ قریش سے کوئی بات بعید نہیں تھی۔

پھر ایک دن اچانک دوپہر کے کچھ دیر بعد جب ہم سب تھک ہار کر صحرا سے واپس آ گئے تھے، مدینے میں ایک شور بلند ہوا۔ گلی کوچوں میں، میدانوں میں، باغات میں ہر شخص دوڑا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے ثبائی کے ایک یہودی نے انہیں اپنی چھت سے دیکھا تھا۔ دور اُفق کے پاس تین چھوٹے چھوٹے سائے اونٹنیوں کی چال کے زیرِ دم کے ساتھ اونچے نیچے ہوتے ہوئے مدینے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے اونٹنیوں کی رفتار بہت آہستہ تھی۔ تیز دھوپ میں سواروں کے نہایت اُبلے سفید کپڑے چمک رہے تھے۔ تھوڑی سی تشویش بھی تھی کہ اتنے دنوں کے طویل سفر کے بعد سواروں کے یہ صاف شفاف کپڑے۔ کہیں یہ کوئی اور لوگ ہی نہ ہوں۔ بہر کیف ہم لوگ دیوانہ وار، اُن کے خیر مقدم کو پتے ہوئے صحرا میں دوڑ پڑے، گرتے پڑتے، سنبھلتے، لڑکھڑاتے، ایک دوسرے سے ٹکراتے، کھجوروں کی شاخیں لہراتے، خوشی کے مارے چیخنے چلانے، اپنی کامیابی پر شاداں، اللہ اکبر کے نعرے لگاتے، اپنے رسول کی سلامتی پر خدا کا شکر ادا کرتے! یہ ربیع الاول کی آٹھ تاریخ تھی اور پیر کا دن۔

مذہب کی تاریخ میں دو عظیم ہجرتیں ہیں۔ مصر سے یہودیوں کی اور مکے سے ہماری۔ عیسائی تقویم کے مطابق سن ۶۲۲ تھا، یہودی تقویم کے حساب سے ۴۳۸۲ اور ہم مسلمانوں کی تقویم کی توابتدایہ ہجرت سے ہوتی ہے۔ یہ ہمارا پہلا سال تھا۔



## قبا

قبا میں اللہ کے رسولؐ نے وہاں کے ایک بزرگ کلثوم بن ہدیم کے گھر تین دن قیام کیا۔ یہ وہی کلثوم تھے جنہوں نے اس سے پہلے حضرت حمزہؓ اور زیدؓ کی میزبانی کی تھی۔ قبا سے مدینہ کچھ دور نہیں تھا۔ میں تو حضورؐ کی خدمت ہی میں رہتا تھا لیکن مدینے سے آنے والے اوس اور خزرج کے لوگوں کا تانتا بدھا رہتا۔ اسی قیام کے دور کی ایک نہایت حسین یاد ایک ایسے شخص کی آمد تھی جو نہ اوس کا تھا، نہ خزرج کا، نہ یہودی، نہ عرب کے کسی اور قبیلے کا۔ یہ ایک عجمی تھا جو بو قریظہ کے ایک یہودی عثمان بن الاشہل القرظی کے کھجوروں کے باغ میں کام کرتا تھا۔ یہ باغ قبا ہی میں تھا۔ حضورؐ کی جائے قیام سے تھوڑے ہی فاصلے پر۔ وہ آیا تو اُس کی شکل و شبہت، لب و لہجہ ہمیں بڑا غیر مانوس سا معلوم ہوا۔ اُس کی مٹھی میں چند کھجوریں تھیں۔ بڑی بے ساختگی تھی اُس کے مزاج میں۔ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی

میں بڑی شانِ استغنا کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا۔ گٹھا ہوا جسم، بلند قامت، سرخ و سفید رنگت، سر پر گھنے سیاہ بال۔ لٹیں کانوں کے پیچھے سے یوں نکلی ہوئی کہ رخساروں پر ہلال بن گئے تھے۔ اونٹنی کو مسجد کے ایک گوشے میں بٹھا کر نزدیک آیا اور بلند آواز سے پوچھا آپ میں سے محمد کون ہے۔

حضورؐ نے جواب دیا:

”میں ہوں۔“

بدوی نے کہا:

”آپ کا ایک قاصد ہمارے قبیلے بنو سعد بن بحر میں آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کو

اللہ نے اپنا رسول بنایا ہے۔“

حضورؐ نے کہا:

”اُس نے سچ کہا۔“

بدوی نے پوچھا:

”آسمان اور زمین کس نے بنائے ہیں؟“

آپؐ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے“

پھر وہ بولا:

”پہاڑ اور ان میں طرح طرح کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟“

آپؐ نے جواب دیا:

”اللہ تعالیٰ نے۔“

پھر اس نے پوچھا:

اُس نے بغیر کسی تمہید کے حضورؐ کو کھجوریں پیش کیں اور ساتھ ہی کہا یہ صدقہ ہے۔ آپ نے نوارد کو مسکرا کر دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کھجوریں لے لیں۔ میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے اُس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بات یہیں ختم نہیں ہوگی۔ وہ ٹٹکنکی باندھے حضورؐ کو دیکھے جا رہا تھا جیسے اُسے کسی بات کا انتظار ہو۔ آپ نے چند لمحے کھجوریں اپنے پاس رکھیں اور پھر ایک ایک کر کے حاضرین میں تقسیم کر دیں۔ جب سب ختم ہو گئیں اور نوارد نے دیکھا کہ انہوں نے اُن میں سے ایک بھی خود نہیں کھائی تو اس کے چہرے پر ایک عجیب و غریب چمک پیدا ہوئی۔ اس کا تن بدن روشن ہو گیا جیسے اندر سے کوئی جوالا پھوٹ رہی ہو۔ منہ سے ایک لفظ نہیں کہا اور دل ہی دل میں نہ جانے ایمان کی کتنی منزلیں طے کر گیا۔ ویسے تو ہمارے لئے یہ معمول کی بات تھی، لوگ آتے رہتے تھے اور فرد افراد یا گروہوں کی شکل میں اسلام قبول کرتے جاتے تھے لیکن اُس شخص کا بلا استغفار یوں اسلام لے آنا مجھے عجیب سا معلوم ہوا۔ پھر اُس کے تیور بھی ایسے تھے کہ دل میں کئی سوال بیدار ہوئے۔ عجیب شان تھی اس قبولِ اسلام کی۔ ابو ذر غفاریؓ کا قبولِ اسلام یاد آ گیا جو اسلام کے اولین دنوں میں مکے میں کسی رسول کی آمد کی خبر سُن کر، آپ کے پاس تشریف لائے اور دین کے بارے میں محض دو تین سامنے کے سوال کر کے کلمہ پڑھ لیا۔ اور نہ صرف خود مسلمان ہوئے بلکہ اپنے سارے قبیلے کو مشرف بہ اسلام کرانے کا شرف حاصل کیا۔ اللہ جل شانہ، جسے توفیق دے۔

ایک دوسرا واقعہ ایسا ہی بے ساختہ اسلام لانے کا مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔

بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ مدینے میں آئے ہوئے ہمیں نو دس سال ہو چکے تھے۔ ایک سرد پہر ہم مسجد نبویؐ میں حلقہ جمائے بیٹھے تھے۔ حضرت عمروؓ طلحہ بن عبید اللہؓ، انس بن مالکؓ اور نئی دیگر صحابہ، کرام حضورؐ کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ دینی مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک شخص اونٹنی کی مہارت تھامے خالص بدویانہ انداز

”آپ کو اسی اللہ کی قسم ہے جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے کیا واقعی اُس نے آپ کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے؟“

حضورؐ نے اثبات میں جواب دیا۔

پھر اُس اعرابی نے پوچھا کہ کیا واقعی پانچ نمازیں پڑھنا، سال میں ایک مرتبہ زکوٰۃ دینا، رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا اور استطاعت ہو تو حج کرنا اسی اللہ کا حکم ہے جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔

حضورؐ نے جیسے ہی اثبات میں جواب دیا۔ اس نے بر ملا کلمہ شہادت پڑھا اور کہا کہ اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ میں یہ پیغام قبیلے کے ہر فرد کو سناؤں گا اور اس میں کمی کروں گا نہ بیشی۔ پھر اُس نے نہایت ادب سے سلام کیا اور رخصت چاہی۔ یہ شخص تھا ضام بن ثعلبہؓ۔ ہم سب اُس طرح دار اعرابی کو رخصت ہوتے دیکھتے رہے۔ وہ اپنی اونٹنی کے پاس گیا۔ اس کی مہار پکڑ کر اُسے اٹھایا اور روانہ ہو گیا۔ جو نبی وہ مسجد کی حدود سے باہر نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہوا، اللہ کے رسولؐ نے فرمایا اگر یہ گیسوؤں والا سچا ہے تو ضرور جنت میں داخل ہو گا۔ ایک مرتبہ میں نے عبد اللہ بن عباسؓ کو یہ کہتے سنا تھا کہ میں نے کسی قوم میں ضامؓ سے بہتر کوئی شخص نہیں دیکھا۔

اُن ہی دنوں نویں ہجری میں فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے بحرین سے تیرہ چودہ آدمیوں کا ایک وفد رسالت مآبؐ سے ملنے مدینے حاضر ہوا تھا۔ اُنچ عبد القیس نامی ایک چاق و چوبند نوجوان اُس وفد میں شامل تھا۔ مسجد نبوی کے پاس آکر اُس نے اپنے قافلے کے اونٹ ایک طرف بٹھائے۔ اور سب اونٹوں سے سامان اُتروا کر نہایت سلیقے سے ایک جگہ رکھوادیا۔ پھر نہایت اطمینان سے اپنا قبچہ کھولا اور دو سفید ڈھلے ہوئے کپڑوں کا جوڑا نکالا۔ منہ ہاتھ دھو کر راستے کی گرد دور کی اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر اپنے ساتھیوں سمیت

رسول پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مہمانوں کی آمد پر میں حسب دستور حضورؐ کے احکامات کے انتظار میں ایک طرف کھڑا تھا۔ لُحج آگے بڑھا، نہایت مودبانہ انداز میں حضورؐ سے مصافحہ کیا اور آپ کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنا اور اپنے وفد کا تعارف کر لیا اور اسلام سے اپنی رغبت کا اظہار کیا۔ کئی اور صحابہ بھی موجود تھے۔ سرور کائناتؐ نے اس کی باتیں سن کر مسرت کا اظہار فرمایا اور پھر اُس نوجوان کو غور سے دیکھتے ہوئے فرمایا:

”تمہاری دو خصلتیں ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں۔ ایک حلم اور دوسری وقار اور تمکنت۔“

لُحج نے کلمات تشکر ادا کرتے ہوئے ان سے پوچھا:

”یہ دونوں خصلتیں مجھ میں بطور تصنع ہیں یا فطری اور جلی“

رسول اللہؐ مسکرائے اور فرمایا:

”نہیں، عبد القیس نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا ہی ان خصلتوں پر کیا ہے۔“

لُحج عبد القیس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنے قافلے سمیت اسلام کے دائرے میں

داخل ہو کر اہل مجلس کے دلوں میں ہمیں کے لئے اپنا نقش چھوڑ گیا۔

حضورؐ کے حکم کے مطابق میں نے فردا فردا وفد کے تمام اراکین کو حنفے تحائف

دے کر رخصت کیا۔

اس کے چند ہی دنوں بعد ایک اور عجیب و غریب وفد مدینے پہنچا۔ یہ ہو تمیم کے

لوگ تھے۔ مختصر وفد، تقریباً دس آدمیوں پر مشتمل، نہایت غیر روایتی انداز میں مسجد نبوی

کے قریب حضورؐ کے حجرہ مبارک کے پیچھے کھڑے ہو کر باواز بلند حضورؐ سے مخاطب

ہوئے:

”اے محمد باہر آؤ تاکہ ہم آپ سے مفاخرہ اور شاعری میں مقابلہ کریں۔ ہم وہ ہیں

کہ ہماری مدح زینت ہے اور ہماری مذمت عیب“

لگائے۔ کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد سلمانؓ نے نبی اکرمؐ کو اپنی داستان سنائی کہ وہ ایک زر تاشتی خاندان میں پیدا ہوئے جو اصفہان کے قریب ایک گاؤں میں رہتا تھا اور پھر کس طرح وہ تلاش حق میں عیسائی راہوں کی صحبت میں شہروں شہروں، ملکوں ملکوں، پھرتے رہے، کبھی شام، کبھی موصل، کبھی عراق کے شمالی علاقوں میں، اور کس طرح اُن کے آخری مرشد نے اپنی وفات سے پہلے اُنھیں بتایا کہ مزید ہدایت وہ ایک نبی برحق سے پائیں گے جن کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اُس راہب نے بتایا کہ یہ نبی عرب قبائل سے اُٹھے گا اور دین ابراہیم کی دعوت دے گا۔ پھر وہ اپنے وطن سے ہجرت کر کے ایک نخلستان میں آباد ہو گا جس کے دونوں طرف منجد لاوے کی پتھریلی زمین ہوگی۔ اس کی پہچان یہ ہوگی کہ وہ ہدیہ قبول کرے گا مگر صدقہ نہیں اور اس کے شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ جب سلمانؓ نے یہ سنا تو اُنھوں نے بنو کلب کے ایک قافلے میں شامل ہو کر عربستان کا رخ کیا۔ اُن کی کچھ بحریاں بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ پہلے تو بنو کلب کے قافلے نے ایک ایک کر کے اُن کی ساری بحریاں کھالیں، پھر جب قافلہ خلیج عقبہ کے نزدیک وادی القریٰ میں پہنچا تو اُنھوں نے سلمانؓ سے مزید بد عمدی کی اور اُنھیں ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ وادی القریٰ کے سرسبز علاقے کو دیکھ کر سلمانؓ کو اکثر یہ خیال آتا کہ کہیں یہی وہ جگہ نہ ہو جہاں اللہ کے نبی کو آنا ہے۔ لیکن یہاں پتھر لے لاوے کے نشان نہیں تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد اُن کے یہودی آقا نے اُنھیں اپنے ایک عزیز عثمان بن الاشہل کے ہاتھ بیچ دیا جو بنو قریظ کا فرد تھا اور مدینے میں رہتا تھا۔ وہ انہیں لے کر مدینہ آ گیا جسے دیکھتے ہی اُنھیں یقین ہو گیا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں اللہ کے رسول کی آمد ہوگی۔ سرسبز و شاداب نخلستان اور شہر کے دونوں طرف لاوے کے پتھروں کے پھیلے ہوئے سلسلے اور پھر واقعی کچھ دنوں بعد شہر میں ایک نبی کی آمد کا چرچا شروع ہو گیا۔ اُس دن جب اُنھیں اُن کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ کھجوریں لے کر اُن کی

شور سن کر میں باہر نکلا اور حضورؐ کے حجرے میں جا کر اُنہیں اس وفد کی آمد سے مطلع کیا۔ حضورؐ ایک لمحہ خاموش رہے اور مجھے ظہر کی اذان کا حکم دیا۔ اذان ہوتے ہوتے وفد مسجد میں داخل ہو چکا تھا۔ حضورؐ بھی نماز کے لئے تشریف لے آئے۔ نماز ظہر کے بعد وفد کی طرف سے اُن کے خطیب عطار بن حاجب نے نہایت فصیح و بلیغ انداز میں اپنے قبیلے کے مناقب و محاسن بیان کئے۔ نبی کریمؐ نے جو ابلی خطبے کے لئے ثابت بن قیس انصاریؓ کو فرمایا۔ جواب ہو چکا تو بنو تمیم کا شاعر زبرقان کھڑا ہو گیا اور اپنی قبائلی مفاخرت کا قصیدہ پڑھا۔ تمام حاضرین اس صورتِ حال سے لطف اٹھا رہے تھے کہ آخر یہ فصاحت اور زورِ بیاں کا مقابلہ تھا جس پر عرب جان دیتے تھے۔ قصیدہ ختم ہوا تو حضورؐ کے اشارے پر حسان بن ثابتؓ تشریف لائے اور جو ابلی ایک نہایت مرصع قصیدہ فی البدیہہ پیش کیا۔ قصیدہ کیا تھا، ایک تخلیقی معجزہ تھا۔ سب حاضرین بے حد متاثر ہوئے۔ یہاں تک کہ مقابلے پر اترے ہوئے بنو تمیم کے شعراء اور خطیب بھی منصف ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُن کی طرف سے اقرع بن حابس نے کھڑے ہو کر اعلان کیا:

”اللہ کی قسم آپ کا خطیب ہمارے خطیب سے اور آپ کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے۔“ یہ کہتے ہی باقی لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور سب رسول اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گئے۔

بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ اُس دن قبائلی مشرف بہ اسلام ہونے والے جلیل القدر صحابی اور اسلام کے بہت مقتدر فرزند سلمان فارسیؓ تھے۔ حضور نے سلمانؓ سے بہت پیار کیا۔ اُن کو ہمیشہ اپنے گھر کا فرد سمجھا۔ اُن کو آزاد کرانے کی خاطر رقم کا بندوبست کیا اور اُن کے یہودی آقا کے باغ میں صحابہء کرام کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھ سے کھجوروں کے پودے

خدمت میں حاضر ہوئے۔ مگر جب آنے والے معزز مہمان نے صدقے کی کھجوریں خود نہیں کھائیں اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے لوگوں میں تقسیم کر دیں تو وہ بے ساختہ ایمان لے آئے کہ انھیں ان کے مرشد نے یہی نشانی بتائی تھی۔ حضورؐ نے سلمانؓ کی یہ داستان نہایت انہماک سے سنی اور خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی کہانی لوروں کو بھی سنائیں۔

مدینے کی اسی جنوبی نواحی مگرمی میں تین دن کے قیام میں ہم سب نے مل کر ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی۔ یہ اس مختصر قیام کی دوسری حسین یاد ہے جو دل میں یوں جاگزیں ہے جیسے کل کی بات ہو۔ مسجد کے نام سے آج کل ایک باقاعدہ نبی ہوئی عمارت ذہن میں آتی ہے۔ اسلام کی یہ پہلی مسجد جو اللہ کے رسولؐ کے فرمان پر ہم نے قبائیں تعمیر کی ایک کھلا صحن تھی۔ تقریباً سو نمازیوں کے لئے کلثومؓ کے گھر سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر ایک قطعہ زمین ہموار کر لیا گیا۔ اُس پر پڑے ہوئے پتھر اٹھادئے گئے۔ جھاڑیاں کاٹ دی گئیں اور اس قطعے کو ایک احاطے کی شکل دے دی گئی۔ یہ تھی اسلام کی پہلی مسجد جہاں مسلمانوں نے، جو اپنے ہادیؐ برحق کی امامت کے لئے ترسے ہوئے تھے، ایک عرصے بعد ان کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ اسی مسجد میں مدینے کے نو مسلموں کو پہلی مرتبہ اللہ کے رسولؐ کے ساتھ نماز ادا کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

## جانبِ بطحی

رسول اللہؐ نے قبائیں تین دن قیام کیا۔ چوتھے روز بارہ ربیع الاول کو جمعہ کے دن وہ مدینے کے لئے روانہ ہوئے۔ مدینہ والوں کے وفد پر وفد آرہے تھے۔ سارے شہر میں ان کا نہایت بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ مدینے کے راستے میں رانونہ کے مقام پر انھوں نے خزرج قبیلے کی ایک شاخ، جو سالم کے لوگوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا فرمائی، جو عمرو کے کچھ لوگ قبائے ان کے ساتھ ہو لئے تھے، جو بخار کے کچھ لوگ جو حضورؐ کے عزیز ہوتے تھے، مدینے سے انھیں لینے آئے تھے۔ یوں نماز میں تقریباً ایک سو آدمی تھے۔ نماز کے بعد حضورؐ قصواء پر سوار ہو کر مدینے کی طرف چل پڑے۔ ابو بکرؓ اور کئی دیگر لوگ بھی اونٹنیوں پر سوار تھے۔ قصواء آگے آگے چل رہی تھی۔ اس قافلے کے دائیں بائیں اوس اور خزرج کے گھڑ سوار زرہ بختہ پہنے ہوئے، ہاتھوں میں نگلی تلواریں لئے جلوس کے ساتھ ساتھ چل رہے

تھے۔ راستے میں دونوں طرف مردوں، عورتوں اور بچوں کے ہجوم تھے جو خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ ہو چار کی چچیاں دف بجایا کر خوش آمدید اور استقبال کے گیت گارہی تھیں۔ جوں جوں شہر نزدیک آ رہا تھا، ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مدینے میں اتنی خوشی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ پھر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں:

”حضور میرے یہاں قیام فرمائیے“

”مجھے سعادت بخشے حضور!“

”میرے یہاں رہئے یا رسول اللہ!“

”مجھے خدمت کا موقع دیجئے“

”میرا گھر بہت وسیع ہے، اُس میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی“

”میرے مہمان بنئے حضور!“

”میں اور میرے اہل خانہ ہمہ وقت آپ کی خدمت جلال میں گے“

”مجھ پر کرم فرمائئے، یا رسول اللہ!“

”میرا غریب خانہ حاضر ہے یا نبی!“

”یا رسول اللہ! مجھے مایوس نہ کیجئے گا“۔

رسالت مآب نے محسوس فرمایا کہ اگر انھوں نے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دے دیا تو باقی لوگوں کی دل شکنی ہوگی، شہر میں چہ مہ گویاں شروع ہو جائیں گی، لوگ نوح میں پڑ جائیں گے اور شہر ذہنی اعتبار سے منقسم ہو جائے گا۔ دعوت دینے والوں میں سب کے سب محبت اور عقیدت سے سرشار نہیں تھے۔ ان میں جہاں عبد اللہ بن رواحہ جیسے سر فروش شامل تھے، وہاں چند منافق بھی تھے۔ سب سے زیادہ زور تو عبد اللہ بن ابی دے رہا تھا، مدینے کا مانا ہوا ریاکار بلکہ رئیس المنافقین۔ اُس نے بڑھ کر قسواء کی مہار تھام لی، گویا وہ اللہ کے رسول

کو اپنی مرضی کے راستے پر لے جاسکتا تھا۔ کہنے لگا:

”مدینے میں میرا گھر سب سے خوب صورت ہے، یا رسول اللہ۔ اُس میں باغ بھی

ہیں۔ شہر میں میرے یہاں سے اچھا کھانا کہیں نہیں پکتا“

نبی کریم کسی کی دلا زاری نہیں چاہتے تھے مگر فیصلہ کیسے ہو۔ میں نے اکثر دیکھا کہ

وہ اچھے ہوئے معاملات کا بڑا آسان حل نکال کیا کرتے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا انھوں

نے ہلکا سا تبسم فرمایا اور قسواء کی گردن پر تھکی دیتے ہوئے فرمانے لگے:

’میزبانوں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ میں کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔

قسواء نے میرے سفر ہجرت میں مجھ سے اتنی وفاداری کی ہے کہ میں فیصلہ اسی پر چھوڑتا

ہوں،۔

پھر انھوں نے اپنی چھڑی ہو ا میں بلند کی اور فرمایا:

”قسواء جہاں جا کر رُکے گی، میں وہیں قیام کروں گا اور وہیں اپنی مسجد تعمیر کروں

گا“۔

ہم سب اپنے نبی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ قسواء جدھر جاتی ہم بھی جاتے۔ وہ

جدھر مڑتی، ہم بھی مڑ جاتے۔ باغوں، کھجوروں کے جھنڈوں، گلیوں میں سے گزرتی ہوئی

قسواء، ہو چار کے محلے سے بھی گزر گئی، جہاں حضور نے چھان میں چند سال بسر کئے تھے۔

چلتے چلتے ایک جگہ پہنچ کر قسواء رک گئی۔ میں نے فوراً چاروں طرف نظر دوڑائی، حضور کے

قیام اور مسجد کی مناسبت سے جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ قسواء کچھ دیروہاں کھڑی رہی۔ زمین پر پڑا

ایک پتہ دکھایا۔ ادھر ادھر دیکھا، کچھ سو گھا، اپنی ٹانگ کو کھجلا یا۔ ایک قدم پیچھے ہٹی، پھر بیٹھنے

کے لئے اپنی ٹانگیں دہری کیں مگر حضور نیچے نہیں اترے۔ بیٹھتے بیٹھتے وہ اچانک کھڑی ہو گئی

اور پھر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ ہم سب بھی چل پڑے۔ اتنے میں پیچھے سے میرے کان میں

قصواء جس جگہ بیٹھی تھی وہ بوجار کے محلے کا ایک احاطہ تھا۔ بوجار محمد کے ننھیالی عزیز تھے۔ حضور کے دادا عبدالمطلب کی والدہ اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ رشتہ قائم رہا۔ آپ کے چچا عباس جب کبھی تجارت کے سلسلے میں شمال کا سفر کرتے تو مدینے میں اپنے خاندان کے ساتھ چند روز ضرور قیام کرتے تھے۔

سید الانبیاء قصواء سے اترتے ہی اس احاطے کے طول و عرض کو نہایت غور سے دیکھنے لگے۔ ان کے ساتھ انھیں مدینے میں خوش آمدید کہنے والے مسلمانوں کا ایک ہجوم تھا مگر یوں لگتا تھا کہ اس وقت وہ سب کی موجودگی سے بے نیاز، بالکل تنہا ہیں۔ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے چاروں طرف نظریں دوڑا رہے تھے۔ اس احاطے میں ایک طرف ایک ہڈانے ٹوٹے پھوٹے گھر کا ملبہ بڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک کھلا ہوا میدان تھا جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں۔ اس میدان کے دوسری طرف ایک گوشے میں چند پرانی قبریں تھیں اور اس طرف جہاں قصواء بیٹھی تھی ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جو بوجار کے محلے کی مسجد کے طور پر کام آتا تھا۔ اس میں بیس پچیس نمازیوں کی گنجائش تھی۔ جگہ جگہ کھجوروں کے درخت لگے ہوئے تھے، کہیں کہیں خاردار جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ سب کی نظریں حضور کے روئے مبارک پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر شخص خاموش تھا۔ وہ احاطے کا جائزہ لے چکے تو انھوں نے ہجوم سے نظریں ملائیں۔ ایسے محسوس ہوا جیسے یکایک وہ کسی خواب سے چونک کر بیدار ہوئے ہیں۔ حاضرین نے انھیں اپنی طرف متوجہ دیکھا تو سب ایک ایک دو دو قدم ان کے قریب آگئے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ جگہ کس کی ہے۔ ایک شخص نے جواب دیا کہ رافع بن عمرو کے بیٹوں سل اور سہیل کی ملکیت ہے۔ رافع وفات پا چکے ہیں اور یہ دونوں یتیم بھائی خنزرج کے سعد بن زرارہ کی سرپرستی میں ہیں۔ یہاں یہ نماز کی جگہ سعد نے بنا رکھی ہے۔ سعد کچھ فاصلے پر کھڑے تھے اپنا نام سن کر آگے بڑھے تو آپ نے انھیں اپنے پاس بلا لیا اور فرمایا کہ اس احاطے

آواز آئی۔ مڑ کے دیکھا تو عبد اللہ بن ابی تھا جو کہہ رہا تھا:

”وہ میری توقع سے زیادہ ہوشیار نکلے۔ اونٹنی کے فیصلے سے کس کی دلآزاری ہو سکتی ہے۔“

قصواء دو قدم چلتی تھی تو میں چار۔ جب تک دنیا قائم ہے قصواء زندہ رہے گی۔ اس وقت بھی جب لوگ سکندر اعظم کے گھوڑے (Bucephalus) کو بھول چکے ہوں گے، جب کسی کو یاد بھی نہیں ہوگا کہ ایک (Incitatus) نامی گھوڑا بھی تھا جسے (Caligua) نے روم کا سینیٹر بنا دیا تھا۔ اس لئے کہ قصواء محمد کی لونٹنی تھی جس پر انھوں نے ہجرت فرمائی تھی۔ سفید رنگ، سوچتی ہوئی آنکھیں، بڑے بڑے نتھے، ستا ہوا جسم، قصواء اپنی جنس میں خوب صورتی کا مرقع تھی لیکن اس میں بھی ایک نقص تھا۔ اس کے بائیں کان کا سرا ذرا سا کترا ہوا تھا۔ بہت دن پہلے اونٹوں کی لڑائی میں ایک اونٹ نے اس کا کان چبا ڈالا تھا۔ باقی اس کا سارا جسم بے داغ تھا۔

تھوڑی دور چل کر قصواء واپس مڑی اور وہیں آگئی جہاں اس نے پہلے بیٹھنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے کناروں پر کھجوروں کے پانچ درخت تھے۔ ہم بہت غور سے قصواء کی ہر حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ آخر اسے ایک عظیم فیصلہ کرنا تھا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ پتہ نہیں یہاں بھی وہر کے گی یا نہیں۔ اتنے میں اس نے نہایت ڈر لائی انداز میں آہستہ آہستہ اپنے گھٹنے دوہرے کئے۔ ذرا آگے کو جھکی، پھر گردن اوپر اٹھائی، ایک طرف کو مڑی زمین کو کچھ دیر سو گھنٹی رہی، دم ہلا کر منکھیاں اڑائیں، ہلکی سی آواز میں بلبلائی، شمال کو یروشلم کی سمت دیکھا، پھر جھکی مگر اس دفعہ اس نے اپنا سارا بوجھ زمین پر ڈال دیا۔ اس بار حضور نے نیچے اتر آئے اور انھوں نے باوا بلند اعلان فرمایا:

”میں یہاں رہوں گا، یہیں میری مسجد بنے گی اور یہیں میں دفن ہوں گا۔“

کے وارثوں سے اس کی قیمت طے کروادیں۔ سل اور سہیل بھی وہیں موجود تھے۔ فوراً مجمع سے نکل کر رحمتِ عالم کے سامنے آکھڑے ہوئے اور نہایت ادب سے کہا:

”اے اللہ کے رسولؐ۔ یہ جگہ ہم آپ کی نذر کرتے ہیں۔ ہمیں کوئی

معاوضہ نہیں چاہئے۔“

حضورؐ نے یہ سن کر خوشی کا اظہار فرمایا مگر ان کے نزدیک مسجد نبوی اور نبی کی مستقل جائے سکونت، جسے پہلی مملکتِ اسلامیہ کا مرکز و محور بنا تھا، کسی کا عطیہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ہجرت وہ سنجیدہ اور تاریخ ساز واقعہ تھا کہ آپ نے ابو بکرؓ کی بے حد مخلصانہ اور مؤدبانہ درخواست کے باوجود قصواء کی قیمت ادا کرنے پر اصرار فرمایا تھا۔ چنانچہ سعدؓ کی مدد سے احاطے کی قیمت طے کر کے چکادی گئی۔ پہلی بیعتِ عقبہ کے بعد جب مصعب بن عمیرؓ کو مدینے کے نو مسلموں کو قرآن سکھانے کے لئے مدینے بھیجا گیا تھا تو سعد بن زرارہؓ نے انھیں مہمان رکھا تھا۔ سعدؓ اس بیعت سے ایک سال قبل مکے میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اس وقت مدینے کے صرف چھ لوگ ایمان لائے تھے جو سب خزرج کے تھے۔

قیمت کی ادائیگی کے دوران میں ابو ایوب خالدؓ قصواء کی طرف بڑھے اور اس پر لدا ہوا حضورؐ کا سامان اُتار کر اپنے گھر لے گئے جو اس احاطے سے بالکل متصل تھا۔ یہ وہی ابو ایوبؓ تھے جنہوں نے دوسری بیعتِ عقبہ میں اپنے قبیلے والوں میں سب سے پہلے بیعت کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس وقت بھی چند لوگوں نے رسول کریمؐ کو اپنے یہاں قیام کی دعوت دی لیکن انہوں نے مسکرا کر فرمایا کہ انسان کو اپنے سامان کے ساتھ ہی رہنا چاہئے۔ یہ کہہ کر وہ ابو ایوبؓ کے ہمراہ ان کے گھر تشریف لے گئے جہاں ابو ایوبؓ نے اپنے مکان کی چلی منزل ان کے لئے خالی کر دی اور خود اوپر کی منزل میں منتقل ہو گئے۔

سعد بن زرارہؓ کا گھر بھی قریب تھا۔ وہ قصواء کو اپنے گھر کے احاطے میں لے گئے۔

## تعمیر مسجد

دوسرے دن فجر کی نماز ختم ہوتے ہی ہم لوگوں نے کام شروع کر دیا۔ ہر شخص کا چہرہ جذبہٴ ایمانی سے دمک رہا تھا۔ اللہ کے رسولؐ نے خود ایک نیزے کی نوک سے زمین پر مسجد کی حدود کھینچ دیں۔ کھجوروں کے درخت قدرتی طور پر نہایت مناسب قاصلوں پر لگے ہوئے تھے معلوم ہوتا تھا اللہ تعالیٰ نے انھیں اسی مقصد کے لئے لگایا تھا کہ وہ ہماری مسجد کے ستونوں کا کام دے سکیں، اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہی نے قصواء کی رہبری فرمائی تھی جس کے نتیجے میں اس جگہ کا انتخاب ہوا تھا۔

حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے حدودِ مسجد کا نقشہ فرمادیا، تو یوں لگا جیسے مسجد ہمارے ذہنوں میں تعمیر ہو گئی۔ اب صرف یہ کام باقی تھا کہ جو مسجد ہمارے ذہنوں میں بن گئی تھی اسے زمیں پر منتقل کر دیں۔ ہم لوگ دیونہ وار کام میں جٹ گئے۔ ہر شخص کام میں ایک



دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا تھا۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی ہم نے اینٹیں بنائیں، پتھر ڈھوئے، لکڑی چری، گار املایا، جھاڑ جھنکار کاٹے، زمین کو ہموار کیا، بنیادیں کھودیں، سیڑھیاں بنائیں۔ اُن پر چڑھ چڑھ کر اینٹ گار اوپر پہنچایا، رے سے باندھے، ٹھوک پیٹ کی اور سب کچھ اس خوش دلی کے ساتھ کہ ہمیں لگتا تھا ہم کام نہیں کر رہے، رقص کر رہے ہیں۔ اسی موقع پر عبداللہ بن رواحہؓ نے دو شعر کہے جنہیں ہم نے اپنے کام کا ترانہ بنا لیا۔ خود نبیؐ بھی ہمارے ساتھ صدم بلند کر رہے تھے۔ وہ شعر کچھ یوں تھے۔

نیکی وہی جو روزِ قیامت کو ہو شمار  
تو سب کا مددگار، مہاجر ہو کہ انصار  
ہے زندگی تو اصل میں عقبیٰ کی زندگی  
انصار و مہاجر تری رحمت کے طلب گار

سرورِ دو جہاں اُس کام میں ہمارے ساتھ برابر شریک رہے۔ خود اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے اور سیڑھیوں پر چڑھ چڑھ کر، پتھر، اینٹیں، گار، مسالا اوپر پہنچاتے۔ وہ جو کام بھی کرتے مدینے کے چھوٹے چھوٹے چھانچے اُن کی مدد کے لئے اُن کے ساتھ ساتھ ہو لیتے۔ ظاہر ہے جوں کا یہ کام نہیں تھا۔ کام میں مدد ہونے کی جائے، کام بجا جاتا تھا مگر حضورؐ اُن کی دل شکنی نہیں فرماتے تھے۔ اُنھیں جو جس سے اتنا پیار تھا کہ ایک ایک کام کئی کئی بار کر لیتے مگر اُن کو منع نہیں کرتے تھے۔ میں نے اُن کے کام میں خلل پڑتے دیکھا تو میں اپنا کام چھوڑ کر گیا اور جو جس کو منع کرنے کی کوشش کی مگر حضورؐ نے انہیں میرے سر مڑھ دیا۔ فرمانے لگے:

”جو دیکھو بلال بے چارہ اکیلا کام کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں۔  
ذرا اُس کی مدد کر دو۔“

یہ سننا تھا کہ سارے میرے گرد ہو گئے اور مجھے اُن سے پچھا چھڑانے کے لئے ایک

درخت پر چڑھنا پڑا۔ حضورؐ اپنا پسینہ بھی پونچھتے جاتے تھے اور میری حالت پر تبسم بھی فرماتے جاتے تھے۔

ایک دفعہ اُنھوں نے ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھا لیا جو ابھی ٹھیک طرح سے چل بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پتھر دیا اور اپنے کندھوں سے اونچا کر کے اُسے کہا کہ یہ پتھر دیوار میں لگا دو۔ بچے نے پتھر لگا دیا تو حضورؐ نے فرمایا:

”شبابش! اب تم اپنے سارے دوستوں کو بتانا کہ یہ مسجد میں نے بنائی ہے۔“

یہ کہہ کر اُنھوں نے اُسے زمین پر کھڑا کر دیا اور وہ ڈنگ گاتا ہوا اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس کے سارے چہرے پر، ایک کان سے دوسرے کان تک، مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ خوشی سے اُس کا چہرہ تہمتار ہا تھا۔ مجھے وہ خوش نصیب بچہ اکثر یاد آتا ہے۔ ہنستا ہوا معصوم چہرہ، دائیں گال پر گارے کی لکیر بنی ہوئی، پتہ نہیں وہ کون تھا، کس قبیلے، کس خاندان کا تھا، بڑا ہو کر کیا بنا، آج کل کس حال میں ہو گا۔

سب نبی اکرمؐ کو آرام کرنے کے لئے کہتے تھے مگر وہ کسی کی نہیں سنتے تھے، کہتے تھے مجھے بھی ثواب کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی آپ سب کو۔ حمزہؓ نے بطور خاص اُن سے پل ہر آرام کی درخواست کی تو اینٹیں اٹھاتے اٹھاتے اُنھوں نے اپنی عباس زور سے جھٹکی کہ اس پر بڑی ہوئی ریت اُڑ کر حمزہؓ کے چہرے پر جا پڑی اور وہ دامن سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے واپس آ گئے۔ اس کے بعد اُنھوں نے اُنھیں کبھی کام سے نہیں روکا لیکن کام کرتے وقت اُن کی نظریں ہمیشہ اُنھیں کی طرف رہتی تھیں۔ اُن کی کیا ہم سب کی۔

وہ ہمیشہ سکھاتے تھے کہ کام ایک طرح کی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کام کرنے والے ہاتھوں سے پیار کرتا ہے۔ اُن کی ساری تعلیم یونہی چلتے جاتے، باتوں باتوں میں ہوتی تھی اور اسی لئے زندگی سے بے حد قریب تھی۔ کسی جانور پر زیادہ بوجھ لدا دیکھتے تو پیشانی پر شکن آ

جانی۔ فوراً ہذا صگی کا اکتھا فرماتے جانوروں پر ظلم ان کی برداشت سے باہر تھا۔  
 آخر ایک دن آیا کہ ہادی مسجد تعمیر ہو گئی۔ کچھ عرصے پر کھجور کے تنوں کے شہتروں  
 پر کھجور کی شاخوں کی چھت پڑی ہوئی، چھت کا وزن کھجوروں کے تنوں پر تھا جو ستونوں کا کام  
 دے رہے تھے۔ زیادہ حصہ کھلا تھا، ایک بڑے محن کی شکل میں۔ شمالی دیوار میں جائے امامت  
 کے سامنے دونوں طرف پتھر چن دئے گئے تھے۔ یہ یرو عظیم کا رخ تھا۔ ہمارا قبلہ اول۔  
 اگلے سال رجب شعبان کے دن تھے، رسالتآب مدینے کے نواح میں انصار کے  
 قبیلے ہو سکے کی مسجد میں طہر کی نماز پڑھا رہے تھے، دور کعتیں ہو چکی تھیں کہ ایک وحی نازل  
 ہوئی جس کی تعمیل میں آنحضرت نے حالت نماز ہی میں بیت اللہ کی سمت رخ کر لیا اور ان کے  
 ساتھ ہی سب مقتدیوں نے باقی دور کعتیں بیت اللہ کی سمت لو فرمائیں۔ اسی دن مسجد نبوی  
 میں بھی عصر سے پہلے قبلہ کا رخ بدل دیا گیا۔

## مواخات

مسجد کی تعمیر مکمل ہوتے ہی ہم سب کو ماجرین کی آباد کاری کی فکر لاحق ہو گئی۔  
 ہجرت کرنے والوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ یہ کوئی بہت بڑی تعداد نہیں تھی،  
 لیکن مدینہ خود ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ اُس کے وسائل اس قدر محدود تھے کہ ہر ماجر کے لئے  
 مستقل گزر بسر کا خاطر خواہ انتظام ایک شدید مسئلہ بن گیا تھا۔ ماجرین میں بہت تھوڑے  
 تھے جو اللہ کے کرم سے خود کفیل تھے۔ بیشتر ایسے تھے جو مکے سے لئے پئے، بے سرو سامان  
 محض تن کے کپڑوں کے ساتھ دعوت ہجرت پر لبیک کہتے ہوئے اپنا گھربار، کاروبار، مال  
 متاع چھوڑ چھاڑا اللہ تبارک و تعالیٰ کے بھروسے پر مدینے آئے تھے۔ مکے جیسے تجارتی شہر  
 میں ساری عمر گزارنے کے بعد ایک زرعی شہر میں آئے کے اپنے مسائل تھے۔ پھر دونوں  
 شہروں میں موسم اور آب و ہوا کا بڑا فرق تھا۔ ماجرین کی معاشی، سماجی، نفسیاتی حالی شب و  
 روز کا موضوع گفتگو بن گیا تھا۔ جہاں چار شخص جمع ہو جاتے گفتگو اسی بنیادی نکتے پر آٹھرتی

کہ اتنے گھیر مسائل کیسے سلجھیں گے لیکن اللہ کے رسولؐ نے یہ ساری مشکلات اپنی پیغمبرانہ فراست سے آں واحد میں حل کر دیں۔

ایک روز انہوں نے مکے سے آئے ہوئے تمام خاندانوں کے سربراہوں کو انس بن مالکؓ کی والدہ امّ سلمہؓ کے گھر بلوایا اور ساتھی ہی مدینے کے چند نسبتاً خوش حال لوگوں کو بھی دعوت دی۔ وقت مقررہ پر سب امّ سلمہؓ کے گھر کے وسیع و عریض احاطے میں جمع ہو گئے۔ حضورؐ تشریف لائے۔ حسب عادت سب کو مسکرا کر دیکھا اور انصار کو مخاطب کرتے ہوئے مہاجرین کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ سب آپ کے دینی بھائی ہیں اور اسی دین برحق کے نام پر، جو آپ کا بھی دین ہے، اپنا سب کچھ تہ تیغ کر یہاں آئے ہیں۔ ان کی مدد آپ کا فرض ہے۔ پھر آپ نے تجویز پیش فرمائی کہ انصار کا ہر خاندان مکے کے ایک خاندان کو اپنے خاندان میں شامل کر لے، اس کے دکھ سکھ میں شریک ہو جائے اور حسب مقدور اس کا بوجھ بٹالے۔ مواخات کا یہ فیصلہ اسلام کے سبق اخوت کا سب سے بڑا عملی مظاہرہ تھا جسے دنیا نے آج سے پہلے اس پیمانے پر کبھی نہیں دیکھا تھا، اور یہ شرف امّ سلمہؓ کے حصے میں آیا کہ سرور کائناتؐ نے اس عظیم تاریخی فیصلے کے لئے ان کے گھر کا انتخاب کیا۔ یہ کوئی جزوقتی، سطحی، عارضی مصلحت کیسی نہیں تھی۔ مہاجر و انصار دونوں نے اپنے آقاؐ کے قائم کیے ہوئے اس رشتے کی ایسی لاج بھائی کہ مرتے دم تک یہ بدھن نہ ٹوٹا۔ اسی طرح چھوٹے پیمانے پر مساکین کی آباد کاری کے حل کے لئے مکے میں بھی حضورؐ کے حکم پر اخوت کا ایسا ہی منصوبہ تیار ہوا تھا جہاں حمزہؓ زیدؓ کے بھائی بنے تھے، ابو بکرؓ، عمرؓ کے، عثمانؓ، عبدالرحمان بن عوفؓ کے، زید بن العوامؓ، عبداللہ بن مسعودؓ کے۔ مگر آج کی مواخات علی الحق اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنے دور رس نتائج کی حامل ہوئی کہ مکے کی مواخات کا اس سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مواخات ایک نظریاتی تعلق تھا جو رنگ، نسل

اور قبائلی عصبیت کے تمام اختلافات اور امتیازات سے بالاتر تھا اور جو صرف اور صرف رضائے رسولؐ اور دین حق سے وابستگی کی بنیاد پر قائم تھا۔ جب رسول اکرمؐ ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری خاندان کو مواخات کی تسبیح میں پرورہے تھے، میں بھی ایک طرف کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ میں ایک حبشی جو کل تک ایک معمولی غلام تھا خود ہی اپنا خاندان تھا، خود ہی خاندان کا سربراہ۔ غلاموں کے کون سے خاندان ہوتے ہیں؟ مجھ پر نظر پڑی تو پاس بلا کر میرا ہاتھ ابو رویحہ انصاری کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس طرح ہم دونوں بھائی بن گئے ہم ایک دوسرے سے گلے ملے اور گلے ملتے ہی یوں لگا جیسے ہمارا رشتہ خون رشتوں سے بھی زیادہ گہرا ہو گیا۔ ایک مستقل رشتہ جسے دم کے ساتھ نبھانا تھا۔

مواخات کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ مکے کے مہاجر اب اپنا سارا بوجھ مدینے والوں پر ڈال کر بے فکر ہو جائیں گے اور مفت خور مہمانوں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ مہمان نوازی کا وقت گزر چکا تھا۔ ہادی برحقؐ نے اس رشتے کی وضاحت فرمائی کہ اب تک جو ایک تھا وہ دو ہو گیا۔ جو دو تھے وہ اب چار ہو گئے۔ جہاں ایک کھاتا تھا، اب دو کھائیں گے۔ جہاں دو محنت کرتے تھے چار محنت کریں گے۔ کام زیادہ ہو گا تو آمدنی بھی زیادہ ہوگی اور یوں کوئی کسی پر بار نہیں بنے گا۔ اس طرح کئی سو خاندان ایک لمحے میں گزر بسر کے وسائل حاصل کرنے کے اہل ہو گئے اور پھر یہ سوال ہی نہ رہا کہ کون کس کا بوجھ اٹھا رہا ہے، کون مہاجر ہے کون انصار۔ یہ تفریق ہی مٹ گئی۔

• ارقمؓ، ابو طلحہؓ زید بن سلّؓ کے بھائی بنے۔ عثمان بن مظعونؓ کی مواخات ابو الہیثم بن التہیانؓ سے ہوئی۔ زبیر بن العوامؓ کا ہاتھ سلمہ بن سلامہؓ کے ہاتھ میں دیا گیا۔ دونوں اُس وقت جوان تھے، یہی کوئی ستائیس اٹھائیس سال کے۔ ایک اور نوجوان طلحہؓ جو اس وقت تقریباً چوبیس سال کے تھے اپنے ہم عمر امی ابن کعبؓ کے ساتھ رشتہ اخوت

میں پروئے گئے۔ عبدالرحمن بن عوفؓ، سعد بن الربیعؓ کے بھائی بنے۔ سعد انصار میں سب سے زیادہ مالدار اور فیاض مانے جاتے تھے۔

سرور کائناتؐ کے اشاروں پر دونوں طرف سے ایک ایک شخص آگے بڑھتا جاتا تھا اور حضورؐ اپنے دست مبارک سے اُن کے ہاتھ ملواتے جاتے تھے۔ اور باقاعدہ بیعت لیتے جاتے تھے۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ آگے بڑھے تو ان کا ہاتھ ابن معاذؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ سعید بن زیدؓ، رافع بن مالکؓ کے بھائی بن گئے۔ عبد اللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ سے منسلک ہو گئے۔ اسی طرح عمار بن یاسرؓ اور حذیفہ بن الیمانؓ، صہیب بن سنانؓ اور حارث بن السحمہؓ، محرز بن فضالہؓ جنھیں سب انحرام اسدی کہتے تھے اور عمار بن حزم مواخات کے رشتوں میں پروئے گئے۔ شماس بن عثمانؓ نہایت خوب و نوجوان تھے اُن کا رشتہ مواخات اُن کے ہم عمر نوجوان حظلہ ابن ابی عامرؓ سے طے ہوا۔ عمیر بن ابی وقاصؓ اُس وقت کوئی چودہ سال کے تھے۔ رسالتآبؐ نے ان کا ہاتھ عبدالاشہل قبیلے کے رئیس سعد بن معاذؓ کے چھوٹے بھائی عمرو بن معاذؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اُن کی بھی تقریباً یہی عمر تھی۔ یہ عمیر بن ابی وقاصؓ وہی نوجوان تھے جن کو صغریٰ کی وجہ سے غزوہ بدر میں شرکت کی اجازت نہیں ملی تھی۔ لیکن اُن کی گریہ و زاری دیکھ کر حضورؐ نے نہ صرف انھیں اجازت مرحمت فرمائی بلکہ اپنے دست مبارک سے انھیں تلواریں باندھی۔ بدر میں یہ نوجوان صحابی رتبہ شہادت پر سرفراز ہوئے۔

اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے ہادی برحقؐ نے کسی کے ساتھ مواخات نہیں فرمائی۔ کیونکہ مواخات کوئی آئی جانی چیز نہیں تھی، کوئی ایسا تعلق نہیں تھا کہ رہا رہا نہ رہا نہ رہا۔ یہ ایک مستقل رشتہ تھا۔ ایک ایسا معاملہ جس میں حضورؐ خود کو منسلک فرما لیتے تو یا اوس کے کھلانے لگتے یا خزرج کے۔ اور ان کے منصبِ جلیلہ کی مرکزی حیثیت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ

نہ اوس کو خزرج پر ترجیح دیں نہ خزرج کو اوس پر۔ ایسے نازک اور لطیف توازن حضورؐ ہمیشہ قائم رکھتے تھے۔ قبا کے قیام کے سلسلے میں بھی یہی لطیف توازن مد نظر تھا آپؐ نے اوس کے بزرگ کلثوم بن ہدمؓ کو اس لئے شرفِ میزبانی عطا تھا کہ ابو بکرؓ خزرج کے یہاں ممان تھے اور یوں قبیلہ خزرج میں خاصی موقر سطح پر سماجی مرکز کی نمائندگی ہو چکی تھی۔

ابو رویحہؓ، رطل بن ارجیمؓ انھیں خوش رکھے۔ بلوی خوبیاں کے مالک ہیں۔ عیسیٰ دمشق میں میرے قریب ہی رہتے ہیں۔ بلے کئے سننے کے بعد مدینے سے آنے پر رضامند ہوئے۔ اُن کے لئے امیر المؤمنین سے باقاعدہ اجازت لی، جیسی میں نے اپنے لئے لی تھی۔ بے حد ایثار پسند۔ میرے لئے انھوں نے جو کچھ کیا اور جس طرح سے انھوں نے میری دلجوئی کی اور ہر موقع پر جس طرح میرے دست و پاڑونے اس کا اجرا انھیں اللہ تبارک و تعالیٰ سے ملے گا۔ شام کی مہم کے موقع پر میں مدینے سے روانہ ہونے لگا تو حضرت عمرؓ نے مجھ سے پوچھا کہ بلال تم چلے جاؤ گے تو تمہارا وظیفہ کون وصول کرے گا۔ میں نے ابو رویحہؓ کا نام لیا۔ وہ ایک مدت تک میری طرف سے یہ ذمے داری نبھاتے رہے۔

آج کل تو زیادہ وقت یاد الہی میں گزارتے ہیں۔ کبھی کبھار میرے یہاں آجاتے ہیں یا میں اُن کے یہاں چلا جاتا ہوں۔ نہایت کھرے، سچے، خوش اخلاق اور نفیس مزاج انسان ہیں۔ جس دن سے رسول کریمؐ نے میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیا ہے ہم ایسے ہو گئے ہیں جیسے ایک درخت کی دو شاخیں جو باہم ایک دوسرے میں پیوست رہتی ہیں۔ اللہ نے اس رشتے کی برکت سے ہم دونوں کو بہت نوازا، عیسیٰ رحمتیں نازل فرمائیں ہم پر۔ جی چاہتا ہے جس طرح ہم دونوں کو اس دنیا میں رفاقت نصیب ہوئی ہے اسی طرح آخرت میں بھی اسی رحیم ہمیں ایک دوسرے کے قریب رکھے۔ آمین۔

## پہلی اذان

مدینے میں ہماری مسجد سے بہتر نبی ہوئی کئی عمارتیں تھیں مگر ہم لوگ کون سے فنِ تعمیر کے ماہر تھے۔ ہمیں تو یہ عمارت ساری دنیا کی عمارتوں سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ مقصد تو صرف یہ تھا کہ اپنی عبادت کے لئے ایک موزوں جگہ بنالی جائے۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ یہی مسجد ایک دن اسلامی تمدن اور ریاست کا سرچشمہ بنے گی۔ مسجد جس دن مکمل ہوئی ہم لوگ تھک ہار کے مسجد کے فرش پر بیٹھ کر آرام کرنے لگے۔ ہلکی ہلکی دھوپ چھتر پر پڑے ہوئے کھجوروں کے پتوں کے درمیان سے چھن چھن کر نیچے آرہی تھی۔ سبز پتوں کا سایہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ ہر شخص مسجد کی تعمیر کے مختلف مراحل پر اور ساخت کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کر رہا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ اتنے میں جہاں تک مجھے یاد ہے علیؑ نے کہا:

”میرے خیال میں مسجد میں ایک کمی ہے۔“

سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے نوپر چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”وہاں کچھ ہونا چاہئے۔ کچھ ایسا انتقام جس سے لوگوں کو نماز کے لئے بلایا جاسکے۔“

اس پر عمارؓ نے:

”میرے خیال میں ہم وہاں ایک جھنڈا لگادیں۔ نماز کے وقت لگادیا، پھر اتار لیا۔“  
اب سب اٹھ کر بیٹھ گئے اور گھنگو میں شامل ہو گئے۔ رسول کریمؐ یہ سب گھنگو نماز و لچھی سے سنتے رہے مگر خود کچھ نہیں بولے۔ ان کا انداز ایسا تھا گویا وہ گھنگو میں شریک ہیں بھی اور نہیں بھی۔

”ہم چھت پر گھنٹیاں کیوں نہ لگادیں۔“

”گھنٹیاں تو کلیساؤں میں لگاتے ہیں۔“

”نقارہ لگانا چاہئے۔“

”نقارہ جنگ اور خون کی یاد دلاتا ہے۔ ہمارا لوین امن اور سلامتی کا دین ہے۔“

”قرنا مناسب رہے گا، اس کی آواز بہت دور تک جاتی ہے۔“

”قرنے کی آواز سے مینڈھاڑ بن میں آجاتا ہے جس کے سینگ سے وہ بیٹا ہے۔“

پھر خاموشی چھا گئی۔ جھنڈے، گھنٹیاں، نقارہ، قرنا کوئی بھی ان تجویز سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ گھنٹیاں دیر تک کانوں میں گھنٹھاتی رہتی ہیں، نقارہ دوران خون کو تیز کر دیتا ہے، جھنڈا ہوا کے زرخ پر اڑتا ہے اور مخالف سمت سے نظر ہی نہیں آتا۔ پھر جھنڈا سوتے ہوؤں کو کیسے جگانے گا۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ عبداللہ بن زیدؓ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے کھٹکتے ہوئے

آگے آرہے ہیں۔ عبداللہؓ انصار کی طرف سے مسجد کی تعمیر میں شامل تھے۔ میں نے انہیں دوسری بیعت عقبہ کے موقع پر بھی دیکھا تھا۔ وہ ان پتھرت آدمیوں کے وفد میں شامل تھے جو مدینے سے آیا تھا۔ شرمیلے اتنے تھے کہ ڈرتے تھے ہوا بھی ان کی حرکت سے مرتعش نہ ہو جائے مگر خزرج کا یہ شرمیلا نوجوان اگلے ہی لمحے ساری کائنات کو مرتعش کرنے والا تھا۔ میں حضور اکرمؐ کے پاس بیٹھا تھا۔ جب مجھے لگا کہ عبداللہؓ حضورؐ کو کچھ کہنا چاہ رہے ہیں تو میں نے انہیں اپنی جگہ دے دی تاکہ وہ جو کہنا چاہ رہے ہیں، اطمینان سے کہہ لیں۔ انہوں نے نہایت دھیمی آواز سے کہا:

”یا رسول اللہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ سبز کپڑے پہنے ہوئے ایک شخص ہاتھ میں ناقوس لئے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا اے اللہ کے بندے کیا تم مجھے یہ ناقوس بیچ دو گے۔ اُس سبز پوش نے پوچھا کیا کرو گے اس کا۔؟ میں نے جواب دیا، اسے جا کر لوگوں کو نماز کے لئے بلاؤں گا۔ اس پر اس نے کہا نماز کے لئے بلانے کا میں تمہیں اس سے بہتر طریقہ بتاتا ہوں۔ تم یہ کہا کرو:

اللہ اکبر اللہ اکبر

اللہ اکبر اللہ اکبر

اشھدان لا الہ الا اللہ

اشھدان لا الہ الا اللہ

اشھدان محمد رسول اللہ

اشھدان محمد رسول اللہ

حی علی الصلوٰۃ

حی علی الصلوۃ  
حی علی الفلاح  
حی علی الفلاح  
اللہ اکبر اللہ اکبر  
لا الہ الا اللہ

میں نے رسول اللہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس سے ایک دو روز پہلے عمرؓ نے بھی اسی قسم کا خواب حضورؐ کو سنایا تھا مگر آپ نے کوئی فیصلہ نہیں صادر فرمایا تھا۔ لکن زیدؓ کی زبان سے وہی خواب سُن کر حضورؐ نے اسے تائید ایزدی سمجھ کر قبول فرمایا۔ کہنے لگے:

”عبداللہ، تمہارا خواب سچا ہے۔ ایسا ہی ہو گا۔ نماز کے لئے اسی طرح بلایا جانا کرے گا۔ کوئی شخص یہ الفاظ کہا کرے گا۔“

یہ طے ہو گیا تو اب سوال یہ تھا کہ یہ الفاظ کس انداز میں، کیسے ادا کیے جائیں گے۔ بیٹھے لہجے میں، نرم لہجے میں، اعلانیہ انداز میں، کتنی زور سے، مرد کی آواز میں، عورت کی آواز میں، بچے کی آواز میں، کسی نوجوان کی آواز میں، کسی بزرگ کی آواز میں یا بیک وقت کئی لوگوں کی آواز میں!

”بلال تمہاری آواز میں۔“

حضورؐ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا:  
”عبداللہ تم بلال کو یہ الفاظ یاد کرادو۔“

مسجد میں بیٹھے ہوئے سارے لوگوں کی نگاہیں مجھ پر تھیں۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر میں ابھی تک حضورؐ کے فیصلے کے سحر میں تھا۔ مجھے کچھ سناٹی نہیں دے رہا تھا۔ یکایک

حضورؐ کے الفاظ کا مفہوم مجھ پر پوری طرح واضح ہو گیا۔ مجھ ناچیز سیاہ قام حبشی کے ذمے یہ خدمت سپرد کی گئی تھی کہ میں مسلمانوں کو نماز کی سعادت کے لئے بلایا کروں۔ یہ خود میرے لئے کتنی بڑی سعادت تھی۔ پھر حضورؐ کی آواز ابھری:

”بلال تمہاری آواز سب سے اچھی ہے۔ اسے اللہ کی راہ میں استعمال کرو۔“

زیدؓ جو میرے پاس ہی بیٹھے تھے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے:

”کاش میرے پاس اسلام کو دینے کے لئے کوئی ایسا شخص ہوتا۔“

یہ زید بن حارثہؓ کے الفاظ تھے جنہوں نے اسلام کو اتنا کچھ دیا تھا۔ بعد میں اکثر جب میں لڑان کے لئے کھڑا ہوتا تھا زیدؓ کے یہ الفاظ میرے ذہن میں جاگ اٹھتے تھے۔ انہی باتوں میں نماز کا وقت ہو گیا تو اللہ کے رسولؐ نے مجھے حکم دیا۔

”جاؤ اس چھت پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے لوگوں کو نماز کے لئے بلاؤ۔“

جس چھت کی طرف انہوں نے اشارہ فرمایا تھا وہ مسجد سے ملحق ہو چار کی ایک خاتون کے کپے گھر کی کچی چھت تھی۔ آج کل مسجدوں میں مؤذن کے لئے کیا کیا انتظام ہوتے ہیں۔ کچی سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں اور مؤذن نہایت آرام سے اُن پر چڑھ کر اذان دیتا ہے۔ میں حسب حکم جوں توں کر کے اُس چھت پر چڑھ گیا مگر میں پھر بھی اطراف میں لگے ہوئے کئی کھجور کے درختوں سے بچا تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ عبداللہؓ کے بتائے ہوئے الفاظ میرے ذہن میں نہیں آرہے تھے۔ سب لوگ مسجد کے صحن سے، جہاں چھت نہیں تھی، میری طرف دیکھ رہے تھے اور منتظر تھے۔ مگر وہ الفاظ، پہلے کیا تھا، اللہ کی توصیف، پیغمبر اسلامؐ کی شہادت، نماز کی دعوت سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ سب مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ رسالت مآبؐ تیسرے ستون کے پاس کھڑے تھے۔ اُن کی نظریں بھی مجھ پر تھیں۔ ابو بکرؓ اور عمرؓ اُن کے قریب کھڑے تھے۔ عمرؓ تو یوں لگتا تھا کہ

آدھے ستون تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اُن کے ساتھ سعد بن عقیقہؓ تھے جنہوں نے مدینے آمد پر مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھہرایا تھا۔ پھر نبی کریمؐ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور مجھے اس انداز سے اشارہ کیا گویا مجھے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر بلند کر رہے ہوں۔ اسی لمحے مجھے اپنی آواز سنائی دی۔ پہلے بہت دُور سے اور پھر آہستہ آہستہ قریب آتی ہوئی۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر

اللہ اکبر، اللہ اکبر

اشھدان لا الہ الا اللہ

اشھدان لا الہ الا اللہ

اشھدان محمدؐ رسول اللہ

اشھدان محمدؐ رسول اللہ

حی علی الصلوٰۃ

حی علی الصلوٰۃ

حی علی الفلاح

حی علی الفلاح

اللہ اکبر، اللہ اکبر

لا الہ الا اللہ

تمام عالم اسلام میں ہر روز پانچ دفعہ یہ الفاظ فضا میں گونجتے ہیں بلکہ مختلف ملکوں میں طلوع و غروب کے اوقات کے فرق کی وجہ سے شاید ہی کوئی لمحہ ایسا ہو جب دنیا کے کسی نہ کسی حصے سے اذان کی آواز نہ بلند ہو رہی ہو۔ مگر یہ ہماری پہلی اذان تھی۔ میں اذان دے کر نیچے اترتا تو حضورؐ نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ اللہ کا رسولؐ اور ایک غلام زادہ۔ چاروں طرف

لوگ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ اذان کی آواز سن کر محلے کے بہت سے بچے اکٹھے ہو گئے تھے جنہوں نے مجھے چھت پر کھڑے دیکھا اور اب میری طرف اشارے کر کر کے ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اُن کے لئے یہ ایک عجوبہ تھا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ بہت دیر تک حضورؐ نے کچھ نہیں فرمایا۔ میں بھی ایک عجیب سُور سے سرشار تھا۔ اتنے میں میں اُن کی آواز پر چونکا:

”بلال، تم نے میری مسجد مکمل کر دی۔“

ان الفاظ پر میں نے وہیں شکرانے کے دو نفل ادا کیے۔ بلال حبشی نے اپنی زندگی کا مقصد پایا تھا۔ لوگ اگر میرے بارے میں سب کچھ فراموش کر دیں، اور ویسے بھی میرے پاس یاد رکھے جانے کی کیا بات ہے، مگر پھر بھی میں اسلام کے پہلے مؤذن کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جاؤں گا۔



## پہلی اسلامی مملکت

مدینے میں ہجرت سے پہلے کوئی مملکت نہیں تھی کہ نظم و نسق کے لئے پہلے سے بنے ہوئے قوانین اور قواعد میں تھوڑا بہت رد و بدل کر کے کام چلا لیا جاتا۔ صرف قبیلے ہی قبیلے تھے جو ایک دوسرے سے سر بہ گریباں رہتے تھے۔ باہمی حسد اور بغض و عناد اتنے گہرے تھے کہ ان کی تمام صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ پھر یہاں غیر مسلم بھی آباد تھے۔ مدینہ کئی خوش حال یہودی قبائل کا گھر تھا۔ مذہبی بنیادوں پر قائم ہونے والی مملکت میں غیر مسلموں کے ساتھ بطور خاص کوئی مناسب معاملہ ضروری تھا۔ منافق بھی تھے، کمزور ایمان والے بھی۔ ایسے بھی جو ذرا فاصلے سے نئی صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ سب کے لئے اتنا نیا، اتنا چونکا دینے والا، اور اکثر کے لئے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ نئے حالات سے نپٹنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ صرف ایک بات سب جانتے تھے کہ اب حالات حسب سابق ہر گز نہیں رہیں گے۔

سے وظیفہ دیا جاتا تھا۔

امور مملکت کا بوجھ آپڑا تو چند ہی ماہ میں ہماری تعمیر کی ہوئی مسجد ناکافی ہو گئی کیونکہ یہ صرف ہماری جائے عبادت نہیں تھی بلکہ مدینے میں قائم ہونے والی پہلی مملکت اسلامیہ کا صدر دفتر اور تمام ملت اسلامیہ کا دینی اور سیاسی مرکز و محور بھی تھی۔ چنانچہ مسجد کی توسیع کے لئے ہم ایک بار پھر کمر بستہ ہو گئے۔ یہ توسیع اس لئے بھی ضروری تھی کہ قریبی محلوں میں جو مسلمان اپنی چھوٹی چھوٹی مساجد میں نماز ادا کرتے تھے، اللہ کے رسول کی امامت میں نماز کی سعادت حاصل کرنے بہت بڑی تعداد میں ہماری مرکزی مسجد میں آنے لگے تھے۔ ساتھ ہی رسول اللہ کے رہنے کا مسئلہ تھا۔ اُمّ المؤمنین حضرت سودا اور حضور کی صاحبزادیاں اُمّ کلثوم اور فاطمہؓ ساتھ تھیں۔ ابھی تک آپ ایوب خالد کے مہمان تھے۔ چنانچہ مسجد میں توسیع ہوئی اور ساتھ ہی چار حجرے تعمیر کیے گئے۔ ایک سودا کے لئے، ایک اُمّ کلثوم، اور فاطمہ کے لئے، ایک عائشہ کے لئے جن کی رخصت کے دن قریب آرہے تھے اور ایک حجرہ سرکاری خزانے کے لئے جس میں سرکاری رقم اور سرکاری ملکیت کی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ یہ حجرہ مہقل رہتا تھا۔ حضور نے حکومت کی آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب میرے سپرد فرما دیا تھا۔ گویا مجھے دنیا کی پہلی اسلامی مملکت کا پہلا وزیر خزانہ بنا دیا گیا تھا۔ بہت بڑی سعادت تھی یہ مجھ غلام زادے کی کہ مجھے اتنی بڑی ذمے داری سونپی گئی۔ مؤذن کی حیثیت سے تو میرے ساتھ میرے محترم بزرگ ابن اُمّ کلثوم بھی تھے لیکن اس نئے فرض منصبی میں کوئی میرا کوئی شریک کار نہیں تھا اس سرور عالم کی رہنمائی شامل تھی جس سے میں اپنی ذمے داری سے عمدہ برآہو جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو یہ کام مجھے بہت مشکل نظر آیا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا نبی کریم کی توجہ سے میری پریشانیاں کم ہوتی گئیں۔

ابدا میں میری مشکل یہ تھی کہ آمدنی کے نہ ذرائع معین تھے نہ مقدار۔ یہ بھی

سب سے پہلے تو نبی کریم نے ایک ایک کر کے سب قبائلی سرداروں سے ملاقاتیں کی۔ انھیں مل جل کر رہنے کی افادیت کا قائل کیا۔ پھر سب کے ایمان پر انھوں نے اس نئی شہری مملکت کا سربراہ اعلیٰ بنا قبول فرمایا۔ اس کے بعد اپنی فراست اور سب کی رضامندی سے ایک دستور مرتب کیا جو دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور تھا۔ میرا ایمان ہے کہ پہلی اسلامی مملکت کا یہ دستور اب تک انسانی زندگی کی تہذیب کرتا رہے گا۔

سرکاری امور بڑھے اور نوزائیدہ مملکت کے مسائل نے سر اٹھایا تو رسول اکرم نے فوج، عدلیہ، انتظامیہ، خزانہ، درس و تدریس، تجارت، خارجی امور وغیرہ کے ادارے قائم کئے اور ہر شعبے میں ایسی راہیں کشادہ فرمائیں جن میں باطنی جامعیت کے ساتھ ساتھ معاش اور معاشرتی عدل تھا، جو ایسے متوازن تصور حیات کی عکاس تھیں کہ اس کے سامنے زندگی کا ہر متبادل تصور، ہیچ دکھائی دیتا تھا اور جس میں رہتی دنیا تک ہر دور کے مسائل کو سلجھانے کی صلاحیت تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ زندگی کا کاروبار تو اس سے پہلے بھی جیسے تیسے گھسٹ رہا تھا لیکن زندگی کو قرینے اور سلیقے سے گزارنے کی راہیں نکلیں تو کایا ہی پلٹ گئی۔

سب سے پہلے حضور نے کاتبوں کی ایک بڑی تعداد جمع کی اور ان کو مختلف شعبوں کے امور کی تفصیلات اور کوائف کی تحریر کا کام سپرد فرمایا۔ کچھ لوگ کاتب وحی تھے، کچھ آمدنی کا اندراج کرتے تھے کہ کس کس نے، کب کب، کتنی کتنی رقم یا جنس سرکاری خزانے میں جمع کرائی، مال غنیمت کتنا آیا اور کیسے کیسے خرچ ہوا۔ کچھ سرکاری خزانے سے پنشن پانے والوں کی تفصیلات کا ریکارڈ رکھتے تھے۔ ایک کاتب کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ ان بالغ لوگوں کی فہرستیں مرتب کرے جو جنگ کے لئے موزوں بھی ہیں اور ضرورت پڑنے پر فوراً جنگ کے لئے روانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کوئی باقاعدہ فوج تو تھی نہیں۔ یہی رضا کار تھے جو جنگ کی صورت میں حالات سے نبٹنے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے۔ انھیں سرکاری خزانے

نہیں معلوم تھا کہ آمدنی کی صورت کب پیدا ہوگی۔ ادھر خرچ کی مد میں مقرر تھیں۔ یہ لکھ چھوڑنا کہ کتنی رقم وصول ہوئی، کب اور کہاں سے وصول ہوئی۔ کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن متوقع آمدنی کا اندازہ نہیں لگ سکتا تھا۔ نہ یہ علم تھا کہ آمدنی کب ہوگی۔ ادھر خرچ تھے کہ زکے ہی نہیں تھے۔ غریبوں اور محتاجوں کی امداد جس میں حضور کے حکم پر اہل صفحہ کے تقریباً اتنی نوے حضرات کی کفالت شامل تھی، مختلف سرکاری امور پر مقرر کارکنوں کی تنخواہیں، جنگ میں گرفتار ہونے والے مسلمانوں کی گلو خلاصی کے لئے رقم کی لواستگی، بیواؤں کی خبر گیری، بے وسیلہ مقرر وضوں کی اعانت، مسافروں کی دیکھ بھال، سرکاری مہمانوں کی تواضع اور ان سب کے علاوہ خرچ جو کسی خاص صورت حال میں ایسے لوگوں پر اٹھتا تھا جن کی کسی خاص وجہ سے دلجوئی منظور ہوتی تھی۔ یہ سب اللہ سبحانہ تعالیٰ کے احکامات تھے۔ پھر غزوات اور سرایہ کے اخراجات۔ یہی صورت حال تھی ہمارے جٹ کی، زکوٰۃ کی فرضیت یعنی ۹ ہجری سے قبل۔ اس کے بعد صورت حال بہتر ہو گئی تھی کیونکہ باقاعدہ اور بروقت آمدنی کے ذرائع بن گئے تھے۔ اس سے پہلے تو یہ تھا کہ کچھ مسلمان رضا کارانہ طور پر اپنی آمدنی سے کچھ رقم حضور کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ مدینے میں زیادہ تر زراعت کا کاروبار تھا چنانچہ لوگ کبھی کبھی اپنی صولبد پر فصلوں کا کچھ حصہ اجناس کی صورت میں دے جاتے تھے جو مال خانے کے حجرے میں جمع کر لیا جاتا تھا۔ یہی مال خانہ میرا سرکاری دفتر تھا۔ زکوٰۃ فرض ہونے سے پہلے آمدنی کی ایک اور صورت پیدا ہو گئی تھی۔ فتوحات ہونے لگی تھیں اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ سرکاری خزانے میں آجاتا تھا۔ کبھی خرچ آمدنی سے زیادہ ہوتا تھا تو رسالت مآب نماز کے خطبے میں یا خاص طور پر مسلمانوں کا اجلاس بلا کر سب کو رضا کارانہ طور پر رقم جمع کرانے کی تلقین فرماتے تھے اور اللہ کے کرم سے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اندازے سے کم رقم جمع ہوئی ہو۔

## بدر

مجھے، جو جیتے جی موت کے کرب سے گزر چکا ہے، کسی کی جان لینا اچھا نہیں لگتا۔ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے شمشیر زنی کا نہ شوق دیا نہ استعداد، بڑی کوشش کی لیکن مبتدی کا مبتدی رہا۔ حمزہ اور علی دونوں نے میرے ساتھ بہت مغز مارا مگر میں اس فن میں کوئی مہارت نہ حاصل کر سکا۔ مد مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا، آنکھوں آنکھوں میں اسے تولنا، اس کی قد و قامت اور قوت کا اندازہ لگانا، پھر اپنے پورے قد کا استعمال کرتے ہوئے وزن آگے کی طرف ڈال کر اس پر وار کرنا، یہ سب کچھ مجھے کبھی نہیں آیا۔ یہ سارے کام ایک ایک کر کے تو میں کچھ حد تک کر لیتا تھا لیکن ایک ساتھ یہ سب کچھ مجھ سے نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کچھ بھول جاتا تھا، کبھی کچھ۔ غزوہ بدر سے ایک دن پہلے علی سارا دن مسجد کے عقب میں مجھے مشق کراتے رہے، تلوار کے وار اور ہر وار کی مناسبت سے قدموں کا استعمال سکھاتے رہے۔ میرا قدموں کا استعمال ٹھیک تھا۔ حمزہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے میرے جسم

میں ہمیں حکم ملا تھا:

اللہ کی راہ پر جنگ کرو،

اُن کے خلاف،

جو تم سے جنگ کرتے ہیں،

جنہوں نے تمہیں بے گھر کیا۔

لڑو مگر خود جنگ نہ شروع کرو

کیونکہ اللہ جنگ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور پھر جب تمہارا دشمن جنگ روک دے

تو تم بھی جنگ روک دو۔

جنگ ٹھن ہی گئی تو اللہ کے رسولؐ نے اس محاذ کی بھی ایسی قیادت کی کہ بڑے

بڑے عسکری ماہر اُن کی حکمتِ عملی پر رشک کرتے ہیں۔ انہوں نے جنگ میں یہاں تک

طے فرمادیا تھا کہ کون کہاں، کس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ فوج کی تنظیم کی بھی ایک نئی صورت

وضع کی۔ جب ہم لوگ میدانِ جنگ میں اترے تو ہماری فوج ایک نیا منظر پیش کر رہی تھی۔

صحرائی جنگوں میں رواج یہ تھا کہ لوگ الگ الگ چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں جنگ

کرتے تھے۔ ایک دائرے میں، یہاں معرکہ آرائی ہو رہی ہے تو کچھ فاصلے پر ایک دوسرے

حلقے میں مد مقابل ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں اور تمام دائروں میں ریتِ خون سے رنگی جا

رہی ہے۔ زخمی گر رہے ہیں، لاشیں تڑپ رہی ہیں۔

ہمیں حضورؐ نے یہ ہدایت دی تھی کہ ہم سب ایک ساتھ رہیں۔ ایک دوسرے

سے الگ نہ ہوں۔ گویا ہر شخص کو ایک قلعے کا حصہ بنا دیا تھا جس میں ہر ایک اپنے قریبی ساتھی

کے لئے باعثِ تقویت تھا۔ یہی حکمتِ عملی ہم نے بعد کی جنگوں میں بھی نہایت کامیابی سے

کی چستی کی تعریف کی۔ علیؑ نے کہا کہ میں اپنے قدم کا مناسب فائدہ اٹھاتا ہوں مگر میرے بازو  
میرے قدموں کا ساتھ نہیں دے پاتے تھے۔ ویسے دل ہی دل میں ہم سب جانتے تھے کہ  
جنگ تو ہمیں قوتِ بازو سے نہیں قوتِ ایمان سے لڑنا تھی۔ اسلام کے معرکوں میں ہمیں  
واقعی یہ محسوس ہوتا تھا کہ دشمن ہمارے سامنے موم کی طرح گھمٹتا جا رہا ہے اور ہماری نگاہیں  
ہی اُس کا پتہ پائی کرنے کے لئے کافی ہیں۔

اللہ کے رسولؐ کو علم تھا کہ جنگ جوئی میرے خون ہی میں نہیں تھی، اس لئے  
انہوں نے مجھے دوسرے فرائض سونپ دئے۔ میرے سپرد یہ کام تھا کہ میں فوج کے راشن  
کا بندوبست کروں۔ فوج کیا تھی صرف تین سو آدمی تھے لیکن غربت کے اس دور میں تین  
سو کی خوراک کا انتظام بھی معنی رکھتا تھا، مگر ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال رہی اور  
مدینے سے بدر رو اُگی اور واپس مدینے آنے تک کھانے کا سارا انتظام ٹھیک رہا۔ اس عرصے  
میں مجھے خوراک جمع کرنے کے لئے تمام حربے استعمال کرنا پڑے۔ کسی سے مانگا، کسی سے  
خریدا، کسی سے اُدھار لیا، کسی کو اللہ تعالیٰ کا خوف دلایا۔ یہ تو لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ اُن  
دنوں میری حالت اُس مرغی جیسی تھی جس کی نظر سے ایک دانہ بھی نہیں چھتا تھا۔ مگر یہ  
مبالغہ ہے کہ بلال نے چیونٹیوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ جہاں اُن کی قطار دیکھتا، ساتھ ساتھ  
چل پڑتا تاکہ اُن کا جمع کیا ہوا ذخیرہ بھی اٹھالائے۔ ویسے صورتِ حال اس سے بہت زیادہ  
مختلف بھی نہیں تھی۔

بدر میں مسلمان کام ضرور آئے مگر کسی نے بھوک سے نڈھال ہو کر شہادت نہیں  
پائی۔ مدینے سے روانگی سے قبل ہی ہمیں اللہ جل شانہ کی طرف سے اُس کی رضا کی  
بشارت مل چکی تھی اور اُس نے ایک لمحے کے لئے بھی ہمیں ہمارے حال پر نہیں چھوڑا۔  
ہماری جنگِ دفاعی تھی، محدود تھی اور صرف اللہ کے لئے تھی جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیات

کوئی کھیت میں کام کرتے ہوئے کسی کسان پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا،  
 کوئی کسی ضعیف آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا،  
 کوئی کسی لپانچ پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا،  
 کوئی کسی پھلدار درخت کو نہیں کاٹے گا،  
 اگر کسی سے کھانے کو کچھ لیا تو اس کی قیمت ادا کی جائے گی،  
 کوئی جنگی قیدیوں کو رسیوں سے نہیں جکڑے گا،  
 کوئی خود سوار ہو کر قیدیوں کو پیدل چلنے پر مجبور نہیں کرے گا،  
 جو ہتھیار ڈال دے گا اس کے ساتھ نرمی سے پیش آیا جائے گا،  
 دوبارہ تاکید ہے کہ کوئی بچوں پر ہرگز ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔“

بچوں کے متعلق مجھے حضورؐ نے دو مرتبہ اعلان کرنے کو فرمایا تھا۔ یہ تھی ہماری  
 تعلیم و تنظیم۔ کل تین سو ستتر آدمی، جن میں چھبیسای مہاجر تھے، خزرج کے ایک سو ستتر اور  
 اوس کے اکتھ۔ ستر اونٹ تھے اور صرف دو گھوڑے۔ مکے سے جو فوج ہمارے ساتھ لڑنے  
 آرہی تھی اس میں ایک ہزار آدمی، سات سو پچاس اونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے۔ ہم لوگوں  
 نے درختوں کی چھالیں اپنے جسموں پر باندھ کر ڈھالوں کا کام لیا۔ ہمارے مد مقابل فولاد کے  
 زره بخر پہنے تھے۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر حملہ آور ہوتے تو ہمیں لگتا تھا سروں پر چٹانیں منڈلا  
 رہی ہیں۔

لیکن فتح ہماری ہوئی!

یہاں میں اپنے خلاف ایک الزام کی تردید کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ایک جنگی  
 قیدی کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ یہ جنگی قیدی اُمیہ تھا، میرا سابقہ آقا جس نے ایک بار مجھے  
 مار مار کر اودھ موا کر دیا تھا۔ یہ سب جانتے تھے کہ بلال اور اُمیہ کے درمیان کوئی رورعایت

استعمال کی اور زک صرف اُس وقت اٹھائی جب اس سے انحراف کیا۔ حضورؐ کا ارشاد تھا:  
 ”آج جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔ آج جو شہادت پائے گا فرشتے اُسے خود  
 جنت تک لے کر جائیں گے مگر سب شہداء کے زخم اُن کے سینوں پر ہونے چاہئیں،  
 پشت پر نہیں۔“

ہمیں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ہماری ہر جنگ اصولوں کی خاطر لڑی جائے گی،  
 ہوائے نفس کے لئے نہیں۔ رسول اللہؐ نے جنگ کا دائرہ محدود کرنے کے لئے بھی قواعد  
 مرتب فرمائے اور اُن کے اعلان کے لئے میرا انتخاب فرمایا۔ سردیوں کی شام تھی اور فارس  
 کی ہوا چل رہی تھی۔ موسم میں بے حد خشکی تھی۔ آج سے پہلے میں نے حضورؐ کو کبھی اتنا  
 خاموش اور آپ ہی آپ میں اتنا گم نہیں دیکھا تھا۔ جب انہوں نے مجھے ہدایات دینے کے  
 لئے پاس بلایا تو مجھے بہت آگے جھٹک کر اُن کے الفاظ سننا پڑے تھے۔ ہدایات دے کر حضورؐ  
 رخصت گئے۔ آج شام وہ وقت سے بہت پہلے خیمے میں چلے گئے تھے جہاں انہوں نے رات  
 بہت دیر گئے تک عبادت کی اور مسلمانوں کی فتح کے لئے دعائیں فرمائیں۔

دوسرے دن صبح میں ایک بلند مقام پر کھڑا ہو گیا۔ مدینے کے درختوں کے  
 جھنڈ میرے پیچھے تھے اور میرے سامنے سپاہ اسلام تھی جسے اسلام کی پہلی جنگ میں  
 شریک ہونا تھا۔ تین سو نفوس اور اُن کے سامنے صحرا، جدھر ہمیں کوچ کرنا تھا۔ فضا میں  
 کوئی پرندہ نہیں تھا۔ ہوا ساکت تھی اور آسمان پر سفید بادل کا صرف ایک ٹکڑا تیر رہا تھا۔  
 میں نے باواؤ بلند سب کو مخاطب کیا اور اللہ کے رسولؐ کی ہدایات کا اعلان کیا۔ جو کچھ اُس  
 دن میری زبان سے ادا ہوا مجھے اُس پر فخر ہے:

”جنگ کے قواعد یہ ہوں گے،

کوئی کسی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا،

مدافعت پر مجبور ایک بے قصور، تیری تلوار نے اُس دن اُس کی زندگی کا فیصلہ کیا تھا یا تیرے اپنے مستقبل کا۔

اُمیہ کی لاش کے گرد کھڑے دوستوں نے مجھے مبارک باد دی لیکن وہ صحیح صورتِ حال کے شاہد نہیں تھے۔ موقع کی صرف دو ہی شہادتیں تھیں۔ میں اور اُمیہ!

نہیں تھی جیسے کہ بارہ سال پہلے اُمیہ اور بلال میں کوئی رورعایت نہیں تھی۔ اسی پس منظر میں مجھ پر عائد کردہ الزام کو زیادہ ہوا ملی۔

جب جنگِ بدر کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا تو شامِ خاصی گہری ہو چکی تھی۔ اُمیہ ہتھیار ڈالنے کی تیاری کر رہا تھا مگر ابھی تلوار اُس کے ہاتھ میں تھی۔ جیسے ہی اُس نے اچانک مجھے اپنے گرد کھڑے ہجوم سے باہر نکلتے دیکھا تو اُس سے رہانہ گیا۔ اُس نے مجھے نہایت حقارت سے غلام کہہ کر پکارا۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں ہنس پڑتا لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ اُمیہ کو بھی چاہئے تھا کہ وہ تلوار ہاتھ سے گرا دیتا مگر اپنے سابق غلام کے سامنے وہ بھی ایسا نہ کر سکا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اُس کی تلوار مجھ پر وار کرنے کے لئے اٹھی۔ اُس وقت میں نے دیکھا کہ اُس کی زرہ پیٹ پر سے کٹی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک پور کے برابر چوڑی جگہ خالی تھی، میں نے اُسی جگہ وار کیا اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ میرے ساتھیوں نے اُسے سیدھا کیا، وہ مر چکا تھا۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کیا ہو گیا ہے۔

مجھ پر ایک عجیب اضطراب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ غلاموں کے خمیر میں، اُن کی گھٹی میں یہ بات پڑی ہوتی ہے کہ اپنے آقا پر کبھی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھانا۔ اس وقت میرا سابق آقا زمین پر پڑا تھا اور میری تلوار سے اُس کا خون ٹپک رہا تھا۔

اُس وقت سے آج تک میں نے کئی راتیں سوچتے سوچتے گزار دی ہیں کہ بلال کیا تو نے اُس سے بدلہ لیا تھا جو اللہ کی طرف سے تجھ پر جائز نہیں تھا، کیا تو نے جان بوجھ کر اپنے رسولؐ کے صریح حکم کی خلاف ورزی کی کہ ہتھیار ڈالنے والوں پر ہاتھ نہیں اٹھانا، کیا تیرے پاس اُس کے قتل کا کوئی جواز تھا۔ کیا تجھے بدلہ لینے کی اجازت تھی، وہ اُس وقت جنگی قیدی تھا یا ہتھیاروں سے لیس ایک مخالف، اُس نے تجھ پر پہلے ہاتھ اٹھایا تھا یا تو نے حفظِ ما تقدم کے طور پر اُس پر پہلے وار کر دیا تھا، تو غصے میں بہک جانے کا قصور وار تھا یا اُس کے غصے کی وجہ سے

## أحد

أحد میں ہمیں معلوم ہوا کہ جنگ ایک ہندو لاپے جو کبھی اوپر لے جاتا ہے کبھی نیچے لے آتا ہے۔ جنگ میں یہ فیصلہ نہیں ہوتا کہ کون جیتا ہے، کون ہارا ہے بلکہ یہ کہ اُس سے پہلے کیا ہوا اور اُس کے بعد کیا ہوا۔

أحد میں وہ جیت گئے، وہ کھڑے رہے اور ہم گھبرائے ہوئے، پریشان، خوف زدہ، اپنی جانیں بچانے کے لئے تتر بتر ہو گئے۔ وہ جیت گئے تھے لیکن اپنی فتح کی خوشی میں انہوں نے کیا کیا۔ أحد کے پتھر یلے خارزار میں اپنی فتح کا نعرہ لگانے کے بعد انہوں نے کیا کیا۔ انہوں نے اسی میدان میں اپنے لئے جہنم کی فصل بوئی۔ انہوں نے لاشوں کی بے حرمتی کی، اُن کو برہنہ کیا، اُن کے اعضاء کاٹے۔ اُن کے ناک کان کاٹ کر گلے کے بار بنائے۔

لیکن ایسا کیوں کیا انہوں نے؟ لاشوں کی بے حرمتی سے انہیں کیا حاصل ہوا؟ اُن کے اعضاء کاٹ کے انہوں نے کیا پایا؟ میں نے سنا ہے ٹرائے میں ایک مرتبہ Achilles نے اپنے دشمن کی لاش کو گھوڑے کے ساتھ باندھ کر کھنچو لیا تھا۔ ایسا کیوں

چاندی میں تول دے گی اور اُس کے قد کے برابر اُسے ریشم کے تھانوں کا ڈھیر بھی دے گی۔ اُحد کے میدان میں وحشی کا صرف ایک ہدف تھا۔ حمزہؑ۔ اُسے کسی اور سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جنگ ہو رہی تھی۔ دونوں طرف سے لوگ ایک دوسرے پر ہلے بول رہے تھے۔ تلواریں، نیزے، بھالے، تیر انسانوں کے جسموں میں پیوست ہو رہے تھے۔ انسان کٹ کٹ کر گر رہے تھے، میدانِ کارزار خون سے سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ گھوڑوں کا شور الگ تھا۔ ہر سمت سے زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لوگ خس و خاشاک کی طرح گھوڑوں کے سُموں تلے روندے جا رہے تھے۔ چاروں طرف لاشیں بھری پڑی تھیں۔ جوش میں بھرے ہوئے فریقین نعرے بلند کر رہے تھے مگر اس سارے ہنگامے میں، سارے ہجوم میں وحشی تما تھا۔ سب سے الگ اپنے شکار کے تعاقب میں۔ آپس میں گتھم گتھا سپاہیوں کے پچ سے راستہ بناتا، ہتھیاروں کی ضرب سے پچتا چاتا، برق رفتار گھوڑوں کی زد سے ہٹتا پچتا، زخمیوں میں، لاشوں میں ریگلتا، گھسٹتا، اپنا نیزہ سنبھالتا آخر کار وہاں پہنچ گیا جہاں چند قدم کے فاصلے پر حمزہؑ دشمنوں سے برسرِ پیکار تھے اور اُن کے مد مقابل اُس شیر میدان کے سامنے اپنا سارا کس بل بھولے ہوئے تھے۔ وحشی، زخمیوں اور لاشوں کے درمیان لینا رہا، آنکھیں کھولے، نیزہ ہاتھ میں سنبھالے۔ بالکل ساکت! اتنے میں اُس نے دیکھا کہ حمزہؑ اُس کے نیزے کی زد میں ہیں اور اُس کے وجود سے بے خبر اپنے مخالفین پر وار پہ وار کئے جا رہے ہیں۔ وحشی لاشوں میں سے جست لگا کر اٹھا اور اپنا نیزہ حمزہؑ کی ناف میں پیوست کر دیا بس ایک ہی وار۔ یہی ایک وار وحشی کی جنگِ اُحد تھی۔ اس کے بعد وہ میدان سے باہر چلا گیا۔ کچھ دنوں کے میں رہا۔ پھر طائف چلا گیا اور غزوہٴ تبوک کے بعد مدینے آکر اسلام قبول کیا۔

مجھے وحشی پر ترس آتا ہے۔ غلام کے لئے آزادی کی رشوت سے انکار بہت مشکل ہے لیکن اس نے وہ ریشم کا لباس کبھی نہیں پہنا اور ہند کی چاندی خرچ کرنے کی بھی اُسے کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ اُس نے صرف آزادی حاصل کی اور صحرا میں نکل گیا مگر اس آزادی میں

کرتے ہیں لوگ؟ میری عقل کام نہیں کرتی۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ لاشوں کو مسخ کر کے وہ دوسروں کو عبرت سکھاتے ہیں۔ شاید انہیں خوف ہو، یہ خیال ہے کہ ہر جنگ کے بعد آخری فیصلہ جیتنے، ہارنے والے نہیں بلکہ مرنے والے کرتے ہیں۔ جنگ میں کسی کی ہارجیت نہیں ہوتی، صرف موت کی فتح ہوتی ہے اور آخری فتنہ وہی لگاتی ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ یہ ہمارا اور اللہ تعالیٰ کا معاملہ تھا۔ قرآن کی تیسری سورت آل عمران کی آیت ۱۶۶ میں صاف آیا ہے کہ اللہ نے ہمیں اُحد میں اس لئے شکست دلائی کہ وہ ہماری آزمائش چاہتا تھا:

اور جو مصیبت تم پر اُس روز پڑی

جب دونوں گروہ باہم مقابل ہوئے،

وہ اللہ کی مشیت سے ہوئی،

تا کہ اللہ مومنین کو جان لے۔

بدر کی فتح نے ہمیں دلولہ عطا کیا، اُحد کی شکست نے ہمیں سنجیدگی بخشی۔ ہم نے واقعی اپنی صفیں بہت جلد توڑ دی تھیں۔ حضورؐ ہمیں پکارتے رہے اور ہم سرِ اسمیٰ کے عالم میں ادھر ادھر بھاگتے رہے۔ ہمیں شاید یہ وہم تھا کہ پیغمبرؐ کی حکم عدولی کرنے پر بھی اللہ ہماری مدد کو آئے گا۔ ہمیں چوس کی طرح ایک سخت سبق دیا گیا تھا اور ہم تھے بھی واقعی چوس کی طرح۔ مگر اس سبق کی ہمیں بڑی قیمت چکانا پڑی۔

اُحد میں کائنات کا سب سے قیمتی خون بہا۔ شیر نیتاں حمزہؑ نے شہادت پائی۔ ہند کے پاس ایک حبشی غلام تھا، میری طرح حبشہ کا رہنے والا۔ اُس کا نام وحشی تھا۔ وہ نیزہ پھینکنے میں کمال رکھتا تھا۔ ہند کو حمزہؑ سے خاص بغض تھا کیونکہ وہ اس بدر کے جزار سے اپنے باپ، چچا اور بھائی کی موت کا بدلہ لینا چاہتی تھی جو بدر میں اُن کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ہند نے وحشی کو لالچ دیا کہ اگر وہ حمزہؑ کو قتل کر دے تو وہ اسے آزاد کر دے گی۔ اس کے علاوہ اُسے



بھی وہ غلام ہی رہا، اپنی حرکت پر شرمسار، اپنے ضمیر کی ملامت کا شکار، اپنے وجود، حتیٰ کہ اپنے نام تک سے بے زار!

ایک مدت بعد جب وہ مسلمان ہو گیا تو حضورؐ نے اسے اپنے سامنے آنے سے منع فرمادیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اُسے دیکھ کر آپ کو حمزہؓ کی شہادت یاد آجاتی ہے، جن سے انہیں بے حد پیار تھا مگر ایک دفعہ سرورِ عالمؐ نے خود وضاحت فرمائی کہ میرے لئے سارے مسلمان برابر ہیں، وحشی سمیت، میں نے اس لئے اُسے سامنے آنے سے منع کیا ہے کہ وہ خود میرے سامنے شرمندہ شرمندہ سا رہتا ہے اور اپنے دل پر بوجھ محسوس کرتا ہے۔

احد کے دن ہند کا خوب صورت چہرہ بھی خون آلود ہوا۔ اُس نے حمزہؓ کا پیٹ چاک کر کے اُن کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔

احد کے دن رحمتِ عالمؐ خود بھی شہادت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایک نوکیلا بھٹھر، کہیں سے آکر انہیں اتنی زور سے لگا کہ وہ زخمی ہو کر گر پڑے۔ انہیں گرنا دیکھ کر ابنِ قییمہ، جو مکے کا سب سے بڑا تیغ زن تھا، گھوڑا دوڑاتا اُن کے پاس جا پہنچا۔ آپ ابھی سنبھل بھی نہیں پائے تھے۔ اس سے بہتر موقع اور کون سا ہو سکتا تھا۔ وہ بھی ابنِ قییمہ، جیسے شمشیر زن کے لئے جو پہلے ہی کئی مسلمانوں کو تیغ کر چکا تھا۔ اُس نے بھرپور وار کیا لیکن طلحہؓ، جو حضورؐ کے ساتھ کھڑے تھے، برق کی سی سرعت سے بڑھ کر تلوار کی زد میں آگئے۔ اُن کے ایک ہاتھ کی ساری انگلیاں کٹ گئیں اور ابنِ قییمہ کی تلوار جو سیدھی نبی اکرمؐ کے خود پر آرہی تھی، بہک گئی اور اُس کا زور بھی کم ہو گیا۔ اس کے باوجود، وارا اتنی طاقت سے کیا گیا تھا کہ تلوار اُن کی کپٹی کے پاس خود کے کنارے پر لگی اور مخفر کی دو کڑیاں ٹوٹ کر نبی کریمؐ کے گال میں دھنس گئیں۔ خود سے تلوار اُچٹ کر حضورؐ کے شانے پر لگی جس پر دوہری زہرہ تھی۔ سر اوزشانے پر کوئی کاری زخم تو نہیں آیا لیکن کپٹی کے پاس ضرب پڑنے سے اُن کو چکر آگیا اور وہ گر پڑے۔ اُن کے گرتے ہی ابنِ قییمہ، جسے اپنی تلوار کی کاٹ پر پورا بھروسہ تھا، اپنی طرف سے اپنا کام

ختم کر کے واپس جانے کے لئے مڑا۔ میں نے بھی بڑھ کر اُس پر پوری طاقت سے ضرب لگائی مگر اُس کے دفعتاً مڑ جانے سے میری تلوار شاید اُس کے پاؤں پر لگی اور وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا اور باوا زبند حضورؐ کے قتل کا اعلان کرتا ہوا اپنی صفوں میں چلا گیا۔ اس کا یہ منحوس اعلان محاذ کے دونوں طرف کئی لوگوں نے سنا۔ اُس کے جاتے ہی چند اور مشرکین نے پیغمبرِ خداؐ کو زخمی میں لینے کی کوشش کی لیکن اُس وقت بارہ جاں نثاروں نے، جن میں میں بھی شامل تھا، حضورؐ کے گرد گھیر اڈال لیا اور اُن کی ڈھال بن گئے۔ سب کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں جیسے خارپشت کے کانٹے باہر کو نکلے ہوتے ہیں۔ خاندانِ مخزوم کے شمسؓ نے جو حضورؐ کے بالکل سامنے تھے، اُن کی مدافعت میں اتنے زخم کھائے کہ آپ نے انہیں 'زندہ ڈھال' کے لقب سے نوازا۔ بلا آخر اسی مدافعت میں انہوں نے شہادت پائی۔

## شامِ اُحد

قریش اپنی جنگ ختم کر کے فارغ ہو گئے، مسلمانوں نے اُحد کی گھاٹی پر چڑھ کر اپنے لئے محفوظ مقام منتخب کر لئے۔ حضورؐ بھی زخمی حالت میں اُحد ہی کی ایک بلندی پر تشریف فرما تھے۔ نیچے میدان میں نیم مردہ زخمیوں کے کراہنے کی آوازوں کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ ابوسفیان کولٹن قمیے کے اعلان کے باوجود حضورؐ کی ہلاکت کا یقین نہیں تھا۔ شام ذرا اور گہری ہوئی تو ہم نے ایک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی۔ تاریکی کا ابھی تک پورا غلبہ نہیں ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ابوسفیان اپنے کتھی رنگ کے گھوڑے پر سوار اُحد کے دامن تک آیا اور بلند آواز سے پوچھنے لگا:

”کیا آپ لوگوں میں محمد موجود ہیں؟“

حضورؐ نے جواب دینے سے منع فرمادیا۔ کوئی جواب نہ پا کر ابوسفیان نے پھر پوچھا:

”کیا ابو قحافہ کا بیٹا موجود ہے؟“

بھی کئی شمعیں جل رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹے ہوئے لوگ شہداء کے لئے زعمائیں کر رہے تھے۔ ایک جگہ اوس کے کچھ لوگ تھے جو اپنے شہداء کی تلاش میں تھے کہ ایک زخمی کو دیکھ کر اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی یہ تھے اُصیر بن ثابتؓ تھے جنہیں ابھی ایک دن پہلے اُنہوں نے کفر کا طعنہ دیا تھا اور اُنہوں نے آگے سے نکاسا جواب دیا تھا کہ اگر مجھے اسلام کے بارے میں یقین ہوتا کہ یہ سچا دین ہے تو میں اسلام لانے میں ایک لمحہ تاخیر نہ کرتا۔ اس وقت وہ مسلمان شہداء کی لاشوں کے درمیان شدید زخمی حالت میں آخری سانسوں پر تھے۔ کسی نے پوچھا آپ یہاں کیسے، کسی دوست کی خاطر یا اسلام کی خاطر۔ جواب ملا:

”اسلام کی خاطر۔ آج صبح میرے دل میں اسلام کی روشنی اس طرح جاگی کہ میں اسلام میں داخل ہو گیا اور تلوار اٹھا کر اللہ کے نبی کے ہمیش میں شامل ہونے کے لئے یہاں آ گیا۔ یہاں جنگ میں شریک ہوا۔ دشمنوں پر بڑھ چڑھ کر وار کرتا رہا کہ ایک کاری وار کی زد میں آ کر یہاں گر پڑا۔“

اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکے اور کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ اللہ کی شان کہ ایسا شخص، شاید پہلا شخص جنت کا حقدار ہوا جس نے زندگی میں ایک نماز بھی نہیں ادا کی۔ حیرتوں پر حیرت کا دن تھا اُحد کا یہ میدان کارزار۔ ابھی ایک حیرت ختم نہیں ہوئی تھی کہ مقتولین میں کسی نے ایک ایسے شخص کو پہچانا جسے ہم ایک عظیم یہودی عالم کی حیثیت سے جانتے تھے۔ چہرہ زخموں سے اتنا بجزو گیا تھا کہ ٹھیک سے شناخت نہیں ہو رہی تھی۔ لوگوں نے غور سے دیکھا تو تصدیق ہو گئی کہ یہ واقعی یہودیوں کے فاضل اور مقتدر رہنما خیریق کی لاش تھی جن کا تعلق بنو نعلبہ سے تھا۔ بعد میں عقدہ کھلا کہ آج علی الصبح انہوں نے

اس پر بھی کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے عمر بن خطابؓ کا پوچھا۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا تو ابو سفیان خود ہی زور زور سے وہی جہاں بجے لگا:

”سب کے سب قتل ہو چکے ہیں۔ کوئی زندہ ہوتا تو جواب دیتا۔“

”أَعْلُ بُہْبُلُ أَعْلُ بُہْبُلُ“

یہ سن کر عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ اُنہوں نے کہا:

”اے اللہ کے دشمن تو جھوٹ کہتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے ہم سب کو تیرے قتل کے لئے زندہ، سلامت رکھا ہے۔“

اس کے جواب میں ابو سفیان نے اپنی فتح پر پھر ہٹل کی سر بلندی کا نعرہ لگایا:

”أَعْلُ بُہْبُلُ أَعْلُ بُہْبُلُ“

رسول اللہ نے فرمایا اس کو جواب دو کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بلند ہے، سب سے بڑا ہے۔ یہ سن کر ابو سفیان نے کہا ہمارے پاس عزمیٰ ہے۔ نبی پاکؐ نے فرمایا جواب دو کہ اللہ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلَا لَكُمْ۔

یہ سن کر ابو سفیان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور رخصت ہوتے ہوتے کہہ گیا کہ آئندہ سال بدر کے مقام پر ملاقات ہوگی۔ رہی سہی کسر وہاں نکل جائے گی۔ حضورؐ نے اس کا چیلنج قبول فرمایا اور مجھے کہا اعلان کر دو کہ اے دشمن خدا ہم انشاء اللہ بدر کے میدان میں تمہارا انتظار کریں گے۔ دُور سے ابو سفیان کی آواز پھر سنائی دی۔

”أَعْلُ بُہْبُلُ أَعْلُ بُہْبُلُ“

یہ آواز دور ہوتی ہوتی غائب ہو گئی تو ہم لوگ ایک ایک دو دو کر کے اُحد سے نیچے اترے۔ حضورؐ بھی اپنے زخموں کے باوجود، نیچے میدان میں تشریف لے آئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک شمع تھی وہ ایک ایک شہید کے پاس جاتے اور دُعا فرماتے۔ اُحد کے حیدان میں اور

اپنے چند صحابیوں پیروکاروں کو بلا کر کہا کہ ہمیں محمد کے ساتھ کئے ہوئے اپنے بیثاق کا پاس کرنا چاہئے اور ان کے دوش بدوش لڑنا چاہئے۔ ان کے یہودی پیروکاروں نے یوم سبت کا بہانہ تراشا کہ آج تو ہفتے کا دن ہے ان کے لئے جنگ میں شرکت ممکن نہیں۔ مخیرقین برابر زور دیتے رہے۔ یوم سبت کے سلسلے میں انھیں اپنے ساتھیوں کی بہت سی سابقہ کوتاہیوں سے آگاہی تھی۔ مگر ان کے بار بار کہنے پر بھی کسی نے ان کی بات نہ سنی۔ آخر وہ تنہا جنگ میں شامل ہونے کے لئے نکل آئے اور مدینے سے رخصت ہوتے ہوئے بااِزبلند اعلان کر دیا۔

”سب لوگ آگاہ رہیں کہ اگر اس پاس عہد میں میری جان چلی گئی تو میری تمام جائیداد اور ملکیت کے وارث محمد ہوں گے۔ وہ جس طرح چاہیں، خدا کے بتائے ہوئے کاموں پر صرف کریں۔“

اس نیت اور ارادے سے وہ احد کے میدان میں اترے اور لڑتے لڑتے راہی ملک عدم ہوئے۔ مجھے خلاوم رسول کی حیثیت سے علم ہے کہ حضور کے یہاں سے غرباء و مساکین میں جو کھجوریں خیرات کی جاتی تھیں، ان کا بیشتر حصہ ان سات باغوں سے آتا تھا جو مخیرقین نے آنحضرت کے لئے چھوڑے تھے۔ یہ اسلام میں سب سے پہلا وقف تھا اللہ کے نبی مخیرقین کو بہترین یہودی، کہا کرتے تھے۔

کیسے کیسے چاند سورج و دفن ہوئے اُس دن احد کی وادی میں۔ حمزہؓ، مصعب بن عمیرؓ عبد اللہ بن حشؓ، مالک بن سنانؓ، شماس بن عثمانؓ اور کتنے ہی اور جانباز، کل ستر مسلمان۔ مگر میں بلال، جو ان سب شہیدوں کی تجنیز و تکفین میں شامل تھا، آج یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ قریش کو اس کامیابی پر خوش نہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ احد کے مکین نور کے وہ مینار بن کر ابھرے جن سے جاہد حق آج بھی موز ہے۔

جنگ تو ہوتی ہی سانحہ ہے لیکن کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو سانحہ جنگ کے اندر اپنی نوعیت کا ایک نیا سانحہ بن جاتے ہیں۔ غزوہ احد میں جب گھسان کارن پڑا تو

مسلمانوں نے غلطی سے کافروں کے لشکر کا فرد سمجھ کر حذیفہؓ کے والد یمانؓ پر حملہ کر دیا۔ حذیفہؓ چیختے ہوئے ان کو چھانے کے لئے ان کی سمت دوڑے کہ میرے والد ہیں، میرے والد ہیں مگر اتنے میں وہ شہادت پا چکے تھے۔ اس نادانستہ قتل پر حذیفہؓ کے منہ سے صرف یہ نکلا۔

يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّحِمِيْنَ

(اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے)

احد ہی میں ایک اور انہونا واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص رسول اللہ کے اپنے ہاتھ سے مقتول و محزول ہوا۔ یہ بدبخت اُمی بن خلف تھا، میرے سابق آقا کا بھائی اور وہ ناخنبار جس نے مکے میں ایک بوسیدہ ہڈی کا پتھر اہنا کر حضور کے روئے مبارک پر پھینکا تھا۔ اُمی بن خلف نے رسول پاکؐ پر تلوار اٹھائی تھی۔ جب وہ قریب آیا تو آنحضرت نے ایک چھوٹے نیزے سے جو ان کے ہاتھ میں تھا، اُس کو مارا۔ زخم کوئی ایسا کاری نہیں تھا۔ ذرا سی نوک چٹھی تھی مگر تکلیف کی جس شدت کا اظہار اُس کی چیخ پکار سے ہو رہا تھا، وہ اُس کے حلیفوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ بعض نے تو اس کا باقاعدہ مذاق بھی اڑایا کہ کیا اتنے چھوٹے سے زخم پر دہائی چائی ہوئی ہے۔ لیکن جب اُس کی حالت بہت غیر ہو گئی تو مشرکین نے اُسے اونٹ پر لاد کر مکے روانہ کر دیا۔ مگر سنا ہے کہ وہ مکے سے ایک منزل پہلے ہی مرطظہم ان میں جہنم واصل ہو گیا۔

احد وہ واحد میدان جنگ ہے جہاں ایک ایک قبر میں قلت و مسائل کے سبب دو دو تین تین شہداء کو دفن کیا گیا۔

غزوہ احد کے شہداء کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔

مومنین میں سے سے کچھ لوگ

ایسے بھی ہیں جنہوں نے

جس بات کا اللہ سے وعدہ کیا تھا  
اس پر پورے اترے۔  
بعض تو ان میں وہ ہیں  
جو اپنی نذر پوری کر چکے  
اور بعض ان میں مشتاق ہیں۔

(۲۳-۳۳)

سورہ آل عمران کہ یہ مشہور آیت بھی جنگ اُحد کے موقع پر نازل ہوئی تھی اور جو  
لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے۔  
ان کو مردہ مت خیال کرو  
بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں،  
اپنے پروردگار کے مقرب ہیں  
ان کو رزق بھی ملتا ہے۔

وہ خوش ہیں اُس چیز سے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انھیں عطا فرمائی۔

## اب یا کبھی نہیں

یہودی ایک خدا کو ماننے والے تھے، انہیں اپنی کتابوں کے ذریعے ایک پیغمبر کے  
آنے کا انتظار بھی تھا۔ قرآن سے ان پر یہ واضح بھی ہو چکا تھا کہ وہ آنے والے پیغمبر محمد ہی  
ہیں۔ پھر نبی کریم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد وہ ان کے ساتھ چند اہم معاہدوں میں بھی  
منسلک ہو چکے تھے مگر ہم لوگ ان کی طرف سے کبھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوئے۔ وہ  
جب بھی، جہاں بھی ملتے ان سے غیریت ہی نہیں معاندت کی بُو آتی۔ ان کے تیور ہمیشہ  
بجڑے بجڑے نظر آتے۔ آئے دن چھوٹے بڑے واقعات بھی ہوتے رہتے جن سے ان کے  
دلوں کا بغض ظاہر ہوتا رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ صریحاً بد تمیزی پر اتر آتے۔ ہمارے ساتھ ان کے  
معاہدے تھے۔ غزوہ بدر میں انھیں ہماری کامیابی پر خوش ہونا چاہئے تھا مگر نہیں۔  
رسول اکرمؐ ان کے پاس خوشخبری لے کر گئے تو اُدھر سے یہ جواب ملا کہ قریش  
نا تجربہ کار تھے ان سے جیت جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم جیسے جنگ آزمودہ بہادروں

حرکات و سکنات پر نظر رکھیں اور ان کی ہر چال سے باخبر رہیں تاکہ مسلمان اچانک کسی سازش کا شکار نہ ہو جائیں۔ تقریباً دو سال ہو گئے تھے ہمیں مکے سے آئے ہوئے۔ ان برسوں میں انہوں نے ہمیں ہر رنگ میں دیکھ لیا تھا اور ان میں سے کوئی بھی رنگ انہیں پسند نہیں تھا۔ وہ حسد کی آگ میں جلے جا رہے تھے۔ ہمارے دین کی روز افزوں مقبولیت، ہمارے پیغمبرؐ کی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی توقیر ان کے دلوں کا ناسور بن گئی تھی۔ قریش مکہ سے ان کے ساز باز کی اطلاعات بھی ملتی رہتی تھیں۔ خاص طور پر ان کے قبیلے، بوقیہتھاع کی ریشہ دو انیاں زوروں پر تھیں۔ عبداللہ ابن سلام جو اسی قبیلے کے فرد تھے ان کی رگ رگ سے واقف تھے۔

پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے یہودیوں کا سارا عناد کھل کر سامنے آ گیا۔ مدینے کے جنوب میں جہاں قیہتھاع آباد تھے، ایک مسلمان عورت کسی خرید و فروخت کے سلسلے میں جا رہی تھی کہ ایک یہودی صراف نے اُس سے چھیڑ خانی کی۔ ایک مسلمان راہرو نے یہ صورت دیکھی تو اُس نے صراف سے باز پرس کی، جھگڑا بڑھ گیا۔ تلواریں بے نیام ہو گئیں اور یہودی صراف قتل ہو گیا۔ اسی اثناء میں اور یہودی بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے مسلمان کو قتل کر کے شہید کر دیا۔ دونوں طرف سے ایک ایک فرد جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، اسی پر بات ختم ہو سکتی تھی۔ مگر بوقیہتھاع تو جیسے اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ جنگ کی ٹھان لی اور سات سو مسلح افراد کا لشکر تیار کر لائے۔ کم و بیش اتنی ہی نفری کی توقع انہیں عبداللہ ابن ابی اور عبادہ بن الصامتؓ سے تھی۔ مگر ان دونوں نے ساتھ نہ دیا۔ نبی کریمؐ کے حکم پر مسلمانوں نے بوقیہتھاع کے لشکر کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا اور انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔ دو ہفتے تک محاصرے میں رہنے کے بعد انہیں غیر مشروط طور پر خود کو مسلمانوں کے حوالے کرنا پڑا۔ اب ان کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کا وقت تھا۔ رسول اللہؐ اپنے خیمے میں تھے کہ ابن ابی آپہنچا اور اپنے حلیفوں کی امان مانگنے لگا۔ حضورؐ نے غصے سے منہ پھیر لیا مگر ابن ابیؓ نے ان کا دامن پکڑ لیا۔ رسول اللہؐ نے سختی سے

سے پالا پڑتا تو پتہ چلتا کہ جنگ کسے کہتے ہیں۔ اُحد میں ہماری ہزیمت پر وہ دل ہی دل میں خوش تھے اور ان کے طنز یہ چبھتے ہوئے جملے گلیوں، بازاروں میں ہمارے کانوں میں پڑتے رہتے تھے وہ ہم سے معاہدہ تو کر بیٹھے تھے مگر لگتا تھا کہ مسلمانوں سے بچہ آزمائی پر نئے بیٹے ہیں۔ اور مسلمانوں پر ایک فیصلہ کن وار کا ارادہ رکھتے ہیں۔

رسول کریمؐ ان کے رویے سے پریشان پریشان رہنے لگے تھے۔ دُنیا کو عدل و انصاف کی تربیت دینے والے کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ جب تک یہود کی طرف سے کوئی پہل نہ ہو، جب تک وہ واقعی کوئی قابلِ گرفت جرم نہ کر بیٹھیں، ان کے خلاف کسی انجامنے و سوسے کی بنیاد پر کوئی تادیبی کارروائی کی جائے۔ لیکن فراست کا تقاضا تھا کہ قرآن سے بھی نتیجے اخذ کئے جائیں اور بہر صورت ان کے متوقع شر سے ممکنہ حد تک محتاط رہا جائے۔ اسی عرصے میں چند آیتیں بھی نازل ہوئیں جن سے دلوں کے راز جاننے والے ذہنوں سے ایسے پردے اُٹھائے کہ سب شبہات یقین میں بدل گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آلِ عمران کی ایک سواٹھارہویں آیت میں واضح الفاظ میں اعلان فرمایا:

”وہ تمہیں برباد کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔  
وہ تمہیں تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔

ان کی نفرت ان کے منہ سے نکلتے ہوئے الفاظ سے عیاں ہے  
لیکن جو بغض وہ اپنے دلوں میں رکھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔“

پھر ایک اور آیت نازل ہوئی آلِ عمران کی ایک سو پیسویں:

”تم کو اچھی حالت میں دیکھ کر انہیں افسوس ہوتا ہے

اور تم پر کوئی بُری حالت آپڑتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔“

اب ہر ایک کو یقین تھا کہ کسی وقت بھی کوئی واقعہ رونما ہو سکتا ہے۔ رسول کریمؐ نے مکمل حفاظتی تدابیر اختیار کر لیں۔ چاروں طرف اپنے جاسوس پھیلا دیے کہ اہل یہود کی

شاید چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ سرور کائنات نے ایک عید کے خطبے میں صدقے کی برکات کا ذکر فرمایا۔ تو عورتوں کے مجمع سے ہر ایک نے اپنے زیور اتار اتار کر پھینکنے شروع کر دیئے۔ میں دامن پھیلائے بیٹھا تھا اور عورتیں اپنی انگوٹھیاں، کان کی بالیاں، گلے کے ہار میرے دامن میں پھینکتی جاتی تھیں۔ ایسی خبریں سن سن کر دشمنوں کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ ایک بے سلاہ بے آسرا یتیم جو مکے سے نہایت کس مہر سی کے عالم میں نکلا تھا کیسے اتنا اہم ہو گیا کہ تمام صحرائے عرب اُس کی عظمت سے لرزاں ہے۔ ہر عرب قبیلے میں اُس کی طرف سے ایک انجانا خوف سا تاجا جا رہا ہے۔ اُن کے آباؤ اجداد کی تہذیب اور تمدن کا ایک مکمل دور تھا جو داؤں پر لگا ہوا تھا۔ اس بغض و عناد میں انھیں یہودیوں کی بھی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ عرب قبائل کا جوش و جذبہ اور یہودیوں کی علمی بصیرت اور ذور اندیشی مل کر ایک ایسا مد مقابل بن گئے تھے کہ جس سے اب چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ یہود کو یہ بھی غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ ابھی تک نصاریٰ پر سبقت لے جانے اور اُن کے دین کو زیر کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے تھے کہ توحید کا وہ خورشید طلوع ہو گیا جس کی کرنیں ہر کہ دمہ کو خیرہ کیے دے رہی تھیں۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ عمل کا وقت یہی ہے۔ اگر اب نہیں تو کبھی نہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ سیلاب ان کی زندگی کی ساری قدریں بہا لے جائے اسے روک دیا جائے۔ چنانچہ بنو نضیر کے حوالے سے خطبہ اور دو بھائی سلام اور کنانہ اور بنو اہل کی دوسرے اور وہ شخصیتیں ہو ذہن قیس اور ابو عمارہ و فد کی صورت میں خیبر سے نکلے اور قریش مکہ کے پاس جا پہنچے۔ قریش مکہ نے اُن سے اپنی تسلی کے لئے بہت سے سوال کئے۔ وہ داعی اسلام کے دشمن بھی تھے مگر اُن سے خاصی حد تک خائف بھی۔ قریش کے چند لوگ تو دعوت اسلام کی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی پذیرائی کو دیکھ کر یہ بھی سوچنے لگے تھے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ محمد واقعی حق پر ہوں۔ اسی تہذیب کے پیش نظر انھوں نے اس بیچرگنی و فد سے کہا کہ آپ سب سے پہلے اہل کتاب ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا اور محمد کا اختلاف کیا ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ

اُسے دامن چھوڑنے کو کہا مگر اس نے کہا اللہ میں آپ کا دامن نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ ہو قیقاہ سے اچھے سلوک کا وعدہ نہیں فرمائیں گے۔ اُن کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ پیغمبر رحمت نے ارشاد فرمایا کہ میں تیری خاطر اُن کی جاں بخشی کرتا ہوں۔ مگر انھیں مدینہ چھوڑنا پڑے گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے عبادہ ابن الصامتؓ کو حکم دیا کہ انھیں مدینے کی حدود سے باہر چھوڑ آئیں۔ مدینے سے نکالے جانے کے بعد انھوں نے واوی القراء میں ایک یہودی قبیلے کے یہاں پناہ لی اور کچھ دن وہاں رہ کر شام کی سرحدوں پر جا آباد ہوئے۔

اس کے بعد یہودی قبیلہ بنو نضیر بھی انھیں کے نقش قدم پر چلا اور مدینے سے خارج کر دیا گیا۔ یہ اللہ کے اُس حکم کی تعمیل تھی جس میں کہا گیا تھا کہ جب تم جنگ میں فتح حاصل کرو تو اپنے دشمنوں کو ایسی مثال بنا دو کہ اُن کے پشت پناہوں کے دلوں میں تمہاری دہشت بیٹھ جائے اور وہ آئندہ کے لئے محتاط ہو جائیں۔ دہشت پھیلی اور ایسی پھیلی کہ مدینے میں جس جس کے دل میں چور تھا اپنی عافیت کی راہیں تلاش کرنا نظر آتا تھا۔ مسلمانوں سے اتنا سلوک برتا تھا، اُن کے ہر کام میں اس طرح پیش پیش رہتا تھا کہ جیسے کبھی کوئی خلش تھی ہی نہیں۔ لیکن یہ سب محض ایک ظاہری صورت تھی۔ اندر دلوں میں لبالب اٹھ رہے تھے۔ بظاہر تو کوئی بات نہیں تھی جس پر گرفت ہو سکتی۔ مگر فراسٹ مومن بیدار تھی۔ ساری صورت حال آئینے کی طرح نظروں کے سامنے تھی۔ بنو قیقاہ اور بنو نضیر کے شہ بدر ہونے کے بعد بنو غطفان، بنو ہذیل اور بنو قریظہ اندر ہی اندر مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ مدینے سے باہر پورے عربستان کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ قریش مکہ بدر کے مقتولوں کے زخم چاٹ رہے تھے۔ اندھی تقلید میں گھرے ہوئے عرب قبائل، قریش مکہ کے ہموار تھے۔ صحرائے عرب کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے یہ قبیلے جہاں جہاں آباد تھے قریش مکہ کی حمایت کا دم بھرتے تھے۔ اللہ کے نبیؐ کی کامیابیاں اور اُن کے لئے مسلمانوں کے جذبہء ایثار اور جانفروشی کی خبریں انھیں بے حال کئے دیتی تھیں۔ مسلمانوں کی جاں نثاری کا یہ عالم تھا کہ

آپ کے خیال میں ہمارا دین بہتر ہے یا اسلام۔ اس پر یہودی وفد نے اپنی تمام دینی تعلیم اور عقائد کو بلائے طاق رکھتے ہوئے یہ جواب دیا کہ قریش کا دین اسلام کے مقابلے میں حق سے قریب تر ہے۔ موحد یہودیوں نے توحیدِ اسلامی پر قریش کی بت پرستی کو حق بجانب کہہ کر جو ستم ڈھایا اُس پر سورہ النساء کی دو آیتیں نازل ہوئیں جن میں اُن پر لعنت بھیجی گئی اور ان کو نارِ جہنم کی وعید سنائی گئی۔

یہودیوں سے اصولی اتفاق کے بعد ابوسفیان، صفوان اور دیگر اہل قریش یہودی وفد کو خانہ کعبہ کے اندر لے گئے جہاں انھوں نے ایک دوسرے کا آخری وقت تک ساتھ دینے کی قسمیں کھائیں۔ قریش سے خاطر خواہ ملاقات کے بعد حمی بن اخطب کے وفد کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اس وفد کے اراکین نے فیصلہ کیا کہ اب جب کہ انھیں قریش کی حمایت حاصل ہو چکی ہے باقی قبائل کی طرف بھی رجوع کیا جائے۔ اُن کی عرب عصیت اُبھاری جائے۔ جس جس قبیلے کو داعیانِ اسلام سے کوئی صدمہ پہنچا ہے اُن کے زخم ہرے کئے جائیں۔ اُن پر نمک پاشی کر کے اپنے مذموم مقاصد حاصل کیے جائیں۔ چنانچہ یہ وفد فردا فردا ہر اُس قبیلے کے پاس پہنچا جن کا کوئی فرد مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا یا جسے مسلمانوں سے کسی قسم کی رنجش تھی۔ انھیں شہ دی، اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلایا۔ انھیں بتایا کہ قریش مکہ بھی ان کی معاونت کریں گے۔ اُن کے سامنے اُن کی بت پرستی کی توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے بھی ملائے۔ نبی اسد فوراً رضامند ہو گئے۔ ہو غطفان سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ مشترکہ جنگ میں قریش کا ساتھ دیں تو انھیں خیبر کی کھجوروں کی فصل کا نصف حصہ دیا جائے گا۔ اس طرح ہو غطفان کے ذیلی قبیلوں یعنی فزارہ، مُرہ اور اشجع سے دو ہزار کی نفری ہمارے دشمنوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ ہو مُسلم سے یہودی سات سو افراد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہو مُسلم کی بستیوں سے جنوب میں بسنے والے قبائل میں ہو عامر رسول اللہ سے اپنے معاہدے پر قائم رہے اور یہودی وفد کی کسی چال میں نہیں آئے۔ قریش

کے اپنے جنگجو چار ہزار تھے۔ یہ طے پایا کہ قریش اور ان کے جنوب میں بسنے والے حلیف مکے سے سمندر کے کنارے کنارے چل کر مدینہ پہنچیں گے۔ یہ وہی راستہ تھا جس پر چل کر وہ جنگِ احد کے لئے آئے تھے۔ دشمنوں کی فوج کے دوسرے حصے کو نجد کے میدانی علاقے کی طرف سے چل کر مدینے کی مشرقی سمت سے حملہ آور ہونا تھا۔ ہمارے دشمنوں کو یقین تھا کہ جب احد میں مسلمان تین ہزار سپاہیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے تو اب و اُن کی تعداد اُس سے تین گنا زیادہ تقریباً دس ہزار ہوگی۔ اب مسلمانوں کے چوتھے ہاتھ کیا امکان ہے۔

غرض یہ کہ یہودی قریش کی باہمی سازش نے سارے عربستان میں مسلمانوں کے خلاف ایک ایسا طوفان بھڑکا دیا تھا جو اسلام کے خلاف ایک برق بازن کر نوٹ پڑنے کے لئے بے قرار تھا۔ جس سے ہم پوری طرح باخبر تھے۔ آئے دن سحر آئے والے طرح طرح کی خبریں سناتے تھے۔ مگر ہمارے ہادی مطمئن نظر آتے تھے تو ہم میں سے کوئی بھی ہراساں نہ تھا۔



## بدرِ صغریٰ

”اے دشمنِ خدا ہم انشاء اللہ ضرور آئندہ سال بدر کے میدان میں تیرا انتظار کریں گے۔“

پینچمبرِ اسلام کا یہ اعلان جو انھوں نے اُحد میں ابو سفیان کا چیلنج قبول کرتے ہوئے میری زبانی ابو سفیان کو سنایا تھا ہمیں بھی یاد تھا، ابو سفیان کو بھی اور سارا عربستان اس معرکے کا منتظر تھا ہر قبیلے میں اس پر قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ جوں جوں وقت قریب آتا جاتا تھا ان قیاس آرائیوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

ابو سفیان نے اُحد سے چلتے چلتے اپنے دل کی بھر اس ضرور نکال لی تھی مگر اُس کا یہ بڑا بول اب اُس کے گلے کا پھندا بنا ہوا تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ سارے عربستان میں قحط پڑا ہوا تھا۔ مکے سے ہزاروں گھوڑوں، اونٹوں کو لے کر بدر جانا وہاں ان حالات میں اُن کی خوراک کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا۔ مدینے والوں کو آسانی تھی کہ بدر اُن سے چند میل

میں حاضر ہوئے۔ دونوں نے دو ٹوک الفاظ میں اپنا ماضی الضمیر بیان کیا کہ ہم فوج کشی کے حق میں ہیں۔ حبنا اللہ و نعم الوکیل جس پر آل عمران کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب لوگوں نے ان سے کہا:

ان لوگوں نے تمہارے مقابلے کے لئے سامان جمع کیا ہے۔

تو اللہ نے ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیا۔

اور انہوں نے کہہ دیا کہ ہم کو حق تعالیٰ کافی ہے۔

اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے۔

پس یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل سے بھرے ہوئے لوٹے اور انھیں کوئی ناگواری ذرا بھی پیش نہ آئی۔

(III-122-125)

اللہ کے نبی نے ابو بکرؓ اور عمرؓ کے الفاظ سن کر فرمایا

”میں بدر پہنچوں گا خواہ مجھے تمہا ہی کیوں نہ جانا پڑے۔“

ان الفاظ کی گونج سارے مدینے میں سنائی دی۔ اس اعلان کے ساتھ ایک طرف تو نعیم کے بیس اونٹ گئے اور دوسری طرف اسلامی لشکر تیار ہوا اور وقت مقررہ بدر پہنچ گیا۔ بات سنبھالنے کے لئے ابو سفیان بھی کچھ فوج لے کر مکے سے نکلا مگر ایک دو دن ادھر ادھر گھوم کر واپس آ گیا اور مکے پہنچ کر اعلان کر دیا کہ ہم تو گئے تھے مدینے والے ہی نہیں آئے۔ ایسے معاملات میں حقیقت کب چھپی رہتی ہے۔ سارے عرب میں ابو سفیان کی تھو تھو ہو گئی۔ صفوان تو سارے مکے میں کتا پھرتا تھا کہ یہ سب کچھ ابو سفیان اور محض ابو سفیان کا کیا دھرا ہے۔ اس سے ایسی عاقبت نااندیشی کی توقع نہیں تھی۔ ضرورت کیا پڑی تھی اسے احد کی کامیابی کے بعد اس قسم کے چیلنج دینے کی۔

کے فاصلے پر تھا۔ وقت سر پر آ گیا تھا اور ابو سفیان پریشان تھا۔ چیلنج اس نے خود دیا تھا اور وقت مقررہ پر اگر وہ اپنی فوج کو لے کر بدر نہ پہنچا اور مدینے والے پہنچ گئے تو ہمارے عرب میں اس کی ساکھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ قریش کا منہ کالا ہو جائے گا۔ وہ اور سمیل بن عمرو کئی دفعہ سر جوڑ کر بیٹھے مگر مسئلہ حل طلب تھا، حل طلب ہی رہا۔ سوچ سوچ کر دونوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے مشترک دوست نعیم بن مسعود کو راز میں لیا جائے۔ ابو عطفان کا یہ مرنجا مرنج شخص جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ سارے عرب کے سربر آوردہ لوگوں سے اس کے مراسم تھے۔ ابو سفیان نے جیسے ہی نعیم سے بات چھیڑی وہ معاملہ فہم شخص ساری بات سمجھ گیا۔ ابو سفیان نے اس سے درخواست کی کہ کوئی ایسی صورت پیدا کرو کہ محمد کا لشکر بدر نہ پہنچے اور قریش یہ کہنے کے قابل ہوں کہ ہم تو پوری طرح تیار بیٹھے تھے، مسلمان ہی نہیں اپنے تو ہم وہاں کس سے جا کر لڑتے۔ اس طرح تمام ذمے داری مدینے والوں پر پڑ جائے گی اور قریش سرخرو ہو جائیں گے۔ ابو سفیان نے نعیم کو پیشکش کی کہ اگر وہ مسلمانوں کو بدر پہنچنے سے روکنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ اس کو بیس اونٹ انعام دے گا۔

مہم جو نعیم ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہاں سے مدینے روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچتے ہی اپنے ملنے والوں کو جن میں انصار، مہاجر، منافق، یہودی سبھی شامل تھے قریش کی عظیم الشان جنگی تیاریوں کی ایسی ایسی من گھڑت تفصیلات سنائیں کہ بہت سوں کو یقین آ گیا۔ منافقین دل ہی دل میں خوش ہوتے، یہودیوں نے ذرا زیادہ خوشیاں منائیں اور دونوں نے مل کر اس بے بنیاد خبر کو ہر ممکن طریقے سے مدینے کے طول و عرض میں پھیلا دیا، یہاں تک کہ مسلمان بھی نفسیاتی دباؤ میں آ گئے۔ ان کے حلقوں میں بھی اس قسم کی سوچ کا اظہار کیا جانے لگا کہ قریش کی اتنی زبردست تیاری کے بعد، ان کے خلاف مقابلے پر اترنا، صریحاً خود کشی ہے۔ ان خیالات کی گونج ابو بکرؓ اور عمر فاروقؓ نے بھی سنی تو بیتاب ہو کر حضورؐ کی خدمت

## غزوہ احزاب

آج دمشق کی اس مُد سکون فضا میں اُن حالات کا تصور بھی مشکل ہے لیکن ہجرت کے پانچویں سال موسم سرما میں، جب مدینے میں عرب قبائل کے اجتماعی حملے کی تیاریوں کی خبریں پہنچیں، تو ہماری پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ خبر ملی کہ مکے میں دارالندوہ میں قریش کا ایک اجلاس ہوا ہے جس میں قریش کا علم جنگ لہرایا گیا۔ عثمان بن طلحہ کو علم برداری کا منصب سونپا گیا۔ شاید اس لئے کہ اُحد میں یہ منصب عثمان کے باپ کو دیا گیا تھا اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ مکے سے آنے والوں نے یہ بھی خبریں سنائیں کہ قریش نے ابوسفیان کی سربراہی میں چار ہزار شمشیر زنوں کا لشکر تیار کیا ہے جس میں تین سو گھوڑے اور ایک ہزار برق رفتار اونٹنیاں شامل ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ہوفزارہ سے عثیہ بن حصن کی قیادت میں گھڑ سواروں کے دل کے دل نکلے ہیں اور اُن کے جلو میں بھی ایک ہزار تیز رفتار سائڈنیوں

ہیں۔ چنانچہ اسی حکمتِ عملی پر عمل کیا گیا۔ خندق کے اس طرف جو قریبی مکان تھے خالی کر لئے گئے۔ تمام عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کو خندق سے دو فرلانگ کے فاصلے پر حویلیوں اور بڑے بڑے گھروں میں منتقل کر دیا گیا۔ خندق کی کھدائی میں جو چھوٹے بڑے پتھر نکلتے تھے انھیں دشمنوں پر برسانے کے لئے جگہ جگہ ڈھیر کرتے جاتے تھے۔ سلح کی پہاڑی کے دامن سے بھی مناسب وزن کے پتھروں کو جمع کر کے ان ڈھیروں میں شامل کر دیا گیا۔ یہ قریطہ سے باہمی تعاون کا معاہدہ تھا، ان سے کدالیں، پھاوڑے، پھلے اور مٹی پھینکنے کے لئے کھجوریں رکھنے کی نوکریاں حاصل کی گئیں۔ منہ اندھیرے نماز فجر کے بعد کھدائی کا کام شروع ہو جاتا تھا جو مغرب تک جاری رہتا۔ کھدائی کرنے والوں نے اپنی قمیضیں اتار رکھی تھیں۔ جب مٹی پھینکنے کے لئے نوکریاں کم پڑتیں تو اپنی قمیضوں ہی میں مٹی بھر بھر کر پھینکتے جاتے تھے۔

یہ خندق مسلسل نہیں تھی۔ جگہ جگہ بڑی بڑی چٹانیں تھیں۔ مکانات بنے ہوئے تھے جو خود حملہ آوروں کے خلاف رکاوٹ تھے۔ جہاں پہاڑیا مکان نہیں تھے ان حصوں میں خندق کھود کر کہیں مکانوں اور کہیں پہاڑوں سے ملانا تھا تاکہ مدافعت مکمل ہو جائے۔ خندق کھودنے والے ہر شخص کو احساس تھا کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ سستی اور سہل انگاری کی کوئی گنجائش نہیں۔ چاہے کئی وقتوں کا فاتحہ ہے، چاہے تھک کر نڈھال ہو چکے ہیں لیکن کام کئے جانا ہے کیوں کہ دشمنوں کے پہنچنے سے پہلے خندق تیار نہ ہوئی تو مدینے کا ایک فرد بھی ان کے ظلم اور سفاکی سے نہ بچ سکے گا۔ انھیں یاد تھا کہ اُحد میں ان ظالموں نے کس طرح لاشوں کا منٹہ کیا تھا۔ اور اب تو انھوں نے اسلام کی مکمل فتح گنی کا عزم کر رکھا تھا۔ مستقبل کا سارا نقشہ انھیں اپنی نظروں کے سامنے چلتا پھرتا دکھائی دے رہا تھا۔

یہ ساری باتیں میں تفصیل سے اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ میرے سامنے ان

ہیں۔ قبیلہ ہومرہ کے چار سو جنگجو حارث بن عوف کی کمان میں مسلمانوں سے جنگ کے لئے نکلے ہیں۔ قبیلہ اشجع سے خبر ملی کہ انھوں نے بھی مسعر بن زخیلہ کو اپنے چار سو تیغ زنوں کا سردار بنا کر بھیجا ہے۔ اُدھر سے ہو مسکیم سات سو افراد کا لشکر لے کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ اسی طرح ہو اسد اور ہو سعد کی لشکر کشی کی تیاریوں کی بھی خبریں ملیں۔ ساری خبریں یکجا ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ کم و بیش دس ہزار کا لشکر ہے جو ابو سفیان کی قیادت میں مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ صحرائے عرب میں یوں تو آئے دن کوئی نہ کوئی معرکہ ہوتا رہتا تھا لیکن فوج کشی کے لئے اتنا بڑا اژدھام پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا اور فوج کشی بھی ایسی کہ ان کی تعداد میں، ان کے رسل و وسائل کی سہولتوں میں، ان کے اسلحہ میں ان کے رسل کے انتظامات میں اور ہمارے وسائل میں زمین آسمان کا فرق تھا اور شاید یہ آسمانی فرق ہی تھا جس نے ہماری اور ہمارے آفاقی دین کی لاج رکھ لی۔ جوں ہی قریش نے مکے سے کوچ کی تیاری کی، ہو خزاعہ کے چند گھڑ سواروں نے برق رفتاری کے ساتھ صرف چار دن میں مدینے کی مسافت طے کر کے حضور کو تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اب گنا چنا وقت رہ گیا تھا۔ ایک ہفتے میں دشمن سر پر ان پہنچے گا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ مسجد نبوی میں نبی کریم نے اپنے رفقاء کو مشورے کے لئے جمع فرمایا، بالکل ویسے ہی جیسے جنگ اُحد سے قبل انھوں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تھا۔ جنگ کی حکمتِ عملی پر مباحثہ ہو اور نہایت غور و خوض کے بعد ہمارے قائد نے سلمان فارسی کی رائے سے اتفاق فرمایا۔ سلمان کی تجویز یہ تھی کہ جنگ مدینے کے اندر رہ کر لڑی جائے۔ مدینے کے تین اطراف تو پہاڑ ہیں جہاں سے حملہ نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف شام کی سمت پہاڑ نہیں ہیں۔ ہمارے دائیں بائیں کے دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی گہری اور چوڑی خندق کھودی جائے جس کا عبور ساڈنی سواروں اور گھڑ سواروں کے لئے ممکن نہ ہو۔ انھوں نے بتلایا کہ اہل فارس یہ طریقہ بہت کامیابی سے استعمال کرتے

بند ہوا، اتارو شن کہ مدینے کا شہر اور جنوبی علاقہ روشن ہو گیا۔ پھر انھوں نے ایک اور ضرب لگائی تو اسی طرح چنگاریاں بلند ہوئیں لیکن اس مرتبہ اُحد اور اُس کے اُدھر کا تمام شمالی علاقہ روشن ہو گیا۔ تیسری ضرب لگی تو پتھر ریزہ ریزہ ہو گیا اور اس مرتبہ جو روشنی نکلی تو تمام مشرقی علاقے میں چکا چوندا ہو گئی۔ اس وقت میں حضورؐ کے خیمے میں خدمت پر مامور تھا۔ سلمان فارسیؓ البتہ وہاں موجود تھے۔ انھوں نے یہ تمام ماجرا مجھے سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں نے یہ روشنیاں دیکھیں تو نبی مکرمؐ سے اس کی تعبیر پوچھی۔ حضورؐ نے فرمایا سلمان پہلی روشنی میں میں نے یمن کے محلات دیکھے۔ دوسری میں مجھے شام کے محلات نظر آئے اور تیسری روشنی میں مجھے مدائن میں کسریٰ کا سفید محل دکھائی دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بشارات ملی ہے کہ میرے لئے پہلی روشنی کے ذریعے یمن کی راہ کھول دی گئی ہے۔ دوسری کے ذریعے شام اور تیسری کے ذریعے مشرق کے راستے وا کر دئے گئے ہیں۔

ہم میں سے بیشتر کو کئی کئی وقت کا فاقہ رہتا تھا۔ اُدھر سخت محنت کشی ہمیں نڈھال کئے دیتی تھی۔ خود رسالت مآبؐ بھی کئی کئی وقت کے فاقے سے رہتے تھے۔ جب جاہلؓ نے اُن سے پتھر ہلانے کے لئے مدد مانگی تھی تو انھیں کئی روز بعد حضورؐ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ حضورؐ انھیں بہت کمزور دکھائی دئے۔ جاہلؓ نے گھر جا کر اپنی بیوی سمومہؓ اس پریشانی کا حال سنایا تو انھوں نے کہا ہمارے پاس تو صرف یہ ایک بھیڑ کا چھوٹا سا بچہ ہے اور کٹھ جو۔ چنانچہ انھوں نے بھیڑ کے بچے کو ذبح کر کے پکالیا اور جو پیس کر کچھ روٹیاں بنالیں۔ اُس دن جب کام کرتے کرتے رات ہو گئی اور اندھیرے میں نظر آنا بند ہو گیا تو جاہلؓ رسول اکرمؐ کے پاس گئے اور انھیں شام کے کھانے کی دعوت دی۔ جاہلؓ یہ قصہ بڑے شوق سے بیان کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ رسول اللہؐ نے میری ہتھیلی پر ہتھیلی رکھ دی اور میری انگلیاں اپنی انگلیوں میں جکڑ لیں۔ میں نے تو صرف انھیں دعوت دی تھی مگر انھوں نے عام اعلان کروا دیا کہ

ہو لٹا کہ دونوں کی بے شمار تصویریں چل پھر رہی ہیں۔ کھدائی کرنے والے مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اُن کے معاون سروں پر مٹی بھری ٹوکریاں لادے قطار در قطار مٹی باہر پھینکتے جاتے تھے۔ خندق رفتہ رفتہ گہری ہوتی گئی۔ سلمان فارسیؓ تن دتوش کے بہت مضبوط تھے، پھر بنو قریظہ کی ملازمت کے دوران میں انھیں مٹی کھودنے کی خاصی مشق ہو گئی تھی۔ ہر شخص اُن کی کارکردگی پر عیش کر رہا تھا۔ ماجرا انھیں اپنی صف میں شامل کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ وہ بھی اُن کی طرح تلاشِ حق میں باہر سے آئے ہیں۔ انصار دلیلیں دیتے کہ نہیں وہ نبیؐ کے ورود سے پہلے مدینے میں موجود تھے، اس لئے وہ انصار میں سے ہیں۔ حضورؐ دونوں کی باتیں سن سن کر مُسکراتے رہتے۔ آخر ایک دفعہ جب یہ گفتگو طول پکڑ گئی تو سرکارِ دو عالمؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

”سلمان ہمارا ہے۔ نبیؐ کے گھر کا فرد ہے۔“

نبیؐ کے گھر کا فرد ہونے کا شرف مجھے بھی بخشا گیا تھا۔ نبیؐ محترمؐ بھی خندق کی کھدائی کے تمام کام میں برابر شرکت فرماتے رہے۔ کبھی ایک ٹولی کے ساتھ ہوتے کبھی دوسری کے ساتھ۔ مگر حکم تھا کہ جب کوئی مشکل پیش آئے یا کوئی غیر متوقع صورت حال کا سامنا ہو تو وہ جہاں بھی ہوں انھیں مطلع کیا جائے۔ ایسی پہلی صورت حال جاہلؓ کو پیش آئی۔ وہ جہاں کھدائی کر رہے تھے وہاں زمین سے ایک اتنا بڑا پتھر نکل آیا جو کسی اوزار سے ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ رسالت مآبؐ کو اطلاع دی گئی وہ وہاں پہنچے۔ انھوں نے پانی منگوایا اور اس میں اپنا لعاب دہن شامل کیا۔ پھر وہ پانی پتھر پر چھڑک دیا۔ پھر جب سب نے مل کر زور لگایا تو وہ پتھر آسانی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ دوسری مرتبہ ماجرین کی ٹولی کی طرف سے مدد کی درخواست موصول ہوئی۔ عمرؓ نے رسول اللہؐ سے عرض کی کہ ایک بہت بڑا پتھر ہے جو کسی طرح اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ رسالت مآبؐ وہاں پہنچے، انھوں نے عمرؓ کے ہاتھ سے کڈال لے کر پتھر پر ایک ضرب لگائی جس سے ایک شعلہ

آج جاہز کے یہاں ہم سب کی دعوت ہے۔ میں پریشان ہو کر گھر روانہ ہوا اور اپنی بیوی کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بیوی نے ذرا توقف کے بعد سوال کیا کہ سب کو دعوت تم نے دی ہے یا حضورؐ نے اپنی طرف سے۔ میں نے کہا یہ اُن کا اپنا فیصلہ تھا۔ بیوی نے یہ سُن کر کہا تو پھر وہ بہتر سمجھتے ہیں۔ حضورؐ دس صحابہ کے ساتھ جاہز کے گھر پہنچے۔ کھانا اُن کے سامنے چین دیا گیا۔ اُنھوں نے اس پر اللہ کا نام لے کر برکت کی دُعا مانگی۔ جب سب سیر ہو کر کھانے کے لیے اُٹھے تو کھانا ابھی باقی تھا۔ پھر اسی طرح دس دس کی ٹولیاں آتی رہیں اور سیر ہو کر لوٹتی رہیں۔ میں آخری ٹولی میں تھا۔ ہمارے کھانے کے بعد بھی کچھ کھانا چ رہا تھا۔ ہر شخص اپنی آنکھوں سے اللہ کی رحمت دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں شکر جلالا رہا تھا۔ حضورؐ تمام وقت دن بھر کے تھکے ماندے لوگوں کو سیر ہو کر کھاتے دیکھ کر تبسم فرماتے رہے اور میں سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کس کس انداز سے اپنی رزاقی کی لاج رکھتا ہے۔

چھ دن کی محنتِ شاقہ کے بعد خندق تیار ہو گئی۔ ہم لوگوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کہ ہماری محنت بر آئی۔ اب صرف اللہ تعالیٰ سے دُعا تھی کہ وہ ہمیں نصرتِ عطا فرمائے اور اس امتحان میں سرخرو کرے۔

خندق مکمل ہوتے ہی حضورِ اکرمؐ نے خندق کے ساتھ ہی پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ خود آپ کا سرخ چڑے کا خیمہ عین کوہِ سلح کے دامن میں نصب کیا گیا۔

اُدھر قریش حملہ آور اپنے ساتھیوں سمیت مدینے کے نواح میں جنوب مغرب کی طرف سے پہنچے۔ وہ مکے سے ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ اسی راستے سے آئے تھے جو انھوں نے غزوہٴ اُحد کے وقت اختیار کیا تھا۔ یہ غطفان اور نجد کے دوسرے قبیلوں کے لشکر مشرق یعنی صحرائے نجد کی طرف سے پہنچے۔ دونوں لشکر اُحد میں جمع ہوئے اس خیال سے کہ اب بھی اُحد ہی میدانِ جنگ بنے گا۔ اُحد کے قریب پہنچتے پہنچتے پہلا صدمہ تو انہیں یہ

دیکھ کر ہوا کہ خریف کی ساری فصل کٹ چکی ہے اور اب اُن کے اونٹوں کو خود رو خاردار جھاڑیوں پر گزارا کرنا ہو گا۔ گھوڑوں کے لئے چارہ بس وہی تھا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے جو قطعاً کافی تھا۔ اُنھوں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اب جو بھی ہونا ہے بلاتا خیر ہو جانا چاہئے۔ جب اُحد میں اُنھیں دُور دور تک مسلمانوں کا کہیں نام و نشان نہ دکھائی دیا تو فیصلہ کیا کہ مدینے کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ خالد اور عکرمہ جو جیشِ قریش کے گھڑ سوار دستوں کی کمان کر رہے تھے مدینے کی طرف لپکے۔ خندق کی مدینے والی سمت کی سطح مخالف سمت کی سطح سے ذرا بلند تھی چنانچہ اُنھیں دُور ہی سے مسلمانوں کا پڑاؤ نظر آ گیا۔ اُن کا خیال تھا کہ ان مٹھی بھر لوگوں کو تو وہ محض اپنی تعداد سے کچل کر رکھ دیں گے لیکن خندق اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ جوں ہی وہ ذرا قریب آئے اور اُنھیں اپنے راستے میں ایک ناقابلِ عبور خندق حائل نظر آئی تو دانت پیس کر رہ گئے۔ کچھ نہ بن پڑا تو زچ ہو کر باوا ز بلند کہنے لگے کہ اس طرح اوٹ سے لڑنا عربوں کی حیثیت کی تو ہیں ہے۔

اب صورتِ حال سب کے سامنے تھی۔ مسلمان خندق کے اس پار مدینے کی طرف تیر اندازوں کے پرے جمائے بیٹھے تھے اور کھار خندق کے اُس پار خندق عبور کرنے کی کوشش میں کبھی قریب آتے تھے، کبھی تیروں کی بارش سے زخمی ہو کر پلٹ جاتے تھے۔ اُدھر سے بھی تیر اندازی ہو رہی تھی۔ ایک تیر سعد بن معاذؓ کے بازو میں لگا جس سے اُن کی ایک رگ کٹ گئی۔ اُدھر بھی بہت سے لوگوں نے تیروں کے زخم کھائے۔ قریش اور غطفان کے کئی گھوڑے بھی تیروں سے زخمی ہو کر گرے۔ خندق میں ایک جگہ ایسی تھی جس کی چوڑائی نسبتاً کم تھی۔ دشمنوں کی اُس پر نظر تھی۔ وہ سارا دن اُس جگہ کا معائنہ کرتے رہتے تھے، ہم لوگوں نے بھی وہاں اپنا پہرہ سخت کر رکھا تھا۔ ایک لمحہ ایسا آیا کہ قریش کے دستوں نے محسوس کیا کہ اس مقام پر مسلمانوں کا پہرہ اتنا سخت نہیں رہا۔ چنانچہ عمرو بن عبد اُود، عکرمہ،

ضرار بن الخطاب اور قبیلہ مخزوم کے نوفل نے گھوڑوں کو ممیز دی اور خندق پار کر کے مسلمانوں کے سر پر آکھڑے ہوئے۔ علیؑ اور عمرؓ نے چشم زدن میں آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک دیا۔ عمرو بن عبد اود نے مبارزت طلب کی اور علیؑ کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا۔ باقی اٹے قدمے لوٹے اور آنا فانا خندق پار کر گئے۔ لیکن نوفل کا گھوڑا خندق پار نہ کر سکا اور سوار سمیت خندق میں گر گیا۔ نوفل پر مسلمانوں نے پتھروں کی بوچھاڑ کر دی۔ آخر اُس بد نصیب نے خود ہی درخواست کی کہ اس سے بہتر ہے اُسے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ چند مسلمان نیچے اترے اور اُسے قتل کر کے اُس کی لاش پر مٹی پھینک دی۔

ابھی میں نے کہا تھا کہ صورتِ حال اب بالکل واضح ہو گئی تھی مگر در پردہ دو شخص ایسے کردار لو کر رہے تھے جو بے حد اہمیت کے حامل تھے اور جس سے عام لوگ بے خبر تھے۔ ایک توحی بن الخطاب کا کردار تھا جو ہو قریظہ کے درپے تھا کہ وہ محمدؐ سے اپنا معاہدہ توڑ دیں۔ ہو قریظہ کا سردار کعب ابن سعد اور ہو قریظہ کے تمام لوگ اسے منحوس سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُس کی وجہ سے ہو نفیر پر آفت نازل ہوئی تھی۔ جب حیی بن الخطاب ہو قریظہ کے قلعے پر پہنچا تو اس کا نام سن کر کعب نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ بڑی منت سماجت کے بعد اُس نے دروازہ کھلویا تو کعب اُس کی کوئی بات سننے پر رضامند نہ نظر آیا۔ حیی اپنے دلائل پیش کرتا گیا اور آخر کعب کو اپنی چکنی چڑی باتوں میں لے آیا۔ آخری بات اس نے یہ کی کہ اول تو قریش کی ناکامی کا کوئی امکان ہی نہیں اور بالفرض اگر حجت کی خاطر مان بھی لیا جائے تو حیی، ہو قریظہ کے قلعے میں ہو قریظہ کے دوش بدوش محمدؐ کی انتقامی کارروائی کا مقابلہ کرے گا، ان کے ساتھ جان دے گا۔ کعب اُس کی لچھے دار باتوں میں آ گیا۔ حیی نے ان کا تحریری معاہدہ منگوا لیا اور اپنے ہاتھوں سے اُس کو پھاڑ کر دو ٹکڑے کر دیا۔ کعب نے جب اپنے قبیلے کے لوگوں کو یہ خبر سنائی تو ان میں سے اکثر نے اس کی مخالفت کی مگر پس و پیش کا وقت اب گزر چکا تھا اور کعب نے

کفار کی حمایت کی ٹھان لی تھی۔ خندق کے اُس پار ہو قریظہ میں بھی منافقین کی خاصی تعداد اپنے کاموں میں سرگرم تھی۔ ان کی طرف سے رسول اللہؐ کے کانوں میں بھنک پڑی کہ ہو قریظہ معاہدہ منسوخ کر چکے ہیں۔ وہ بے حد پریشان ہو گئے انھوں نے فوراً اوس کے سعد بن معاذؓ، خزرج کے سعد بن عبادہؓ، زبیرؓ اور اُسید بن حنفیرؓ کو اس ناگمانی خبر کی تصدیق کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ لوگ ہو قریظہ کے پاس پہنچے تو انھوں نے انھیں رسالت مآبؐ کے خلاف نہایت توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے سنا۔ ہو قریظہ نے ان کی ایک دلیل نہ سنی۔ واپس آکر انھوں نے بڑی پردہ داری سے حضورؐ کو صورتِ حال سے مطلع کر دیا۔ نبی اکرمؐ نے ان کی روداد سن کر باواز بند اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور مسلمانوں کو حوصلہ بلند رکھنے کی تلقین کی۔

دوسرا اہم کردار اس معرکے کا نفیم بن مسعودؓ تھے جو اس وقت سامنے آئے جب ہو قریظہ کی بد عمدی سے حضورؐ بے حد پریشان تھے۔ دشمنوں کی صفوں میں بھی کچھ پریشانیاں تھیں۔ ہو غطفان کا قریش اور یہود سے کوئی اصولی معاہدہ نہیں تھا وہ انھیں لوٹ مار اور خیبر کی فصل کے نصف حصے کا لالچ دے کر ساتھ لائے تھے۔ اب ہو غطفان محاصرے کے طول سے گھبرا رہے تھے۔ اپنی اور اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کی خوراک کی کمی انھیں بد حال کئے دے رہی تھی۔ دو ہفتے گزر چکے تھے۔ ہر روز ان کے کئی گھوڑے بھوک سے اٹھ ہال ہو کر مر جاتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنا ایک نمائندہ حارث غطفانی محسن عالم کی طرف بھیجا اور کہا کہ اگر آپ ہم کو مدینے کی کھجوروں کی فصل سے نصف حصہ دینے پر رضامند ہوں تو ہم اپنے گھروں کو واپس لوٹ جائیں گے۔ مگر انصارِ مدینہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

نفیمؓ ہو غطفان کی شاخ ہو اشجع کے فرد تھے اور اپنے قبیلے کے ساتھ اس مہم میں ان کے شریک تھے۔ جنگِ احزاب ہی کے دنوں میں انھوں نے اپنے قلب میں اسلام کی روشنی محسوس کی اور ایک دن بے قرار ہو کر چھپتے پھپھاتے مدینے پہنچے اور سرورِ دو عالم کے خیمے میں

حاضر ہو گئے۔ نبی اکرمؐ انھیں دیکھ کر حیران ہوئے اور پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔ نَعِیمؑ نے اپنا مدعا بیان کیا اور بیعت کر کے باقاعدہ حلقہٴ اسلام میں داخل ہو گئے۔ قلب میں اسلام کی شمع جلی تو اسلام کا درد بھی محسوس ہوا۔ حضورؐ سے پوچھنے لگے کہ دریں حالات وہ دین کی کیا خدمت بجالا سکتے ہیں۔ آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ اسلام دشمن قبائل میں جس طرح ممکن ہو پھوٹ ڈالو۔ نَعِیمؑ نے پوچھا کہ اگر مجھے اس سلسلے میں تھوڑی بہت دروغ گوئی کر کے کسی کو فریب دینا پڑے تو حضورؐ نے معاف فرمایا:

”جنگ تو ہے ہی سراسر فریب۔“

نَعِیمؑ بارگاہِ رسالت سے اُٹھے تو مکمل طور پر بدلے ہوئے انسان تھے۔ سیدھے ہو قریظہ کے پاس پہنچے۔ کعب نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی، لیکن نَعِیمؑ نے کہا کہ اس وقت میں اپنی خاطر تواضع کرانے نہیں آیا بلکہ تم کو ایک بڑی مصیبت سے خبردار کرنے آیا ہوں۔ محمدؐ سے بیان شکنی ہو سکتا ہے تمہیں بہت منگنی پڑے۔ کعب جو یہ سننے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا ایک دم چوکنہ ہو گیا۔ نَعِیمؑ نے کہا جنگ بہر نوع جنگ ہے اور آخری میدان کسی کے ہاتھ بھی رہ سکتا ہے۔ اگر قریش اور ہو غطفان وغیرہ کامیاب ہوتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اُس ایک فیصد اتفاق سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ کسی وجہ سے جنگ کا پانسہ پلٹ جائے اور قریش اپنے ساتھیوں سمیت اپنے گھروں کا رخ کر جائیں، پھر تمہارا کیا حشر ہو گا۔ تمہیں تو یہاں مسلمانوں کے درمیان ہی رہنا ہے۔ مسلمانوں کے انتقام کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ تم لوگوں کا تو نشان باقی نہیں رہے گا۔ کعب یہ باتیں غور سے سن رہا تھا۔ نَعِیمؑ کے خدشات ہو قریظہ کو اپنے دل کی آواز محسوس ہوئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ معاہدہ تو وہ توڑ چکے تھے، بلکہ مسلمانوں کے ایک وفد کے سامنے رسول اکرمؐ کے لئے نہایت اہانت آمیز لفظ بھی استعمال کر چکے تھے۔ نَعِیمؑ نے انھیں مشورہ دیا کہ قریش اور ہو غطفان کو

واقعی پابند کرنے کے لئے کہ وہ انھیں مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار نہ ہو جائیں ہو قریظہ کو چاہئے کہ وہ ضمانت کے طور پر دونوں بڑے قبیلوں سے کچھ سربر آوردہ شخصیتوں کو اپنے پاس بطور ضمانت رکھ لیں تاکہ اگر قریش اور ہو غطفان کے دل میں کسی وقت یہ خیال آ بھی جائے کہ وہ ہو قریظہ کو اپنے حال پر چھوڑ کر واپس چلے جائیں تو اس پر عمل کرنے سے پہلے سومرتبہ سوچیں۔ ہو قریظہ کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ یہ کہہ کہ نَعِیمؑ سیدھے ابو سفیان کے خیمے میں پہنچے اور کہنے لگے کہ میں نے کچھ باتیں سنی ہیں جن کا آپ کو علم ہونا چاہیے۔ ابو سفیان نے وضاحت چاہی تو انھوں نے سخت رازداری کا وعدہ لے کر کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ ہو قریظہ مسلمانوں سے معاہدہ توڑ کر اپنے فیصلے پر بہت بچھتا رہے ہیں۔ بے حد پشیمان ہیں اور اب وہ مسلمانوں کے خلاف اپنی سابقہ کارروائی کی تلافی کے راستے ڈھونڈ رہے ہیں۔ انھوں نے طے کیا ہے کہ کسی طرح قریش اور غطفان کے چند اہم لوگ حاصل کئے جائیں اور انھیں محمدؐ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ انھیں قتل کر کے ہو قریظہ کی خطا معاف کر دیں۔ اٹھتے اٹھتے پھر انھوں نے ابو سفیان سے وعدہ لیا کہ وہ ان کی تمام گفتگو صیغہ راز میں رکھے گا۔ وہاں سے اُٹھ کر نَعِیمؑ سیدھے ہو غطفان کے پاس پہنچے اور انھیں بھی وہ کچھ کہا جو ابو سفیان سے لیا تھا اور اُن سے بھی رازداری کا وعدہ لے لیا۔ ابو سفیان سیانا آدمی تھا مگر اُس کے دل میں شک کی لکیر سی پڑ گئی۔ وہ بے حد فکر مند ہو گیا۔ اس کا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ دوسرے ہی دن اُس نے ہو قریظہ کو پیغام بھجوایا کہ کل صبح حملے کے لئے تیار ہو جائیں۔ وہاں سے صاف جواب مل گیا کہ کل تو یومِ سبت ہے لڑائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اب وہ آئندہ بھی اگر جنگ میں شریک ہوئے تو اس شرط پر ہوں گے کہ پہلے ہو قریش اور ہو غطفان اپنے کچھ مقتدر رہنے والوں کے حوالے کر دیں۔ اب تو ابو سفیان کا شک پورے یقین سے بدل گیا۔ نَعِیمؑ کی بتائی ہوئی ایک ایک بات درست معلوم ہونے لگی۔ اُدھر نَعِیمؑ ابو سفیان اور ہو غطفان سے گفتگو کے بعد چھپتے چھپاتے ہمارے خیموں میں پہنچے۔ میں نے حضورؐ کو اُن کی



آمد کی اطلاع دی۔ حضورؐ نے فوراً باریائی کی اجازت عطا فرمائی۔ نعیمؑ نے بڑی تفصیل سے اپنی کارروائی کی روداد سنائی۔ ہم سب تو ان کی گفتگو سے حظ اٹھا ہی رہے تھے لیکن نبی کریمؐ بہت زیادہ لطف اندوز ہو رہے تھے۔ خاص طور پر ابوسفیان سے نعیمؑ کی ملاقات کی تفصیل سن کر سرور کائناتؐ بے حد محظوظ ہوئے۔ ان کا پور پور مسکرا رہا تھا۔

ابوسفیان حضورؐ کا بچپن کا ساتھی تھا۔ دونوں ساتھ پلے بڑھے تھے۔ وہ اس شعلہ خُو کے مزاج سے واقف تھے۔ اُس کی کمزوریوں سے آشنا تھے۔ اُس کی حد سے بڑھی ہوئی انا کو جانتے تھے۔ اُنھیں اندازہ تھا کہ وہ جب کسی بات پر اڑ جاتا تھا تو کسی کی نہ سنتا تھا۔ خود سری جو خود پرستی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی اس کے خمیر کا حصہ تھی۔ بر خود غلط اتنا تھا کہ اپنی رائے کے مقابلے میں بہتر سے بہتر رائے کو بے وقعت سمجھتا تھا۔ خود کو عقل کل جانتا تھا۔ اپنی غلطی تسلیم کرنا اُس کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ حضورؐ بار بار نعیمؑ سے تفصیل دہرانے کو کہتے۔ فرماتے اچھا تو جب تم نے یہ کہا تو پھر ابوسفیان نے کیا کہا۔ جب تم نے پہلے پہل بات چھیڑی تو اس کا رد عمل کیا تھا۔ تم نے پہلے پہل بات کیسے شروع کی۔ اٹھ کے آئے تو ابوسفیان کے چہرے پر کیا تاثر تھا۔ ہر بات مسکرا مسکرا کر بار بار پوچھتے۔ ہم سب کے سر سے بھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ آویزش کی بنیاد پڑ گئی تھی اور دشمنوں کے درمیان ایک دوسرے پر اعتبار اٹھ گیا تھا۔ جو ان حالات میں ہمارے لئے ارحم الراحمین کا احسانِ عظیم تھا۔ اب ہمیں احساس ہو چلا تھا کہ دشمن کی مہم جوئی عملاً بے اثر ہوتی جا رہی ہے۔ تین دن اور گزر گئے اور صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ صرف یہ اطلاع ملتی رہتی تھی کہ یہود اور قریش نے جو بھان متی کا کتبہ جوڑا تھا اور جس کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ بس ایک دن کا کام ہے۔ مسلمانوں کو ختم کر کے لوٹ مار کریں گے اور فاتح و کامران اپنے اپنے گھروں کو واپس آ جائیں گے۔ وہ کتبہ اب بے یقینی کا شکار ہو کر ایک دوسرے سے منحرف ہوتا جا رہا تھا۔ اور

اب اُنھیں کسی کامیابی کا یقین نہیں رہا تھا۔ ہمارے اپنے خیموں میں بھی بھوک اور سردی سے حالات دگرگوں تھے۔ خالق و مالک کائنات سے دعائیں مانگتے تھے کہ یہ عذاب جلد ختم ہو۔ نبی پاکؐ ساری ساری رات عبادت اور دعاؤں میں گزارتے تھے۔ پھر جو ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ مجھے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ کیسے ایک نختہ رات میں برق و باد و باران کا طوفان آیا اور کیسے دشمنوں کا ایک ایک خیمہ اکھڑ کر ہوا کے تھپڑوں میں اڑتا پھرا، کیسے دشمنوں کے سب سے بڑے سرغنہ ابوسفیان نے محاصرہ توڑ کر واپس جانے کا اعلان کیا اور کسی کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود مکے کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضورؐ کے حکم پر 'حذیفہ' خندق کے اُس پار گئے اور اپنی آنکھوں سے سارا ماجرا دیکھ کر حضورؐ کو سنایا۔ ہم سب نے کلمہ شکر ادا کیا۔ علی الصبح رسول کریمؐ نے مجھے اذان دینے کا حکم دیا۔ اذان میں جب میں نے اللہ اکبر کے الفاظ ادا کئے تو خندق کے پار خیموں کی تباہی اور دشمن کی پسپائی کا منظر مجھے اللہ اکبر کی تفسیر دکھائی دیا۔ دھندلی دھندلی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا کہ اُدھر کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ تمام خیمے اکھڑے پڑے ہیں۔ چاروں طرف بکھرا ہوا ساز و سامان گواہی دے رہا تھا کہ غنیم کس افراتفری کے عالم میں فرار ہوا ہے۔ اسی موقع پر سورہ احزاب کی نویں آیت نازل ہوئی، جس میں ربِّ ذوالجلال والا کرام نے اس احسان کا بیان فرمایا ہے۔ اذان کے بعد اقامت ہوئی۔ ہادی برحقؐ نے امامت فرمائی۔ ہر شخص دل ہی دل میں شکر کے ہزار ہزار سجدے کر رہا تھا۔ سب کی آنکھیں رحمان الرحیم کے کرم سے اشکبار تھیں۔ نماز پڑھ کر سب اپنے اپنے خیموں کی طرف روانہ ہو گئے لیکن میں دیر تک اُجڑے اکھڑے خیموں کو دیکھتا رہا۔ میرے لبوں پر یہ کلمہ جاری تھا لا حول والاقوة الا باللہ العلی اعظیم۔ جسے میں اکثر رسول اللہؐ کے منہ سے سنا کرتا تھا۔

میں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا و کفیٰ بربک بادیٰ و نصیر اللہ بلند و برتر کے سوا

میں پتہ نہیں کتنی دیر اور انھیں خیالوں میں گم رہتا کہ میرے کانوں میں کوچ کا اعلان گونجا۔ اعلان سنتے ہی میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور کوچ کے انتظامات میں لگ گیا۔ حضورؐ کے خیمے کا سارا سامان اور خیمہ اکھاڑ کر اونٹ پر لاد اور اُن کی ہمرکابی میں مدینے کا رخ کیا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کا مجھ پر کتنا کرم ہے کہ نصرت و کامرانی کی ایک اور اذان میرے حصے میں آئی۔

کوئی اور طاقت، کوئی قوت نہیں۔ وہی نصیر ہے، وہی سمیع ہے۔ وہی یکتا و یگانہ، دلوں کے راز جاننے والا وہ طاقت رکھتا ہے کہ جو وہ چاہے وہ ہو جائے۔ وہ جب اپنے امکانات کے پچھے ہوئے خزانے پر ارادہ تخلیق کی نظر ڈالتا ہے تو غیب سے اشیاء خلعت وجود سے آراستہ ہو کر پردہ ہستی پر آنے لگتی ہیں۔ وہ ہر لحظہ اپنے آپ کو منواسکتا ہے۔ یہ کوتاہ فہم اور بد نما لوگ جو ہمارے خلاف، ہمارے دین کے خلاف محض اپنی تعداد، اسلحہ اور نخوت کے زور پر اُٹھ آئے تھے اُس ذاتِ مطلق کے دائرہ اختیار کا کوئی تصور نہیں رکھتے تھے۔ وہ خود پرست، بد خواہ، اپنی قوت کے بل پر اپنے تئیں مختارِ کل ہونے کا زعم رکھتے تھے، گویا وہ خود اپنے آپ کو نعوذ باللہ، چھوٹا موٹا خدا سمجھ بیٹھے تھے۔ پھر مالک و مختارِ مطلق نے اپنی قدرت سے ان کی خود فریبی اور خام خیالی کا پردہ چاک کر دیا۔ اور ایسے خارج از گمان و قیاس طور پر، کہ اس کی دنیاوی معنوں میں نہ کوئی توجیہ ہے نہ کوئی تاویل۔ بے شک وہی مُعز و مُذل ہے۔ اس کی قوت کے آگے کوئی قوت نہیں۔ اس کی رحمت کے آگے کوئی رحمت نہیں اور کوئی مددگار نہیں اُس کے سوا۔ نہ کوئی اُس سے زیادہ مُنتقم اور سر بُع الحساب ہے، عظمت ہے تو صرف اُسی کی۔ وہی کبریا ہے اور صرف اُسی کی بزرگی لائق حمد و ستائش ہے۔ اب آپ بھی ہند کی طرح کہیں گے کہ میں وعظ کر رہا ہوں۔

میں اپنے خیالات کی رو میں بہا جا رہا تھا۔ خالق کائنات کی گمراہ مخلوق اللہ سبحانہ کی منشا اور ارادے کے خلاف کیا کیا چالیں چلتی ہے۔ کدھر کدھر کا رخ کرتی ہے نہیں جانتی کہ مشرق بھی اللہ کا ہے مغرب بھی، شمال بھی اور جنوب بھی، سب کچھ اسی مالکِ کون و مکاں کی ملک ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس کی ذات سے مفر ممکن نہیں۔ یہ بھی اُسی کو علم ہے کہ عساکرِ کفار نے دنیاوی طاقت کے باوجود اپنی بے بسی اور زبوں حالی سے کوئی سبق بھی حاصل کیا یا نہیں۔ ویسے اس سبق کی توفیق بھی اُسی جل و علا، احکم الحاکمین کی جانب سے ملتی ہے۔

## سفرِ حدیبیہ

جنگِ احزاب کو ایک سال ہو گیا تھا۔ قریش ابھی تک اپنے زخموں کو چاٹ رہے تھے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پارہے تھے کہ جنگِ خندق میں اپنی شکستِ فاش کا اوروں کو تو کیا، خود اپنے آپ کو کیا جواز دیں۔ کیا بتائیں اپنے حلیفوں کو کہ کیا ہوا تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں اتنی زبردست تیاریوں کے بعد جو حملہ کیا گیا تھا وہ کیسے ہمیشہ کے لئے اُن کی پیشانی کا سیاہ داغ بن کر رہ گیا۔ ابھی تک اُنھیں اپنی شکست کا صحیح پس منظر جاننے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ اُنھیں ابھی تک یہ باور نہیں آ رہا تھا کہ وہ اُس ازلی جنگ کے بد نصیب فریق ہیں جو روزِ اول سے حق و باطل کے درمیان چلتی آرہی ہے اور جس میں بالآخر باطل کی قوتوں کو ہمیشہ سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ سعدُ الاوس سعد بن معاذؓ کی شہادت کا سانحہ بھی گزر اور ایسے کہ مدینے کے زمین و آسمان ہل گئے۔ اچھی خبریں بھی ملتی رہیں۔ مختلف قبائل کے وفد آتے رہے اور حلقہٴ اسلام وسیع ہوتا چلا گیا۔

ایک دن شوال کے مہینے کی آخری تاریخیں تھیں کہ رسول کریمؐ نے ہمیں اپنا ایک خواب سنایا کہ وہ احرام باندھے سر کا حلق کرائے، خانہ کعبہ کی کلید ہاتھ میں لئے خانہ کعبہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے اعلان فرمایا کہ وہ عمرے کے لئے تشریف لے جائیں گے۔ ذی قعد کی پہلی تاریخ کو پیر کے دن حضورؐ نے مدینے سے کوچ فرمایا۔ کم و بیش پندرہ سو صحابہ ہمراہ تھے ان کے ساتھ قربانی کے لئے ستر لونٹ بھی تھے۔ عمرؓ اور سعد بن عبیدہؓ کا خیال تھا کہ ہم دشمنوں کے علاقے میں جا رہے ہیں۔ قریش سے راستے میں بھی خطرہ ہے۔ اس لئے سب لوگ مسلح ہوں۔ مگر حضورؐ نے فیصلہ فرمایا کہ کوئی اسلحہ ساتھ نہیں ہوگا۔ صرف تلواریں ہوں گی۔ وہ بھی میان میں رہیں گی۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تلوار بھی نہیں لی۔ انھوں نے فرمایا کہ ان کا مقصد عمرہ اور صرف عمرہ ہے۔

ہجرت کے بعد ہم پہلی بار مکہ جا رہے تھے۔ مکہ جہاں میرا سارا چین گزرا تھا۔ مجھے اکثر اس شدت سے یاد آتا تھا کہ اکثر میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ ایک بار میں نے کئے کی یاد میں چند اشعار بھی کہے تھے :

”کاش میں ایک رات اُس میدان میں بسر کرتا جس میں میرے ارد گرد ازخرو جلیل اُگی ہوئی ہوں۔ کیا وہ وقت کبھی پھر آئے گا کہ میں کوہِ جند کے چشموں سے سیراب ہوں۔ کیا میں اپنی زندگی میں کبھی پھر کئے کی پہاڑیوں کے بالمقابل کھڑا ہوں گا۔“

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم نئے نئے ہجرت کر کے مدینے آئے تھے۔ یہاں کا موسم غیر مانوس اور آب و ہوا ہمارے لئے بالکل مختلف تھی۔ میں اور عامر بن فہیرہؓ دونوں ان ابتدائی دنوں میں ابو بکرؓ کے گھر میں رہتے تھے۔ عائشہؓ کی کچھ دنوں پہلے رخصتی ہوئی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مدینے میں موسمی خٹار کی وبا پھیل گئی اور ہم تینوں اُس کی لپیٹ میں آگئے۔ خٹار اتنا شدید تھا کہ ہم تینوں کئی کئی گھنٹے نیم بے ہوشی کے عالم میں رہتے تھے۔ ایک دن عائشہؓ

اپنے والد سے ملنے آئیں تو ہماری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوئیں۔ انھوں نے اپنے والد کو بیمار دیکھ کر ان کا حال دریافت کیا تو ابو بکرؓ نے ایک شعر میں جواب دیا۔ عائشہؓ کم عمر تھیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو عامرؓ سے رجوع کیا۔ ان کا حال پوچھا تو انھوں نے بھی جو بلا ایک شعر پڑھ دیا۔ اب تو عائشہؓ واقعی بہت پریشان ہو گئیں۔ میری حالت دونوں سے قدرے بہتر تھی۔ مگر اپنی بیماری کے عالم میں مجھے مکہ بہت یاد آرہا تھا۔ میں نے یہی شعر جو ابھی آپ کو سنائے ہیں ان کو سنائے تو وہ اس قدر گھبرا گئیں کہ اُلٹے قدموں واپس چلی گئیں اور حضورؐ کو جا کر کہا کہ تینوں کے تینوں پر پاگل پن کا اثر ہے۔ یہی یہی باتیں کر رہے ہیں۔ دیوانگی طاری ہے۔ پھر انھوں نے اپنی یادداشت سے جو کچھ سنا تھا حضورؐ کو سنایا تو حضورؐ نے مسکرا کر اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی کہ مدینے کی آب و ہوا پانی اور اناج کو سب مہاجرین کے لئے کئے سے بھی زیادہ مفید اور موزوں بنا دے۔ ان کی یہ دُعا قبول ہوئی اور مدینہ ہمیں ہر طرح سے راس آ گیا۔

آج ایک بار پھر کئے کے درود یوار کا نقشہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ ایک ایک گلی ایسے جیسے سامنے نظر آرہی ہو اور ان میں گھرا ہو اللہ کا گھر۔

پہلی منزل پر آرام کے بعد رسول اکرمؐ اور ان کے ساتھ اکثر صحابہ نے احرام باندھ کر عمرے کی نیت کے دو دو نفل ادا کئے۔ سرورِ کائناتؐ نے اپنی قربانی کے اونٹ منگوانے کا حکم دیا۔ میں لپک کر تاجیہؓ کو بلا لایا۔ ابو اسلم سے تعلق رکھنے والے یہ صحابی قربانی کے اونٹوں کے نگران تھے۔ حضورؐ نے اپنے اونٹ پر دائیں جانب نشان لگایا اور اسے ہار پہنائے۔ باقی لوگوں کو بھی تاکید کی کہ وہ بھی اپنے اونٹوں کو اسی طرح قربانی کے لئے تیار کریں۔ تیاری مکمل ہوتے ہی انھوں نے کوچ کا اعلان فرمایا اور لیبک اللبم لیبک کا نعرہ بلند فرمایا۔ سب اس نعرے میں شریک ہو گئے اور کوہِ دمن اللہ کے حضور اس اعلان سپردگی کی بازگشت سے گونج اٹھے۔ بہار کا موسم تھا۔ ہوا معتدل تھی۔ دُور دور تک پھیلتی ہوئی جنگلی

جھاڑیوں پر چھوٹی چھوٹی ہلکے سبز رنگ کی پتیاں پھوٹ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے زردی مائل ٹھورے ریگستان نے کوئی گناہ سزا لیا ہے۔ ہوا چلتی تھی تو نوخیز پتیاں یوں جھلملا اٹھتی تھیں کہ جیسے سارا صحرا اٹھکھلا کر ہنس رہا ہو۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں کہیں کہیں جنگلی جانور بھی نظر آجاتے تھے جو ہمیں دیکھتے ہی خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگ جاتے تھے۔ ایک مقام پر ایک گورخر نظر آیا تو ابو قتادہؓ جو احرام میں نہیں تھے اس کے پیچھے روانہ ہو گئے اور رات گئے اسے شکار کر لائے۔ حضورؐ نے خود اور ان کی اجازت سے محرم حضرات نے بھی اس کا گوشت کھایا۔ قافلے میں وہ تمام نو مسلم بھی شامل تھے جنہوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ حارثہ ابن سعید کے آٹھوں بیٹے میرے دوست تھے۔ ان میں سے دو سے مجھے بہت قرب حاصل تھا کیونکہ وہ اصحاب صفہ میں شامل تھے۔ خراش بن امیہؓ خزاعی جو بنو مخزوم کے حلیف تھے، مخافؓ اور ان کے والدایمان رَحَضَةُ النَفَارِيُّؓ شریذ بن سوید ثقفیؓ بھی تھے جو چند روز قبل ہی اسلام لائے تھے اور زید بن خالد الجھنیؓ بھی۔ یہ وہی زیدؓ تھے جن کے ہاتھ میں فتح مکہ کے دن قبیلہ جہینہ کا علم تھا۔

روانگی سے قبل سروردو عالم نے قبیلہ قُرَاجِہ کی شاخ کعب سے ایک شخص کو پیشگی روانہ فرما دیا تھا تاکہ وہ ہمیں قریش کے ردِ عمل سے مطلع کرتا رہے۔ جوں ہی ہمارا قافلہ غسان پہنچا تو خبیر نے بتایا کہ قریش سخت تذبذب کے عالم میں ہیں۔ متولیان کعبہ کی حیثیت سے وہ کسی کو طواف کعبہ کی اجازت دینے سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہی ان کی فضیلت کا ایک بڑا جواز تھا اور دشمنان اسلام کی حیثیت سے وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ محمدؐ کثیر تعداد میں اپنے صحابہؓ کے ساتھ مکے میں داخل ہوں اور عزت و وقار سے عبادت کر کے واپس چلے جائیں۔ تمام عربستان میں چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی۔ قریش کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو جائے گی کہ ان کا سب سے بڑا منہ بولا دشمن خود ان کے شہر میں شان و شوکت سے داخل

ہو کر، اطمینان سے عبادت کر کے ان کے سینے پر مونگ دلتا ہوا ترک و احتشام سے واپس چلا گیا۔ تمام صحرائے عرب میں قریش مکہ کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ انکار کریں تو ایک عظیم روایت کی قربانی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تو صرف کعبے کے متولی تھے اور کعبہ تمام عرب کی یکساں ملکیت تھا۔ اقرار کریں تو قریہ قریہ بدنام ہوتے ہیں۔ پچ کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ پھر بھی اپنے چند حلیفوں کی رائے کے خلاف انہوں نے خالد بن ولید کو روانہ کر دیا کہ وہ مسلمانوں کا راستہ روکنے کی کوشش کریں۔ ہمیں بھی راستے میں یہ خبر ملی گئی۔

حضورؐ نے یہ سنتے ہی مجھے حکم دیا کہ میں کسی ایسے شخص کو لاؤں جو قافلے کو کسی متبادل، غیر معروف راستے سے لے جائے۔ قافلے میں بنو اسلم نامی ایک شخص شامل تھا جو صحرائے عربستان کے اس حصے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ میں نے اسے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا اور وہ قافلے کو عام راستے سے ہٹا کر بسمندر کی طرف لے گیا اور وہاں سے ایک نہایت دشوار گزار راستے سے چلتا ہوا حدیبیہ کے درے تک لے آیا۔ یہاں سے مکہ ایک منزل بھی نہیں تھا۔ سب کا اصرار تھا کہ یہ فاصلہ بھی لگے ہاتھوں طے کر لیا جائے، مگر وہ درزہ ختم ہوتے ہی حضورؐ کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی۔ چاروں طرف سے اسے اٹھانے کے لئے ”ہل ہل“ کا شور اٹھتا رہا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آوازیں بلند ہوئیں کہ قصواء ضد کر رہی ہے لیکن رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ قصواء کسی اور کے حکم کی پابندی کر رہی ہے۔ ہم یہیں قیام کریں گے۔ چنانچہ حدیبیہ ہی میں خیمے نصب کر دیئے گئے۔ قصواء نے کسی اور کے حکم پر اس سے پہلے مدینے میں بھی ایک عظیم تاریخی فیصلہ کیا تھا جو ہم سب کو یاد تھا۔

خالد بن ولید جو مدینے سے آنے والے تمام جانے پہچانے راستوں پر ہماری تلاش میں بے نیل و مرام پھرتے پھرتے مکے کے نواح میں آئے تو یکایک ہمارے قافلے کو مکے سے اس قدر قریب دیکھ کر سخت پریشان ہو گئے اور انہوں نے فوراً مکے جا کر قریش کو ہماری

آمد کی اطلاع دے دی۔ اب قریش کے پاس زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

یہ خزانہ جو کبھی خانہ کعبہ کے کلید بردار تھے قریش کے حریفوں میں تھے اس لئے کہ یہ بحر جن سے اُن کی دشمنی تھی قریش کے حلیف بنے ہوئے تھے۔ نبی خزانہ کے قبیلے ہو مسلم، یہ کعب اور یہ مصطلق پیغمبر اسلام کو اچھا سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ ابھی تک حلقہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ قریش کا اُن سے براہ راست کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ لیکن وہ ان کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ جس وقت قریش کو خالد بن ولید نے ہمارے حدیبیہ پہنچ جانے کی اطلاع دی اُس وقت یہ خزانہ کا ایک سردار بدیل بن ورقا بھی وہیں مکے میں موجود تھا۔ وہ یہ خبر سنتے ہی حدیبیہ روانہ ہو گیا۔ اُس نے سرور کائنات کو بتایا کہ قریش قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے ہیں کہ جب تک ہمارا ایک آدمی بھی زندہ ہے ہم محمد اور اس کے ساتھیوں کو مکے میں نہیں داخل ہونے دیں گے۔ یہ سُن کر نبی رحمت نے نہایت نرمی سے اُسے بتایا کہ وہ قریش کو مطلع کر دیں کہ ہمارا مقصد صرف عمرہ کرنا ہے۔ ہم اللہ کے گھر کا طواف کریں گے اور واپس مدینہ چلے جائیں گے۔ ہم کسی سے فساد نہیں کرنا چاہتے لیکن اگر کوئی ہمارا راستہ روکے گا تو اُس سے ہم جنگ کریں گے۔ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا اگر قریش کو سوچنے کے لئے کچھ اور وقت درکار ہے تو ہم تیار ہیں۔ وہ جو احتیاطی تدابیر کرنا چاہتے ہیں کر لیں مگر اللہ کے گھر کا راستہ نہ روکیں۔

بدیل نے مکہ جا کر رسول اللہ سے اپنی ملاقات کی تفصیل سے قریش کو آگاہ کیا اور مسلمانوں کے پُر امن مقاصد بھی بیان کئے مگر قریش کی کوئی تسلی نہیں ہوئی۔ یہ یقین کے عہدہ نے پیشکش کی کہ وہ خود حدیبیہ جا کر ساری معلومات حاصل کر کے قریش کو مطلع کرے گا۔ میں قربانی کے اونٹوں کے پاس ناجیہ سے باتیں کر رہا تھا کہ عروہ کے آنے کی اطلاع ملی۔ میں فوراً لپک کر گیا اور عروہ سے اُس کے آنے کا مقصد پوچھا۔ اُس نے اپنا مقصد

بیان کیا تو میں اُسے حضور کے خیمے میں لے گیا۔ مغیرہ بن شعبہ جو خیمے سے باہر ہی کھڑے تھے اور حضور کے خدام میں شامل تھے ہمیں اندر لے گئے۔ میں نے عروہ کا تعارف کر لیا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ عروہ نے گفتگو شروع کی تو بدویانہ بے تکلفی میں باتیں کرتے کرتے حضور کی ریش مبارک کو ہاتھ لگا دیا۔ میں آگے بڑھنے ہی کو تھا کہ مغیرہ نے اس کے ہاتھ پر اپنی تلوار کا چپا حصہ مار کر کہا کہ وہ آئندہ یہ گستاخی نہ کرے۔ عروہ فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مگر چند ہی لمحوں بعد اُس نے عادتاً دوبارہ جب کسی بات پر زور دینے کے لئے ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھایا تو مغیرہ نے زور سے تلوار کا چپا حصہ اس کے ہاتھ پر مار کر کہا اپنا ہاتھ دور رکھو ورنہ یہ ہاتھ ہی نہیں رہے گا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی نیت نیک تھی اور عروہ محض اپنی عادت سے مجبور تھا مگر ہمارے لئے یہ بے تکلفی حضور کی شان میں گستاخی تھی جو ہماری برداشت سے باہر تھی۔ عروہ معاملہ فہم تھا، بات سمجھ گیا اور چند لمحوں بعد جب وہ حضور سے گفتگو کر کے باہر نکلا تو اُس نے دوسرے خیموں میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اُسے ساتھ لے جا کر سب اطراف کی سیر کرائی۔ وہ کئی گھنٹے ہمارے ساتھ رہا اور جب واپس گیا تو اُس نے قریش کو اپنے دورے کی سرگزشت سنائی۔ اُس نے اُنھیں بتایا کہ وہ قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں بھی جا چکا ہے۔ لیکن جیسا احترام اُس نے محمد کا دیکھا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی اس نے کہیں نہیں دیکھا۔ اُن کے ماننے والے اُن پر نچھاور ہوئے جاتے ہیں۔ وہ وضو کرتے ہیں تو وضو کے پانی کے ایک ایک قطرے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں اور جس کے ہاتھ ایک بند بھی آجاتی ہے وہ اُسے خیر و برکت کے لئے اپنے جسم پر ملتا ہے۔ میرا خیال ہے محمد کی تجویز مناسب ہے اور ہمیں تسلیم کر لینی چاہئے۔

ادھر سرور کائنات نے بھی یہ کعب کے خراش کو اپنا سفیر بنا کر قریش کی جانب

روانہ کر دیا۔ عکرمہ بن ابو جہل نے اس کی بات سننے سے پہلے ہی اس کے اونٹ کو باندھ کر اسے گرفتار کر لیا مگر بعد میں لوگوں کے کہنے سننے پر اسے رہا کر دیا۔ خراش نے واپس آ کر حضور کو عرض کی کہ میں ایک بے وزن آدمی ہوں۔ آپ کسی ایسے شخص کو بھیجئے جس کا سکہ میں کوئی حلیف ہو۔ چنانچہ پہلے حضور نے حضرت عمرؓ کو تجویز فرمایا اور پھر عمرؓ کے کہنے پر حضرت عثمانؓ کا نام تجویز ہوا، کیونکہ ان کے قبیلے کے کئی عزیز سکہ میں رہتے تھے۔ عثمانؓ سکہ پہنچے تو قریش نے انہیں تمام مسلمانوں کو سکہ آنے کی اجازت تو نہیں دی البتہ انہیں کہا کہ وہ خود خانہ کعبہ کا طواف کر لیں۔ مگر عثمانؓ نے یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ ابن ابی کو بھی قریش اپنا ہم خیال ہی سمجھتے تھے۔ انہیں بھی قریش نے طواف کی پیش کش کی مگر انہوں نے جواباً کہا کہ جب تک اللہ کا رسول طواف نہیں کر لیتا، میں طواف نہیں کر سکتا۔ حضور کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے خوشی کا اظہار فرمایا۔

## فتحِ مبین

عثمانؓ کو قریش سے گفت و شنید میں توقع سے زیادہ وقت لگ گیا۔ ہم سب پریشان تھے۔ ان کی طرف سے کوئی خبر نہیں آرہی تھی۔ اسی پریشانی کے عالم میں افواہ پھیل گئی کہ عثمانؓ کو قریش نے شہید کر دیا ہے۔ اب اضطراب حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ ہر چہرہ پژمردہ، ہر پیشانی پر فکر کے آثار۔ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں لوگ اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس معاملے پر گفتگو کرتے نظر آتے تھے۔ قریش نے اپنی دشمنی میں ماہ ذی قعد کی حرمت کا پاس بھی نہیں کیا۔ سب نے اپنی تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھ کر خون عثمانؓ کا بدلہ لینے کا اعلان کیا۔ آنحضرتؐ نے بھی فرمایا کہ میں انتقام لئے بغیر یہاں سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ اسی اثنا میں آنحضرتؐ پر وحی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ ایک کیکر کے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور بیعت جہاد کی دعوت فرمائی۔ یہ وہی بیعت ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہوا ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يَبَايَعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ

(اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے اللہ

ان سے خوش ہوا۔ (۱۸-۴۸)

سب نے عہد کیا کہ مرجائیں گے مگر میدان سے نہیں ہٹیں گے۔ سب سے پہلے بیعت رضوان کی سعادت عکاشہ بن محسن کے بڑے بھائی ابوسان بن محسن کے حصے میں آئی۔ یہ عکاشہ سے بیس برس بڑے تھے۔ ان کا نام وہب تھا۔ اس کے بعد تو تاننا بندھ گیا۔ سب حضور کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تو رسول اللہ نے اپنا دست راست اپنے ہی بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ صرف ایک منافق جد بن قیس ایک لونٹ کے پیچھے چھپا رہا اور اس بد بخت نے بیعت نہیں کی۔

بیعت کا سلسلہ ختم ہوتے ہی سب نے تلواریں میان سے نکال لیں۔ ہمیں اب یقین تھا کہ مقابلہ ہو کر رہے گا اور یہ بھی کہ فتح انشاء اللہ ہماری ہوگی یا جام شہادت نصیب ہو گا جس سے روح میں ایک فرحت و شادمانی کا احساس تھا۔

اتنے میں عثمان کی خیریت کی اطلاع آگئی۔ کہنے کو تو حدیبیہ کے ایک نوخیز ہلکے سبز رنگ کی پتیوں سے بھرے ہوئے درخت کے نیچے پیش آنے والا یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا مگر اس کی بازگشت رہتی دنیا تک سنائی دیتی رہے گی۔ اطاعت، یقین، حوصلہ مندی، جرأت کردار، تسلیم و رضا، استقامت، قربانی اور بے مثل فداکاری کے طے جلتے جذبات کا یہ وہ اظہار تھا جس سے آج تک روح میں ایک گونہ سرور ہے۔ عثمان واپس تشریف لائے تو انھوں نے بتایا کہ قریش کو آپ کے اصل مقصد کا علم ہو گیا ہے۔ وہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ انھیں حرمت والے مہینوں میں کسی کوچ و عمرہ سے روکنے کا حق نہیں ہے لیکن وہ صرف اس بار اجازت دینے سے قاصر ہیں۔

پھر اہل مکہ نے سہیل بن عمرو کو بھیجا جو قریش کے آخری قاصد تھے۔ سہیل بن عمرو نے معاہدہ کی جو شرائط پیش کیں وہ ہم سب کو ایک طرفہ محسوس ہوئیں، لیکن جب آنحضرت نے انھیں قبول فرمایا تو کسی کو معترض ہونے کی گنجائش نہ ہی۔ معاہدے کے متن پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جائے سہیل کے کہنے پر بسم اللہ لکھا گیا۔ محمد رسول اللہ کی جائے سہیل کے اصرار پر محمد بن عبد اللہ تحریر ہوا۔ ایک شرط یہ تھی کہ اگر قریش کا کوئی فرد مسلمان ہو کر آئے تو محمد اسے واپس کر دیں گے لیکن اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر قریش کے پاس پہنچ جائے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ میں سوچتا ہوں کتنی بد گمانی تھی قریش کو اپنے لوگوں کے بارے میں اور کتنا اعتماد تھا پیغمبر آخر الزماں کو اپنے دین کی تعلیم اور تربیت پر کہ انھیں کسی مسلمان کے کفار قریش سے جاننے کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں تھا۔ قریش کو البتہ تشویش تھی کہ مکے کی سرداری اور استحصالی نظام کے مقابلے میں مدنی معاشرے کا انسانی حقوق کی حالی اور مساوات پر قائم نظام انتہائی پرکشش ہے جو کسی وقت بھی ان کے لئے شدید خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ گویا قریش کی یہ شرط مدنی نظام کی افضلیت کا ایک خاموش اعتراف تھا۔ باقی شرائط بھی بظاہر ایک طرفہ تھیں۔ مگر حضور نے نہایت خندہ پیشانی سے قبول فرمائیں۔ چند مسلمانوں، خصوصاً عمر نے اپنی پریشانی کا اظہار بھی کیا۔ یہ اس لئے کہ رحمت عالم کی تعلیمات نے ذہنوں کو جکڑا نہیں تھا۔ غور و فکر کی اجازت ہی نہیں ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ ہر شخص اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتا تھا اور شخصی رائے کے آزادانہ اظہار کے بعد آخری فیصلہ اللہ کے رسول کا ہوتا تھا۔ ان شرائط پر انھوں نے فیصلہ فرمادیا تو یہ تلخ گھونٹ سب نے حلق سے اُتار لیا۔

شرائط طے ہو گئیں تو معاہدے پر دستخطوں کی تیاری شروع ہو گئی۔ حضور دائیں بائیں نظریں دوڑا رہے تھے کہ توثیق کے لئے کس کس کو بلائیں۔ اتنے میں باہر سے بڑی دردناک



چیزوں کی آواز سنائی دی۔ سب خیموں سے باہر نکل آئے۔ دیکھا تو سامنے ایک انتہائی دل دوزخ منظر تھا۔ ابو جندل، سہیل بن عمرو کے چھوٹے بیٹے، چلا چلا کر مدد کے لئے پکار رہے تھے۔ اُن کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ پاؤں میں بھاری بھاری بیڑیاں، چلتے تھے تو اُن کی جھنجھار سنائی دیتی تھی۔ اُن کے ساتھ ہمارے ساتھیوں کا جھوم تھا۔ ہر ایک دم خود، مبہوت، کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ سہیل کے بڑے بیٹے عبداللہ بن سہیل، اللہ کے فضل سے پہلے ہی حلقہء اسلام میں آچکے تھے اور اس وقت ہم لوگوں میں شامل تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی کی حالت زار دیکھ کر ان سے رہانہ گیا۔ بے ساختہ اُنھیں سنبھالنے کے لئے لپک کر آگے بڑھے۔ اتنے میں سہیل بن عمرو بھی خیمے سے باہر آچکا تھا۔ اُس نے آؤد دیکھا نہ تاؤ ایک ہاتھ سے عبداللہ کو دھکا دے کر پرے کیا اور ابو جندل کی زنجیر کو، جو اُن کے گلے سے لٹک رہی تھی، پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ وہ زمین پر آ رہے۔ پھر اسی زنجیر کے سرے کو گھما کر اس بے دردی سے اُن کے منہ پر مارا کہ شدتِ ضرب سے اُن کا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ ساتھ ہی سہیل نے مز کر رسول اللہ کی سمت دیکھا اور کہا کہ محمد ہمارا معاہدہ ابو جندل کے آنے سے قبل طے ہو چکا تھا۔ اُس کی زور سے اب آپ لوگوں کو اسے میرے حوالے کرنا ہو گا۔

ہوایہ تھا کہ ابو جندل چند روز قبل اسلام لے آئے تھے۔ سہیل بن عمرو، جو اپنے بڑے بیٹے کے مسلمان ہونے کا غم بھی نہیں بھلا پایا تھا ابو جندل کے اسلام لانے کی خبر سن کر اتنا سنج پاہو کہ اُس نے اُنھیں زنجیروں میں جکڑوا کر مکے کے کسی یہ خانے میں قید کر رکھا تھا جہاں سے وہ کسی طرح زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گئے اور سیدھا ہمارے خیموں کا رخ کیا۔ یہاں اُن کے ساتھ یہ ماجرا ہوا۔

رسول کریم نے، کہ صادق و عادل تھے، سہیل کی بات سن کر ایک لمحے کے توقف کے بغیر اعلان فرما دیا کہ ہاں واقعی ابو جندل سہیل کے ساتھ جائیں گے۔ ابو جندل جو انتہائی

بے چارگی کی حالت میں حضور کے فیصلے کے منتظر تھے ایک بار پھر زور زور سے دہائی دینے لگے۔ جو کچھ اُنھوں نے رسول اللہ کی زبانی سنا، اُن کی فہم سے بالا تھا مگر حضور نے آگے بڑھ کر اُن کے شانے پر ہاتھ رکھا، اُنھیں دلاسا دیا، صبر کی تلقین فرمائی اور کہا کہ وہ جو قادر و مختار ہے یقیناً اُن کے لئے کوئی سہیل پیدا کرے گا۔

رسالت مآب کے یہ مختصر کلمات بارگاہِ الہی میں جس طرح مُستجاب ہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے۔ کبھی موقع ملا تو عرض کروں گا کہ حدیبیہ کے اسی مظلوم ابو جندل نے اپنے ایک ہم خیال ابو بھیر کے ساتھ مل کر معاہدے کی شرائط کے اندر رہتے ہوئے، مکے کے بر خود غلط اور بے زعم خویش بہت ذی عقل اور ہوشیار قریش کو ایسے ایسے ناکوں پنے چبوائے کہ اُن کی عائد کردہ احمقانہ شق اُن کے گلے کا ہار بن کر رہ گئی اور اُنھوں نے خود حضور سے درخواست کی کہ وہ اُنھیں مدینے بلا کر اپنے پاس رکھیں۔ نہ بھیل اور لات کی منت سماجت اُن کے کام آئی نہ اُن کی اپنی کوئی تدبیر۔

ابو جندل کے بارے میں حضور کے فیصلے کے بعد سب لوگ پھر خیموں میں آ گئے۔ معاہدہ سامنے رکھا گیا اور حضور نے مسلمانوں کی طرف سے ابو بھر، عمر، علی، عبدالرحمن بن عوف اور محمد بن مسلمہ کے دستخط کروائے۔ ان کے علاوہ آپ نے سہیل کے بیٹے عبداللہ بن سہیل سے بھی معاہدے کی توثیق کروائی۔ اس سارے عرصے میں حضور ایک سمت کھڑے رہے۔ جو جو دستخط کرتا جاتا تھا، حضور کے پاس آ کر کھڑا ہوتا جاتا تھا۔

اس تمام عرصے میں میں خیمے کے مدخل پر کھڑا سوچ میں گم تھا۔ خیمے کا پردہ اٹھا ہوا تھا اور سامنے کچھ فاصلے پر مجھے وہ کیکر کا درخت نظر آ رہا تھا جس کے نتیجے میں بیعت رضوان ہوئی تھی۔ درخت کی چھدری شاخوں کے پیچھے سورج نصف النہار سے نیچے آچکا تھا اور اس کی افقی روشنی میں درخت کی نوخیز، نازک پتیوں کے کنارے زردی مائل نظر آ رہے تھے جیسے ہر پتی

حدیبیہ سے واپسی پر مدینے کے راستے میں سورہ فتح نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرار دیا انا فتحنا لک فتحنا مبین۔ جیسے ہی یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے فوراً گھڑ سواروں کو بھیج کر اپنے جلیل القدر صحابہؓ کو اپنے پاس بلوایا اور انھیں یہ آیت مقدسہ سنائیں۔ ان کا چہرہ خوشی سے تہمتار ہا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ اللہ کی کائنات میں مجھے اس سورۃ سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ صلح حدیبیہ بے شک فتح مبین ہی تھی۔ آنے والے وقت میں ثابت ہو گیا کہ صلح حدیبیہ کی سیاسی حکمت اور ذور اندیشی کس طرح ہماری تاریخ پر اثر انداز ہوئی۔ اس سے پہلے قریش حضورؐ کو محض ایک سرکش ناقابل اعتنا باغی سمجھتے تھے۔ اب انھیں مجبوراً انہیں اپنا مد مقابل اور مددگار کا حریف تسلیم کرنا پڑا اور ساتھ ہی ساتھ مدینے کی نوزائیدہ مملکت اسلامیہ کو بھی۔ مسلمانوں کا حق زیارت کعبہ تسلیم کرنے کا یہ مطلب تھا کہ اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح ایک مسلمہ مذہب ہے۔ دس سال تک لڑائی بند رکھنا طے پایا تو جنوب سے خطرہ ٹل گیا اور بھر پور تبلیغ کا موقع ملا۔ مختصر صلح حدیبیہ تاریخ اسلام کا ایک ایسا موڑ ہے جہاں سے ہماری تاریخ کا دور اول ختم ہوا اور ایک نئے درخشاں مستقبل کا آغاز ہوا۔ یہ چھٹی ہجری کے موسم بہار کا وہ تحفہ تھا جس کے بعد ہم نے کبھی خزاں نہیں دیکھی۔

پر سونے کی باریک سی جھال لگی ہوئی ہو۔ درخت کی شاخیں ہلکی ہلکی ہوا میں ہلکورے لیتیں تو پتیاں یوں لرزتی ہیں کہ سارا درخت جھلکا اٹھتا۔ کبھی میں خیمے کے اندر دیکھتا تھا کبھی باہر۔ مجھے کوئی اندر سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ بلال دیکھ تیری آنکھوں کے سامنے تاریخ عالم کا ایک عظیم باب رقم ہو رہا ہے۔ گواہ رہنا کہ مسلمانوں نے کس جذبہ ایمانی سے اپنے ہادیؐ پر حق کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔

کیکر کی یہ باریک باریک پتیاں رت بدلتے ہی پیوید خاک ہو جائیں گی۔ یہ درخت بھی نہیں رہے گا اور بلال تو بھی نہیں لیکن جو کچھ اس درخت اور اس کی پتیاں نے دیکھا اور بلال جو کچھ تو نے دیکھا اور دیکھ رہا ہے وہ تاریخ کے ماتھے کا جھومر بن کر ہمیشہ زندہ و تازہ رہے گا۔

معادہ ضبط تحریر میں آگیا۔ سہیل بن عمرو اور ابو جندل واپس چلے گئے تو رسالت مآبؐ نے قربانی کے لئے سب سے پہلے اپنا اونٹ منگوا کر ذبح فرمایا اور خراش ہو بلو کر اپنے سر کا حلق کر لیا۔ پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے سب نے اپنے اپنے قربانی کے جانور ذبح کر دئے کسی نے حلق کروایا، کسی نے محض قینچی سے بال ترشوائے۔ تھوڑی ہی دیر میں چاروں طرف بال ہی بال بکھر گئے۔ سرور عالمؐ نے زمین سے اپنے بالوں کی لٹیں اٹھائیں اور پاس آگے ہوئی ایک خودرو جھاڑی پر پھینک دیں جس پر چھوٹے چھوٹے پھول کھل رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہی سب اس جھاڑی پر ٹوٹ پڑے اور ہر شخص نے تبرک کے طور پر جتنے بال ہاتھ لگے سمیٹ لئے۔ نسیہ بنت کعبؓ بھی اس دوڑ میں شریک تھیں۔ وہ بھی مردوں کے شانہ بشانہ آگے بڑھیں اور موئے مبارک کی ایک لت اٹھالی جو مرتے دم تک ان کے پاس رہی۔ یہ تک و دو جاری تھی کہ ہو کا ایک نہایت تیز جھونکا آیا اور چاروں طرف بکھرے ہوئے بالوں کو ایک آن میں اڑا کر مکے کی طرف حدود حرم میں لے گیا۔ یہ بشارت تھی ہمارے سفر عمرہ کی قبولیت کی۔

## جانبِ منزل

دس ہزار کاشکر، عرب کی تاریخ کا ایک عظیم الشان فوجی اجتماع، پیدل، گھڑ سوار، ہر شخص سر سے پاؤں تک کیل کانٹے سے لیس، ساز و سامان سے لدے ہوئے سینکڑوں اونٹ، عربستان کے بے شمار قبائل کے دستے جو مدینے سے آتے ہوئے راستے میں ہمارے ساتھ شامل ہوتے گئے، ہر سپاہی کا دل نور ایمان سے منور، جذبہ جہاد سے سرشار۔ یہ کاروان جب مر اظہران پہنچا تو حضورؐ نے پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔

مر اظہران سے مکہ ایک منزل یعنی چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ یہاں سے ہوازن کے قبیلوں کو بھی راستہ جاتا تھا۔ نجد کے جنوبی حصے میں پہاڑیوں پر آبادلات کے پجاریوں کا یہ قبیلہ اسلام دشمنی میں قریش مکہ سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ ایک اور راستہ یہاں سے طائف کی طرف نکلتا تھا جو لات کے مندر کے محافظوں کا نہایت سرسبز و شاداب شہر تھا مگر ہماری منزل کیا تھی، کسی کو علم نہیں تھا۔ اللہ جانتا تھا یا اس کا رسولؐ۔ حضورؐ نے ابھی تک اپنا

”سب سے زیادہ کفر تو اس وقت کئے میں ہے۔ لات تو صرف ایک بت ہے مگر تو بچوں سے بھرا پڑا ہے۔“

”ہو سکتا ہے رسول اللہؐ کا یہ ارادہ ہو کہ شمالی حجاز کے سب سے خوب صورت باغوں والے شہر یثرب پر قابض ہونے کے بعد اب مشرقی حجاز کے باغات کا سب سے خوب صورت شہر حاصل کیا جائے۔“

”میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ ہم قریش مکہ سے لڑنے جا رہے ہیں۔ اُن سے بڑا کون ہو گا دشمن ہمارا۔ ہمارا اصل جھگڑا ہے ہی اُن سے۔“

کعب بن مالکؓ میرے سامنے بیٹھے خاموشی سے سب کی باتیں سن رہے تھے۔ یکا یک وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے:

”میں ابھی پتہ کر کے آتا ہوں“

دو تین نے یک زباں ہو کر کہا:

”کس سے۔ کسی کو معلوم نہیں۔“

کعبؓ بولے:

”میں نبی کریمؐ سے پوچھ کر آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور ہم لوگ اُن کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد

کعبؓ لوٹے تو کہنے لگے:

”جب آپ لوگ اپنی اپنی قیاس آرائیاں کر رہے تھے، میں شعر کہہ رہا تھا۔ سنئے

تکواریں میان سے نکل پڑی ہیں

اور شمشیر زن اُن سے پوچھ رہے ہیں

کہ اُن کی تیز دھاریں کس کے لئے ہیں

عند یہ کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد حضورؐ کے حکم کے مطابق ہر شخص نے اپنا الگ الاؤ جلا رکھا تھا۔ گویا مگر لظہر ان کی پہاڑیوں پر اُس شام دس ہزار الاؤ روشن تھے۔ عشا کے بعد لوگ الاؤوں کے گرد بیٹھ گئے اور قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ منزل کون سی ہے۔ مکہ، طائف یا بوزان۔ میرے پاس بیٹھے ابو ذرؓ نے کہا:

”میرے خیال میں ہم مکہ جا رہے ہیں۔“

یہیں سے بات چل پڑی۔ ہر ایک نے اپنا خیال ظاہر کیا:

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ قریش سے ہمارا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہے۔“

”مگر بے کعب پر حملے کے بعد اب کیا رہ گیا حدیبیہ کے معاہدے میں۔“

”سوچنے کی بات ہے کہ کعب کی پناہ میں آجانے کے باوجود بے کعب پر حملہ ہوا۔“

”میرا تو خیال ہے ہمارا رخ بوزان کی طرف ہے۔ یہی راستہ جاتا ہے اُن کے

علاقے کو۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ بوزان نے ہمیں بہت نقصان پہنچائے ہیں۔“

”شاید اُن کی سر کوئی کا فیصلہ ہو گیا ہے۔“

”ہو ازن ہمارے سخت دشمن ہیں مگر حال میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی کہ اُن سے

جنگ چھیڑی جائے۔“

”ہو سکتا ہے ہمارا ارادہ طائف فتح کرنے کا ہو۔“

”طائف میں نبی کریمؐ پر بڑی سختیاں ہوئی ہیں، اُن کا حساب چکانا ضروری ہے۔“

”حضورؐ نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا،۔“

”لیکن طائف میں لات کا مندر کفر کا بہت بڑا مرکز ہے۔ شاید اُسے ختم کرنے کا

ارادہ ہو۔“

ہیں۔

ابوسفیان اب اطراف کی پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا جہاں دور دور تک الاؤ روشن تھے۔ معلوم ہوتا تھا آسمان سے ستارے اتر آئے ہیں۔ ابوسفیان نے یہ منظر دیکھ کر قدرے حیرت سے کہا:

”محمدؐ کی سلطنت بہت پھیل گئی ہے۔“

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں بول اٹھا:

”محمدؐ سلطان نہیں رسول ہیں۔“

ابوسفیان نے کچھ جواب نہیں دیا۔ کچھ سوچتے سوچتے اثبات میں گردن ہلا دی اور مجھے پہچان کر کہا:

”یہ تم ہو بلال!“

اور بغیر میرے جواب کا انتظار کئے باہر روٹنیوں کو دیکھنے لگا۔

میں فوراً سب کو وہیں چھوڑ کر سیدھا حضورؐ کے خیمے میں پہنچا۔ عمرؓ ان کے پاس بیٹھے تھے اور شاید پہلے ہی انہیں ابوسفیان کی آمد کی اطلاع دے چکے تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ابوسفیان آیا ہے، عباسؓ کے ساتھ تو انہوں نے نہایت اطمینان سے فرمایا:

”اللہ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔“

اتنے میں عباسؓ خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے ابوسفیان، پھر حکیم اور سب سے آخر میں بدیل۔

ابوسفیان چند روز پہلے مدینے بھی آیا تھا۔ ہو کعب کے خلاف قریش کی زیادتی کے بعد حدیبیہ کے معاہدے کی دوبارہ توثیق کے لئے مگر وہاں اُس کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔ حضورؐ نے سب کو چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اگر تلواروں کی بھی زبان ہوتی

تو وہ بھی یہی سوال کرتیں

کہ بتاؤ ہمارا دشمن کون ہے؟

یہ شعر میں نے حضورؐ کو سنائے۔ میرا خیال تھا وہ سن کر ضرور کوئی جواب دیں گے مگر وہ صرف مسکرائے۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔

یہ تدبیر بھی نہ چلی تو گنگو کا سلسلہ جہاں سے لوثا تھا پھر وہیں سے شروع ہو گیا:

”طائف کے بارے میں تو یہ خبر ہے کہ بوثیف نے ہوازن کے دیگر حلیف قبیلوں سے مدد بھی مانگ لی ہے بلکہ کئی شاخوں کے لوگ ان کے دفاع کے لئے طائف پہنچ بھی گئے ہیں۔“

”سنا ہے بوثیف نے شمر کے شمال میں ایک پہاڑی پر مورچہ قائم کیا ہے جہاں سے وہ دور دور تک دیکھ سکتے ہیں۔“

”مگر طائف سے جنگ کرنے کی بھی کوئی فوری وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارا اصل بھگڑا تو.....“

ابو ذرؓ بات کرتے کرتے رک گئے، ان کی آنکھیں حیرت زدہ ہو گئیں۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو سامنے ابوسفیان کھڑا تھا۔ ہر شخص ہکا بکا ہو گیا۔ اتنی رات گئے ابوسفیان ہمارے خیموں میں۔ وہی رکھ رکھاؤ، وہی پسلا سا وقار، وہی طمطراق۔ غور سے دیکھا تو اس سے چند قدم کے فاصلے پر حضورؐ کے چچا عباسؓ تھے اور ان کے ساتھ حکیم بن حزام جنہوں نے بدر کی لڑائی رکوانے کی بڑی کوشش کی تھی مگر ابو جہل نے ان کی ایک نہ چلے دی تھی۔ حکیم کے ساتھ ہو خزانہ کے بدیل بن ورقہ تھے جنہوں نے حدیبیہ میں حضورؐ کو خبر دی تھی کہ قریش کسی قیمت پر مسلمانوں کو مکے میں داخل ہونے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں

ابوسفیان نے بیٹھتے ہی کہا:

”محمدؐ آپ نے تو پتہ نہیں کہاں کہاں کے لوگ اکٹھے کر لئے ہیں۔ اتنی بڑی فوج اپنے ہی اعراب کے خلاف نامناسب..... حضورؐ کو میں نے کبھی کسی کی بات کاٹنے نہیں دیکھا تھا مگر اُس وقت انہوں نے ابوسفیان کا قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا:

”زیادتی آپ لوگوں کی طرف سے ہوئی ہے۔ آپ نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑا ہے۔

یہ کعب کے خلاف حملے میں آپ نے جو بجز کا ساتھ دیا اور خانہ کعبہ کی

حدود کی بھی بے حرمتی کی“

ابوسفیان نے موضوع بدلنے کی کوشش کی:

”کاش! آپ کے غصے کا رخ ہو ازن کی طرف ہوتا جو آپ کے سب سے بڑے

دشمن ہیں اور اُن سے آپ کی عزیزداری بھی دُور کی ہے“

رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

”مکے کی فتح کے بعد اگر اللہ نے چاہا تو وہ اہل اسلام کو اُن پر بھی اقتدار دلا دے گا۔“

مکے کا نام سُن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ تو گویا یہ تھی ہماری منزل اور ہم

جانے کیا کیا سوچتے رہے۔ یہ کہہ کر حضورؐ نے تینوں مہمانوں سے کہا کہ وہ اللہ کی وحدت اور

اُن کی رسالت کی شہادت دیں۔ حکیمؒ اور بدیلؒ نے فوراً کلمہ پڑھ دیا۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ،

مگر ابوسفیان نے صرف اتنا کہا:

”لا الہ الا اللہ،“

اور چُپ ہو گیا۔ جب اُسے رسالت کی شہادت کے لئے کہا گیا تو اُس نے چٹائی پر

نظر میں گاڑ لیں اور چٹائی ہی کی طرف دیکھتے دیکھتے بولا:

”محمدؐ میرے دل میں اب بھی شک ہے، مجھے کچھ وقت چاہئے۔“

ابوسفیان کے جواب میں عمرؓ کچھ کہنا چاہ رہے تھے مگر حضورؐ نے انہیں اشارے سے

خاموش کر دیا اور عباسؓ سے کہا کہ وہ اپنے خیمے میں مہمانوں کے رات ٹھہرنے کا انتظام کریں۔

## ابوسفیان

اگلے دن جب علی الصبح میں نے فجر کی اذان دی تو پہاڑوں کے سنائے میں میری آواز میری توقع سے زیادہ گونجی۔ دیکھتے دیکھتے سب خیموں سے باہر نکل آئے۔ ہر شخص وضو کے لئے دوڑ پڑا۔ سارا لشکر جاگ اٹھا۔ ابوسفیان بھی ہڑبڑا کر اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا عباسؓ سے پوچھنے لگا:

”کیا ہو گیا ہے، کیا ماجرا ہے؟“

”عباسؓ اے اے بتایا: ”نماز کا وقت ہے۔“

”ابوسفیان نے پوچھا: ”کتنی مرتبہ ہوتی ہے یہ نماز؟“

عباسؓ نے کہا: ”دن رات میں پانچ مرتبہ۔“

”ابوسفیان نے حیرت سے کہا: ”پانچ مرتبہ تو بہت زیادہ ہے۔“

یہ کہہ کہہ ابوسفیان خیمے سے باہر آگیا۔ باہر آکر اُس نے دیکھا کہ فدائیانِ اسلام کس

طرح تہی کریم کے گرد پروانہ دار جمع ہیں۔ ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں، اس کو شش میں کہ حضور کے وضو کے پانی کی ایک چھینٹ اُن پر پڑ جائے۔ اُن کے وضو سے بچے ہوئے پانی کا ایک قطرہ انہیں بہر آجائے۔ ابوسفیان یہ دیکھ مبسوت ہو گیا۔ کہنے لگا:

”ابو الفضل میں نے آج تک ایسی عقیدت کہیں نہیں دیکھی۔“

عباس نے جواب میں صرف اتنا کہا:

”ابوسفیان اب تمہیں کس کا انتظار ہے۔ تم بھی رسالت کی شہادت دو۔“

ابوسفیان نے بہت دھیمے لہجے میں کہا:

”مجھے اُن کے پاس لے چلو۔“

فجر کی نماز کے بعد عباسؓ، ابوسفیان کو لے کر رسول کریم کی خدمت میں پہنچے جہاں ابوسفیان نے اُن کی رسالت کی شہادت دی اور پورا کلمہ پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ حضور نے ابوسفیانؓ کو گلے لگایا اور مبارک باد دی۔ میں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور رسول کریم کے الفاظ دہرائے:

”اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ ایمان بندے کی اپنی صفت نہیں، اللہ کا عطیہ ہے۔“

”ابوسفیان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا:

”ارے حبشی، تُو تو بڑا معلم بن گیا ہے۔“

یہ لقب مجھے موقع بے موقع کئی بار ملا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہمیں کوچ کا حکم ملا۔ مکہ کی طرف، جو ہمارے سفر شوق کی آخری منزل تھا۔ مرالظہران سے مکہ!

## فتح مکہ

مرالظہران سے دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت طے کر کے ہم ذو طویٰ پہنچے۔ وہاں حضور نے لشکر کو رکنے کا حکم دیا۔ ذو طویٰ مکے سے اتنا قریب ہے کہ وہاں سے مکے کا شہر نظر آتا ہے۔ قصواء پر بیٹھے بیٹھے حضور نے فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ میمنہ کی قیادت خالد بن ولیدؓ کو دی اور میسرہ کی زبیر بن العوامؓ کو۔ خالد کے ساتھ، عوسلم کا رسالہ تھا اور زبیر کے دستے میں پانچ سو مہاجر اور کچھ دیگر لوگ تھے۔ اُس دن زبیر نے پیلے رنگ کا عمامہ باندھ رکھا تھا۔ فوج کا تیسرا حصہ، جس میں حضور خود تھے، صرف مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھا۔ اس کا ہر سپاہی پوری طرح مسلح، سر سے پاؤں تک فولاد سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرف اُن کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مرالظہران سے روانگی کے وقت حضور نے اپنے دستے کا پرچم سعد بن عبادہ کو دیا تھا۔ میمنہ میسرہ مقرر کرنے کے بعد انہوں نے اپنے دستے کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کا پرچم سعد کے بیٹے قیس کے حوالے کیا اور دوسرے کا جس میں وہ خود تھے، ابو عبیدہ کو



عظا فرمایا۔ جب حضورؐ یہ احکام دے رہے تھے، ابو بکرؓ اور انسؓ بن حنظلہ کے آگے پیچھے تھے اور عثمانؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ دائیں بائیں۔ لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد حضورؐ نے حکم دیا کہ خالدؓ شہر کے زیریں حصے سے اور باقی تین دستے مکے کے تین دڑوں سے الگ الگ لیکن یہ ایک وقت شہر میں داخل ہوں گے۔

میں خادم رسول، حضورؐ کے دستے میں شامل تھا۔ انہوں نے اپنے خود پر سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی چند قدم بعد حضورؐ نے اپنے دستے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ سب رک گئے تو آپ نے بہت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سورہ الفتح اور سورہ النصر کی تلاوت فرمائی اور پھر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ یہ دستہ شہر کے بالائی درے اذخر سے جوں اور مقلات کے قریب سے مکے میں داخل ہوا۔ جہاں سے سارا شہر نظر آتا ہے۔ ہماری پہلی خواہش یہ تھی کہ ہم خانہ کعبہ کو دیکھیں، کعبے پر نظر پڑتے ہی ہم سب کی عجیب حالت ہو گئی۔ آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر شکر کے کلمات، خانہ کعبہ کو جی بھر کے دیکھنے کے بعد میں نے باقی شہر کی طرف نظر دوڑائی۔ سارا شہر سنسان پڑا تھا۔ معلوم ہوا تھا ہمارے لئے خالی کر دیا گیا ہے۔ لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں پناہ لینے کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ باقی پہلے ہی اپنے گھروں میں پہنچ چکے تھے۔ خانہ کعبہ کے گرد بھی بہت تھوڑے سے لوگ تھے۔ ایک سال پہلے بھی یہ شہر ہمارے لئے خالی ہوا تھا مگر اس مرتبہ صرف تین دن کے لئے جو بہت جلد ختم ہو گئے تھے۔

ذرا آگے بڑھے تو جوں اور مقلات کے علاقے سامنے تھے جہاں میں اکثر امیہ کے کاموں کے سلسلے میں آیا جلیا کرتا تھا، سارا راستہ بھاگتے ہوئے کہہ دیر ہو گئی تو کہیں آقا ناراض نہ ہو جائے۔ جوں ہی کے محلے میں آج سے کئی سال پہلے ایک رات ہشام بن عمرؓ، زبیر بن ابی امیہؓ، مطعم بن عدیؓ، ابو النخریؓ اور زمعہ بن الاسودؓ نے جو ہاشمؓ کے دو سالہ معاشرتی مقاطعے کو ختم

کرانے کا تہیہ کیا تھا۔ سامنے مکے کا بازار نظر آ رہا تھا جہاں میرا کئی بار سودا ہوا تھا۔ بازار کے ایک طرف نظر پڑی تو وہاں تلواریں چمک رہی تھیں۔ معلوم ہوا تھا جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ حضورؐ نے بہت تردد سے پوچھا:

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے ہتھیاروں کے استعمال سے منع کیا تھا۔“

پھر عثمانؓ نے آگے بڑھ کر خبر دی کہ خالدؓ کے رسالے پر نکر مہ، سہیل اور صفوان

کے ایک دستے نے حملہ کر دیا تھا۔

اس پر آپؐ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔“

جوں کے محلے میں جنت المعلیٰ کے پاس، جہاں خدیجہؓ اور حضورؐ کے صاحب زادے

قاسم دفن ہیں، سُرخ چمڑے کا ایک خیمہ نصب تھا جو ابو رافعؓ نے حضورؐ کے لئے لگایا تھا۔

خانہ کعبہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر۔ یہ ابو رافعؓ وہی تھے جن کو جنگ بدر کے بعد ابو لبب نے

ہاتھوں پٹنا دیکھ کر اُم الفضل نے ابو لبب کے سر پر ڈنڈا مارا تھا۔ اسی ڈنڈے کا زخم بچو کر

بلاخر اس کی موت کا سبب بنا۔ ابو رافعؓ کا قصور یہ تھا کہ ابو لبب نے اُن سے جب جنگ بدر کی

تفصیل پوچھی تو اُنہوں نے صاف صاف سارے واقعات بیان کر دیئے جو ابو لبب کو بہت

توہین آمیز معلوم ہوئے۔ تفصیل برداشت سے باہر ہو گئی تو ابو لبب نے غصے میں ابو رافعؓ کو

مارنا شروع کر دیا۔ ابو رافعؓ کبھی عباسؓ کے غلام تھے جنہیں انہوں نے رسول کریمؐ کی خدمت

میں پیش کر دیا تھا۔ حضورؐ نے انہیں آزاد فرمادیا تھا مگر آزاد ہونے کے بعد بھی وہ میری طرح

حضورؐ ہی کی خدمت میں رہے۔ حضورؐ کی نظر خیمے پر پڑی تو انہوں نے سامنے کھڑے جاہلؓ

کو پاس بلا کر اشارے سے وہ خیمہ دکھایا اور ساتھ ہی شکر و ثنا میں مشغول ہو گئے۔ اُن کا سر تشکر

سے اتنا جھک گیا کہ ریش مبارک قصواء کی گردن کو چھونے لگی۔ ابو نبیس کی پہاڑیوں پر بھی

کوشش کی۔

میں برتن رکھنے اندر گیا تو سرورِ دو عالم شکرانے کے نفل پڑھ رہے تھے۔ آٹھویں رکعت ختم کر کے سلام پھیرا تو انھوں نے مجھے بلا کر کہا کہ وہ صحنِ کعبہ میں بھی شکرانے کے دو نفل سب کے ساتھ مل کر ادا کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک چھڑی اٹھائی اور باہر لے جا کر اسے خانہ کعبہ کی دیوار کے سامنے زمین پر گاڑ دیا۔ اس کے فوراً بعد حضورِ خیمے سے باہر

تشریف لائے۔ سر پر وہی سیاہ عمامہ تھا مگر اب زرہ بخر نہیں، روزمرہ کے کپڑے پہن رکھے تھے جن میں انھوں نے خیمے کے اندر شکرانے کے نفل پڑھے تھے۔ صفیں درست ہوئیں اور سب نے حضور کی قیادت میں چھڑی کی سمت رخ کر کے شکرانے کے دو نفل ادا کئے۔ اس کے بعد آپ خیمے میں تشریف لے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ پھر فوجی لباس میں خود اور زرہ بخر پہنے، تلوار لگائے باہر آئے اور قصواء پر سوار ہو گئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اور خود کا معطر اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ لوگ جو صبح کے سفر میں اُن کے ہم رکاب تھے خیمے سے باہر اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ قصواء چلی تو وہ بھی ساتھ ساتھ ہو لئے۔ حضور، ابو بکرؓ سے باتیں کرتے ہوئے خانہ کعبہ کے جنوب مشرقی گوشے پر پہنچے اور چھڑی کو حجرِ اسود کے ساتھ لگا کر استلام کیا۔ پاس کھڑے لوگوں نے بھی اُن کے ساتھ اللہ اکبر کہا۔ پھر اور لوگ بھی شامل ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں سارا حرم اللہ اکبر کی صدا سے گونج اٹھا۔ حضور نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کر دیا اور طواف میں مشغول ہو گئے۔

اُس دن قصواء کی مہار اوس کے محمد بنِ منکبہ کے ہاتھ میں تھی۔ گزشتہ سال عمرہ القضاء کے موقع پر یہ سعادت قبیلہ خزرج کے عبداللہ ابن رواحہ کے حصے میں آئی تھی۔ طواف کے سات چکر پورے کرنے کے بعد انہوں نے خانہ کعبہ کے اطراف رکھے ہوئے بتوں پر نظر ڈالی اور اُن کی طرف چل پڑے۔ ہر بت کے پاس گئے اور اُسے اپنے دست

کچھ لوگ جمع تھے جن میں ابو بکرؓ کے بے حد ضعیف اور نابینا والد عثمان بن عامر جنہیں ہم ابو قحافہ کے نام سے جانتے ہیں اور ابو بکرؓ کی ہمیشہ قریبہ بھی تھیں۔ یہ دونوں ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ ابو قحافہ کو میں نے ایک مدت کے بعد دیکھا تھا۔ اتنے بزرگ ہو چکے تھے کہ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ قحافہ اُن کی صاحب زادی جن کے نام سے اُن کی کنیت ہے اُن کی سب سے چھوٹی اولاد تھیں۔

ابوسفیانؓ نے ہماری فوج کی آمد سے پہلے ہی کئے پہنچ کر داعیِ اسلام کی طرف سے اعلان کر دیا تھا کہ جو اُن کے گھر میں یا خانہ کعبہ میں یا اپنے گھر کے اندر دروازے بند کئے بیٹھا ہو گا، اُسے امان دی جائے گی۔ پہلے پہل تو لوگوں کو یقین نہیں آیا لیکن جب یہی اعلان اسلامی لشکر کے مختلف دستوں سے بار بار ہوا تو لوگوں کو اطمینان ہوا اور وہ ایک ایک دو دو کر کے حرم کعبہ میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔

اُمّ سلمہؓ، میمونہؓ، اور فاطمہ الزہراءؓ خیمے میں حضورؐ کا انتظار کر رہی تھیں۔ اُمّ ہانیؓ بھی کچھ دیر پہلے اپنے گھر سے چل کر وہیں آگئی تھیں۔ قصواء آہستہ آہستہ چلتی سرخ خیمے کے پاس پہنچی تو ابو رافعؓ نے بڑھ کر ان کی مہار تھام لی۔ حضورؐ نیچے اترے اور خیمے میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے غسل فرمایا۔ جب میں اُن کے غسل سے چاہا ہوا پانی لے کر خیمے سے باہر آیا تو ایک ہجوم اُس پانی کا منتظر تھا۔ سب مجھ پر ٹوٹ پڑے اور قریب تھا کہ پانی کا برتن میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتا کہ ابو حقیقہؓ نے آگے بڑھ کر لوگوں کو نظم و ضبط کی تاکید کی۔ پھر بھی ہر شخص بے تاب تھا کہ وہ اس سعادت سے محروم نہ رہ جائے۔ جس کے پاس کوئی کاسہ تھا، اُس نے بھر لیا۔ جس کے پاس کچھ نہیں تھا اُس نے چلوؤں میں لے کر چرے اور سینے پر مل لیا۔ جن کو اتنا بھی نہ مل سکا انہوں نے صرف چھینٹوں پر اکتفا کی اور جنہیں چھینٹے بھی میسر نہیں آئے انہوں نے دوسروں کے ہاتھوں سے اُس پانی کی نمی حاصل کرنے کی

مبارک میں پکڑی ہوئی کمان کی نوک سے گراتے گئے۔ ساتھ ساتھ کتے جاتے تھے :  
 ”حق آگیا ہے اور باطل فرار ہو گیا ہے۔ بے شک باطل کو فرار ہی ہونا تھا۔“

اطراف کے بے کو گرانے کے بعد وہ خانہ کعبہ کے سامنے رکھے ہوئے بُت ہبل کے پاس گئے اور اُسے گرا کر توڑنے کا حکم دیا۔

اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ سب بے کو بندر آتش کر دیا جائے۔ ساتھ ہی شہر میں منادی کروادی کہ جس جس گھر میں بُت رکھے ہوئے ہیں، وہ لا کر باقی بے کو کے ساتھ جلا دئے جائیں۔

مشرکین عرب کے تمام خداؤں کی مجموعی خدائی مطاف میں بلے کا ڈھیر بنی ہوئی تھی جس میں جگہ جگہ آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ لکڑی، کپڑے، جھلی سے بنے ہوئے بے کو سے شعلے لپک رہے تھے۔ پتھر کے بے کو کے جاچا بکھرے ہوئے اعضاء پر ان شراروں کی چھوٹ پڑتی تو ان پر سجاوٹ کے لئے لگے ہوئے پیتل کے نقش و نگار دمک دمک اُٹھتے۔ بڑی عبرت کا مقام تھا کہ جب یہ سارے بت قائم تھے تو ان سے کبھی کسی کو روشنی کی ایک کرن بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اعلیٰ نہیل کا نعرہ لگانے والا آج کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا جو ان سے مرادیں مانگے۔ مرادیں پوری کرنا تو درکنار وہ آج اپنی مدد کرنے سے بھی قاصر تھا۔ اُس کے جاچا بکھرے ہوئے ٹکڑے آگ میں دہک رہے تھے۔ بے کو کے پجاری آج اپنے بے بس خداؤں کی فرضی معبودیت کے حصار سے نکل کر معبود واحد و لاشریک کے جو ارحمت میں اُس کے رسول برحق کے ساتھ اتنی بلند یوں پر پہنچ چکے تھے جہاں انہیں اپنے جھوٹے خداؤں کی باقیات پر ترس کھانے کا بھی دماغ نہیں تھا۔

ان بے کو کو بیس جلتا چھوڑ کر آنحضرت نے قسواء کا رخ صفا کی طرف موڑ دیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے وہاں رکھے ہوئے اساف کے بت کو توڑ گرانے کا حکم دیا۔ پھر مروہ کی پہاڑی

کا رخ فرمایا۔ یہاں نائلہ کابت نصب تھا۔ یہ بت بھی حضور کے حکم پر توڑ کر گرا دیا گیا۔ اساف اور نائلہ کے ٹکڑے بھی حضور کے ارشاد کے مطابق مطاف میں چلتے ہوئے دیگر بتوں کے ساتھ جلتی آگ میں پھینک دیئے گئے۔ مروہ پر قائم نائلہ کابت وہ مقام تھا جہاں مشرکین ذبح کیا کرتے تھے۔ یہ دونوں بھی معبود تھے مگر مشرکین کے دوسرے خداؤں سے ذرا کم حیثیت۔ نائلہ اور اساف کے بارے میں میں نے بہت عجیب عجیب کہانیاں سن رکھی ہیں مگر مجھے کبھی ان باتوں کی تصدیق کا موقع نہیں ملا اس لئے ان کہانیوں کا ذکر مناسب نہیں۔ اگر تصدیق ہوگی اور عمر نے وفا کی اور ہمیں پھر کبھی مل بیٹھنے کا موقع میسر آیا تو بیان کر دوں گا۔

اب حدودِ حرم میں صرف ایک بُت نظر آ رہا تھا۔ سارے بے کو سے بڑا، پیتل کا بنا ہوا۔ یہ بے کو خزاعہ کا معبود تھا اور خانہ کعبہ کی چھت پر لوہے کی میخوں سے سے نصب تھا۔ میں نے سنا ہے یہ بے کو خزاعہ ہی تھے جن کے ایک خوش فہم بزرگ صدیوں پہلے شام سے ہبل کا بت لے کر آئے تھے اور یوں ان کی کج فہمی سے عربستان میں بت پرستی کی ابتداء ہوئی۔ حضور نے ایک نظر بے کو خزاعہ کے بت کو دیکھا اور قسواء سے اتر کر علیؑ سے کہا کہ وہ کعبے کی دیوار کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ علیؑ نے تعمیل کی، پھر حضور نے ان کے شانوں پر پاؤں رکھ کر خانہ کعبہ پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن علیؑ سے ان کا وزن برداشت نہ ہو سکا۔ پھر رسول پاکؐ خود ان کی جگہ بیٹھ گئے اور علیؑ کو حکم دیا کہ وہ ان کے شانوں پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھیں اور خزاعہ کے بت کو اکھاڑ کر نیچے پھینک دیں۔ علیؑ نے تعمیل کی اور یوں یہ آخری بت بھی بھڑکتے شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔

حرم کعبہ کو بے کو کی آلودگی سے پاک کر کے آپ مقامِ ابراہیم پر آئے، قسواء سے اتر کر دو نفل ادا کئے، پھر پیدل چاہِ زمزم پر گئے۔ یہاں عباسؓ نے انہیں آبِ زمزم پلایا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک اعلان کے ذریعے زائرین کو پانی پلانے کی ذمہ داری ہمیشہ کے لئے

ہوں کی تصویریں نبی ہوئی تھیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی صورتیں بھی نبی ہوئی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں کے پاس پانے کے تیر رکھے تھے جن سے کفار مکہ فال نکالتے تھے۔ انہیں دیکھ کر رسول اللہ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ ان کافروں کو برباد کرے۔ واللہ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل دونوں نے کبھی تیروں سے فال نہیں نکالی۔“

یہ کہہ کر انہوں نے عثمانؓ کو حکم دیا کہ ساری دیواریں صاف کر دی جائیں اور دونوں پیغمبروں کی صورتیں اسی وقت اٹھوا کر دوسرے بتوں کے ساتھ آگ میں پھنکوا دیں۔ دوسری اور آخری مرتبہ حجۃ الوداع پر جب مجھے اور اُسامہؓ کو ایک مرتبہ پھر حضورؐ کے ساتھ خانۂ کعبہ کے اندر جانے کی سعادت حاصل ہوئی تو خانۂ کعبہ کی دیواریں اندر سے بالکل صاف ہو چکی تھیں اور جاہلیت کے نقش و نگار کا نشان بھی موجود نہیں رہا تھا۔ چند منٹ اندر ٹھہر کر حضورؐ نے دروازہ کھلوا لیا اور باب کعبہ میں کھڑے ہو کر فتح مکہ کا تاریخی خطبہ دیا۔ میں اور اُسامہؓ، آپ کے پیچھے کھڑے حاضرین اور اُن کے چروں کے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ اس وقت تک حرم کعبہ لوگوں سے بھر چکا تھا۔ حضورؐ نے اللہ جل شانہ، کی حمد کی، پھر اُس کا شکر ادا کیا کہ اُس نے اسلام کو باطل کی تمام قوتوں کے مقابلے میں سرخرو کیا۔ خطبے میں ”لا تشریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وهو الرحم الرحیم“ کے الفاظ ادا ہوئے تو چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ وہ ہو گیا جس کی لوگوں کو توقع نہیں تھی۔ اس سناٹے میں بھی ان الفاظ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی بلکہ سناٹا ختم ہونے کے بعد بھی لوگوں کے ذہنوں پر سرور کائنات کے ان الفاظ کا طلسم چھلایا رہا۔

یہ پہلے بھی انہیں کا منصب تھا مگر اب رسالت کی طرف سے اس کی توثیق کر دی گئی۔ اس کے بعد علیؓ نے خانۂ کعبہ کی چابی پیش کی تو عباسؓ نے درخواست کی کہ کعبہ کی کلید برداری بھی ہو ہاشم کو عنایت فرمائی جائے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

”میں تم کو وہ دے سکتا ہوں جو تم نے کھویا تھا۔ وہ نہیں جسے دینے سے کوئی اور کچھ کھو بیٹھے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے عبدالدار کے عثمان بن طلحہؓ کو بلوایا اور چابیاں اُن کے حوالے کر کے اُن کے خاندان کے اس قدیمی منصب کی بھی توثیق کر دی۔ عثمانؓ نے نہایت ادب سے چابی لی اور خانۂ کعبہ کا دروازہ کھولنے چلے گئے۔ اُس وقت میرے ذہن میں دعوتِ اسلام کے اولین ایام کا ایک منظر پھر گیا۔ ایک دن حضورؐ نے عثمان بن طلحہؓ سے در کعبہ کھولنے کی خواہش کی تھی مگر عثمانؓ نے نہایت سختی سے انکار کر دیا تھا۔ اُس دن حضورؐ نے کہا تھا:

”عثمان! ایک دن آئے گا جب یہ کبھی میرے پاس ہوگی اور میں جسے چاہوں گا اُسے تفویض کر دوں گا۔“

اس پر عثمانؓ نے کہا تھا:

”شاید اُس دن تمام قریش مرچکے ہوں گے۔“

اور نبی کریمؐ نے جواب دیا تھا:

”نہیں وہ تو قریش کی سچی عزت کا دن ہوگا۔“

حضورؐ خانۂ کعبہ کی طرف بڑھے تو میں اور اُسامہؓ بھی اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ انہوں نے میں بھی اپنے ساتھ اندر جانے دیا۔ اور عثمانؓ سے کہہ کر اندر سے تالا لگوا دیا۔ ہزاروں کے مجمعے میں حضورؐ کے ساتھ خانۂ کعبہ کے اندر جانے کا شرف ہمارے حصے میں آیا۔ میرے لئے خانۂ کعبہ میں داخل ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ چاروں طرف دیواروں پر

## فتح مکہ کی اذان

خطبہ ختم ہوتے ہی ظہر کا وقت ہو گیا تو رسالت مآبؐ نے پیچھے مڑ کر مجھے اپنے پاس بلایا اور بیت اللہ شریف کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کا حکم دیا۔

صلح حدیبیہ کے ایک سال بعد عمرۃ القضا کے موقع پر بھی میں نے رسول اللہؐ کے ارشاد کے مطابق خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دی تھی۔ اُس موقع پر ابو بکرؓ پر بیٹھے سردارانِ قریش کے تاثرات مجھ تک پہنچ گئے تھے مگر آج جب فتح مکہ کے دن مجھے خانہ کعبہ کی چھت پر سے اذان دینے کا حکم ملا تو مجھ میں کسی اور کے تاثرات محسوس کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میں خود اپنے تاثرات کے سمندر میں بچکولے کھا رہا تھا۔ میں بلال حبشی آج دوسری مرتبہ جد الانبیاءؑ ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے اس مرکزِ توحید کی بلند یوں سے اللہ وحدہ لا شریک کی کبریائی اور سید الکونین حضرت محمد مصطفیٰؐ کی رسالت کی شہادت دینے والا تھا۔ مسجد نبویؐ میں میری پہلی اذان کو رسالت مآبؐ نے اپنی مسجد کی تکمیل سے تعبیر فرمایا تھا۔

آج خانہ کعبہ سے میری صحیحہ الہی کو وہ کل نبی نوع انسان کے لئے تطہیر کعبہ کا اعلان بنانا چاہتے تھے۔ یہ بلال حبشی کی معراج تھی۔

میں باب ملتزم کے ساتھ چھت سے لٹکے ہوئے رسوں کے سہارے کعبے کی دیوار پر چڑھنے لگا۔ ہانپتا کانپتا، ہاتھ کبھیاں پاؤں ٹکاتا، آہستہ آہستہ اوپر ہوتا گیا اور آخر کار چھت کی منڈیر پکڑ کر اوپر پہنچ گیا۔ بہت تھک گیا تھا۔ جوانی کا زور اب نہیں رہا تھا۔ پچاس سال کا ہونے والا تھا مگر جوش و جذبہ پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔ فوراً لمبے لمبے سانس لے کر اپنے آپ کو سنبھالا اور اذان دینے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

کعبے کے گرد ایک بہت بڑے دائرے میں رکھے ہوئے تین سو ساٹھ بت جن پر ایک سال پہلے میری اذان سن کر لرزہ طاری ہوا تھا، اس وقت آگ میں جل چکے تھے۔ اُن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کعبہ بے عوں سے پاک ہو چکا تھا۔ اس مرکزِ توحید میں بے عوں کا وجود ہماری عبادت کی لطافت میں کثافت کے عنصر کی طرح شامل رہتا تھا۔ نیچے گھوگھوں کا تم غمغیر تھا۔ دور دور تک جہاں جہاں نگاہ پہنچتی تھی، لوگ ہی لوگ تھے۔ مکے کی شکل سامنے میز پر رکھے ہوئے پیالے جیسی ہے۔ بیچ میں خانہ کعبہ اور چاروں طرف پیالے کی دیواروں کی طرح اوپر جاتا ہوا پہاڑی سلسلہ جس پر شہر آباد ہے۔ کعبے کی چھت سے اُس دن میری نظر ادھر بھی اٹھ گئی جہاں رباح اور حمامہ رہتے تھے، میرے والدین جن کے یہاں میں کیتھوں کوڑوں کی سی حیثیت میں پیدا ہوا تھا، جہاں میرا چچان گزرا تھا۔

صبح کعبہ تو بھر اہوا تھا ہی چاروں طرف پہاڑیوں کی بلند یوں پر بھی لوگ جمع تھے۔ میں نے اذان شروع کی۔ پھرے پہلے ہی لفظ پر نیچے کھڑے ہجوم کا شور تھم گیا۔ دوسری تکبیر کسی تو مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ میری اذان میں اُس دن ایک غیر معمولی تاثر تھا۔ یہ میں اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ میری اذان کے الفاظ، سامنے پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس

ساتھ تو صیف ربانی، شہادت رسالت اور دعوتِ صلوة میں شریک ہے۔ وہ حریمِ قدس جسے اسلام کے معمارِ اول حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا، ہزاروں سال تک کدہ رہنے کے بعد آج پھر ایک حبشی غلام کے نغمہ توحید سے گونج رہا تھا۔ یہ اذان اسلامی انقلاب کی کامیابی کا اعلان تھی۔

میں نے شہادت رسالت دیتے وقت رسول اللہ کی طرف اشارہ کیا۔ اُن کا سر لشکر سے جھکا ہوا تھا۔ اس بدرِ کامل کے گرد فرشِ کعبہ پر ستاروں کا ہجوم تھا جن میں سے نہایت روشن ستاروں کا ایک ٹھہر مٹ حضورؐ کے ساتھ تھا۔ ابو بکرؓ، عمرؓ، علیؓ عبدالرحمن بن عوفؓ، ابوذر غفاریؓ۔ اور بھی بڑی بڑی روشنیاں تھیں، فاصلے فاصلے سے، بغیر کسی ترتیب کے عجب چکا چوندہ کا عالم تھا۔ ایک کہکشاں تھی جو حرم کعبہ کے فرش پر اتر آئی تھی۔ یہی وہ عظیم فتح تھی جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے سورہ فتح کی آیت میں فرمایا تھا جو حدیبیہ سے مدینہ جاتے ہوئے راستے میں نازل ہوئی تھی۔ یہ وہی کامیابی تھی جس کی بشارت طریق ہجرت پر مدینہ جاتے ہوئے سورہ القصص کی آیت میں دی گئی تھی۔

میں اکثر رات کو سوتے سوتے چونک کر اٹھ بیٹھتا ہوں اور اُس دن کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ کیا شہر ایسے بھی فتح ہوتے ہیں یا وہ اک خواب تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ واقعہ تھا ہی اتنا عجیب، اتنا حسین، اتنا زور پرور کہ اُسے خواب ہی کہا جاسکتا ہے۔ حقیقتیں ایسی کب ہوتی ہیں مگر پھر میں اپنی یادوں کے درپچوں سے ہوتا ہوا وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ وہ حقیقت جو خوابوں سے بھی حسین تھی، میرے سامنے آجاتی ہے۔ کیا واقعی یہ سب کچھ ہوا تھا؟ میرے سامنے بالکل ایسے ہی! میری ہی اذان کی بازگشت تھی یا مکے کی پہاڑیاں خود وحدتِ الہی اور رسالتِ محمدؐ کا اعلان کر رہی تھیں۔

اس وقت بھی جب میں اپنی دلہیز پر بیٹھا اپنی چھڑی کے دستے پر ٹیک لگائے سامنے پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا ہوں، میں اپنے آپ سے یہی سوال پوچھ رہا ہوں۔ مگر نہیں یہ خواب نہیں ہے! تاریخ نے واقعی خانہ کعبہ کی چھت سے میری

اذان سنی ہے۔ آج بھی وقت کے ایوانوں میں قح مکہ کی اُس اذان کی گونج سنائی دے رہی ہے جو قح مکہ کے دن رسول اللہ کے حکم پر اللہ کے قدیم گھر میں مجھ بندہ ناجیز کی آواز میں ادا ہوئی تھی۔

تمام مکہ صحن حرم میں اُٹھ آیا تھا۔ ہجوم میں مکے کے تاجر پیشہ حضرات تھے جن میں سے پیشتر حجر اسود اور رکن یرمائی کے درمیانی علاقے میں تھے اور شاید اس سوچ میں گم تھے کہ جاں بخشی تو ہو گئی مگر یہ واقعہ جو دفعتاً رونما ہوا، اُن کے کاروبار پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔ بین الاقوامی شاہراہ پر قائم مکے کا قدیم شہر صدیوں سے ایک اہم تجارتی حیثیت رکھتا تھا۔ کئی ملکوں سے کاروباری رابطے تھے مگر اب مکے کا تجارتی مستقبل کیا ہوگا۔

غریب، مزدور، محنت کش، بے وسیلہ، غلام، بڑی تعداد میں رکن عراقی کے سامنے حطیم کے پاس بیٹھے تھے۔ جو کچھ اُنہوں نے دیکھا اور سنا تھا، اُنہیں اچھا لگا تھا مگر پھر بھی اُن کی سہمی سہمی حیرت زدہ آنکھوں سے لگتا تھا کہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں جس کے بارے میں انہیں خوف ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کہیں بکھر نہ جائے۔ کیا واقعی انقلاب کے بعد زندگی کی کوئی سولت اُنہیں بھی میسر آسکے گی۔

اُن کے سامنے ذرا فاصلے پر بائیں طرف مقام ابراہیم کے گرد خانہ کعبہ کے سائے میں کج کلابان قریش بیٹھے تھے۔ کل تک اُن کی ادنیٰ سے ادنیٰ خوشی پر انسانیت کی ہر قدر قربان کی جاسکتی تھی۔ دولت و ثروت، حکومت، اثر و سونخ، اختیار سب کچھ اُن کی میراث تھا مگر اس تغیر کے بعد جو صورت حال اُن کا مقدر بنتی نظر آتی تھی وہ اُن کے لئے پریشان کن تھی۔ وہ بے بس تھے مگر اس بے بسی کے عالم میں بھی سوچتے تھے کہ اسلامی مساوات کی کڑوی گولی عملاً کس طرح حلق سے نیچے اترے گی۔

رکن عراقی اور مقام ابراہیم کے درمیان ان گنت معرکہ آراء، آزمودہ کار صاحبان سیف و کمان تھے جو یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ پشتِ ہاپشت سے

ان کے عروج کا گوارا، اُن کی عظمت و وقار کا ضامن، اُن کی شان و شوکت اور اقتدار کا محور شہر مکہ۔ بغیر عارت گری اور خوں ریزی کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن میں کیسے اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان میں چند شاید یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ یہ ایک جزوقتی شکست ہے اور حالات دیر سویر سے پھر اُن کی مرضی کے مطابق ہو جائیں گے۔

اُن کے ساتھ ہی بیٹھے چند صاحبانِ فکر و دانش شاید اس سوچ میں غلطاں تھے کہ نئے حالات میں شہر مکہ کی صدیوں پرانی عظمت برقرار بھی رہ سکے گی یا نہیں۔ تمام قبائل کے بُت آگ کا ایندھن بن گئے یا توڑ دیئے گئے تو اب کون آئے گا مکے میں چڑھاوے چڑھانے، منٹیں ماننے۔ اُن کے معبود ہی نہ رہے تو تمام رحمتیں اور برکتیں جو اہل عرب کے ذہنوں میں مکے سے منسوب تھیں رفتہ رفتہ خیال و خواب ہو جائیں گی۔ پھر کیا رہ جائے گا مکہ کسی کی نظر میں۔ ایسے بھی تھے جن کا ایمان تھا کہ مکے کی حرمت پر حملہ ہوا ہے اور اب قہر نازل ہو کر رہے گا، ویسا ہی جیسا اصحابِ قبل پر ہوا تھا۔ کچھ لوگ یقیناً یہ بھی سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ اتنے بڑے جید خدا جن کی طاقت، اختیار اور قدرت پر اُن کی ساری کائنات کا دار و مدار تھا اُن کی آن میں یوں فنا کر دیئے گئے اور کوئی قیامت برپا نہیں ہوئی۔ غرض ذہنوں میں طرح طرح کی سوچیں تھیں مگر نظریں سب کی بابِ ملتزم کی طرف محمد رسول اللہ پر تھیں جنہیں اُن میں سے اکثر جانتے تھے اور کئی بے نصیب جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ اُن کے دُئے مبارک کے ہر تاثر سے، اُن کی ہر جنبشِ ابرو، ہر حرکتِ لب میں اپنے ان گنت سوالوں کا جواب تلاش کر رہے تھے۔

کئی نوجوان تھے جو اس سارے منظر کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ساری زندگی اس شہر کے عروج کی، توقیر کی، تقدیس کی داستانیں سنتے رہے تھے، اُس کا فتح ہو کر کسی اور کے قبضے میں چلے جائے اُن کی فہم سے باہر تھا۔ وہ اس واقعے کے محرکات سے تو کچھ حد تک آشنا تھے مگر اس انقلاب کی تاریخی، تہذیبی اور سماجی اہمیت کا اُنہیں کوئی اندازہ نہیں تھا اور نہ وہ یہ

کچھ پارہے تھے کہ یہ بلا ہوا ماحول ان کی آئندہ زندگی پر کیا اثرات مرتب کرے گا۔ یہ بے فکرے، بڑوں سے ہٹ کر، چاہ زمزم کے نزدیک اپنا الگ پر اجماعے بیٹھے تھے۔ میں نے سنا، ان میں ایک عتاب نامی نوجوان کو میری اذان اچھی نہیں لگی۔ اُس نے پاس بیٹھے اپنے ایک مشرک ساتھی سے کہا شکر ہے آج میرا باپ زندہ نہیں ہے ورنہ وہ برداشت نہ کر سکتا کہ کعبے کی چھت پر ایک حمار سیاہ یوں ریٹے۔

دُنیا ہر قسم کے انسانوں سے مل کر بنی ہے اور اللہ جل شانہ جس کو جب چاہے ہدایت سے سرفراز کر دے۔

اسی ٹولے سے میری اذان کے دوران میں کسی نے از رہِ تمسخر میری اذان کی نقل اُتارنے کی کوشش کی۔ نہایت دھیمی آواز میں، جسے چند لوگوں نے سنا، اور بات آئی گئی ہو گئی۔ چند ثانیوں بعد اسی ٹولے سے کسی اور نے میری اذان کی نقل کی۔ اسے بھی زیادہ لوگوں نے نہیں سنا اور جنہوں نے سنا بھی وہ ماحول کی سنجیدگی کی وجہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ چند لمحے گزرے کہ اسی جماعت کے کسی اور لالابی نوجوان نے یہی صورت دہرائی مگر تینوں آوازیں اتنی مدہم تھیں کہ انہیں صرف قریب کے لوگوں نے سنا اور جب ان پر کہیں سے کوئی رد عمل نہیں ہوا تو ہر ایک نے یہ سمجھ کر سکھ کا سانس لیا کہ دانستہ شرارت کا یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور اب کسی باز پرس کی نوبت نہیں آئے گی۔ مگر ہوا یہ کہ اذان ختم ہوتے ہی حضور اکرمؐ نے اعلان فرمایا کہ وہ جس نے سب سے پہلے بلال کی اذان کی نقل کی تھی، سامنے آئے۔ حاضرین میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر شخص پریشان کہ اب کیا ہو گا۔ اتنے میں ایک پندرہ سولہ سالہ نوجوان چاہ زمزم کی سمت سے ملتزم کی طرف، راستہ بناتا ہوا، آتا دکھائی دیا۔ پاس آیا تو عمرؓ نے بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا اور اُسے لوگوں کی صفوں سے باہر نکل کر، باب ملتزم کے پاس، حضورؐ کے سامنے لے آئے۔ بہت سوں کو اُس کی نوعمری پر ترس آیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد حضورؐ زرب مسکراتے ہوئے اُس نوجوان کی طرف بڑھے اور

اسے انتہائی شفقت سے کہا کہ وہ بلال کی اذان کی نقل دوبارہ سنائے۔ نوجوان کچھ دیر نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ پھر اُس نے حاضرین کی سمت دیکھا اور خالق کائنات کی تکبیر اور رسالت کی شہادت کے کلمات اپنی بھرپور آواز میں ادا کئے اور اس خوش الحانی اور اعتماد کے ساتھ کہ تمام حاضرین دم خود رہ گئے۔ اکثر کے منہ سے بے ساختہ سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے الفاظ نکلے۔ خود ہی کریمؐ نے تعریف کی اور اُسے درہموں کی ایک تھیلی انعام میں دی۔ اُس کے سر، پیشانی اور سینے پر دست مبارک پھیرا۔ نوجوان کا شرح صدر ہوا، تو بقول اُس کے، اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے منوں بوجھ اُس کے سر سے اتار پھینکا ہے۔ اُس نے باوا بلند سب کے سامنے کلمہ شہادت پڑھا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ حضورؐ نے اُسے دُعادی اور اُس سولہ سالہ نوجوان کو تاحیات بیت عتیق کا مؤذن مقرر فرمادیا۔ ہم اس نوجوان کو ابو محذورہ جمحی کے نام سے جانتے ہیں۔

ابو محذورہ واپس اپنی صفوں کی طرف جانے لگے تو ان صفوں سے ایک اور آواز

اُٹھری:

”یا محمد! میں عتاب بن اُسید ہوں، آپ کا مشہور دشمن!“

یہ کہتے ہی اُس بیس سالہ نوجوان نے نہایت بلند آواز سے کلمہ شہادت ادا کیا۔ حضورؐ نے بھرے مجمع میں اپنے منہ بولے دشمن سے ایمان کی شہادت سنی تو فوراً اعلان فرمایا:

”میں تمہیں مکے کا امیر مقرر کرتا ہوں“

ساتھ ہی دینی تعلیم کے لئے انہوں نے معاذ بن جبلؓ کو ان کے ساتھ مامور کر دیا۔ عتاب بن اُسید کا مشاہرہ ایک درہم یومیہ مقرر ہوا۔ اُس سال فریضہ حج انہی کی قیادت میں ادا ہوا۔

ایک لمحے پہلے کا دشمن دیں، اسلام کے مفتوحہ شہر کا مطلق العنان والی بن گیا،



ایک لمحے پہلے کا غیر سنجیدہ، شریر نوجوان کائنات کی سب سے محترم عبادت گاہ کا مؤذن مقرر ہو گیا۔ یہ تھا غنودر گزر کا وہ سبق جو ہادی برحق نے دنیاوی اور مادی مصلحتوں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو سکھایا۔ پھر عتاب اور ابو محذورہ ہی کیا، محسن انسانیت کی رحمت بے پایاں کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورا علاقہ ایمان کی روشنی سے منور ہو گیا۔

ابھی چند روز پہلے میں اپنے ایک بزرگ دوست کے یہاں انہیں عمرے کی مبارکباد دینے حاضر ہوا تھا۔ مکے کا حال احوال سننے کا بھی شوق تھا، کہ آخر مکہ میری جائے پیدائش تھا اور وہاں کے ایک ایک ذرے سے میری ہزار ہزار یادیں وابستہ تھیں۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ابو محذورہ آج بارہ سال بعد بھی مسجد الحرام میں مؤذن کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور اہل مکہ میں ان کا بڑا احترام ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ شاد کام رکھے۔ اَللّٰهُمَّ زِدْ فِرْدًا۔

## خطبہ عرفات

دس ہجری، ذی الحج کی نو تاریخ، جمعہ کا دن، مقام: منیٰ۔ علی الصبح ربیعہ بن کعب نے حضور کے لیے وضو کا انتظام کیا اور میں نے فجر کی اذان دی۔ ہم نے حضور کے ساتھ نماز ادا کی اور جب سورج ذرا نکل آیا تو آپ نے مجھے وادی نمرہ میں اپنے لیے خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا۔ میں نے یہ ہدایت لوگوں تک پہنچادی۔ حضور منیٰ سے روانہ ہوئے۔ جاہلیت کے زمانے میں قریش کا یہ دستور تھا کہ وہ عرفات پہنچنے سے پہلے مزدلفہ میں مشعر الحرام کے قریب قیام کرتے تھے۔ چنانچہ خیال یہ تھا کہ حضور عرفات جاتے ہوئے مزدلفہ میں قیام فرمائیں گے، لیکن حضور اس دستور کے برعکس براہ راست وادی نمرہ میں تشریف لائے اور سنت ابراہیمی کے مطابق اعلان فرمایا:

”اپنے مقدس مقامات پر ٹھہرو کیونکہ تم اپنے باپ ابراہیم کی میراث پر ہو۔“

خاندان کے ربیعہ بن حارث کا خون معاف کرتا ہوں۔

جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود منسوخ کرتا ہوں۔

عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔

تمہارا خون، تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح اس مینے میں اور اس جگہ آج کا دن حرام ہے۔

میں تم میں ایک چیز چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز کیا ہے، اللہ کی کتاب!

اللہ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اب کسی کو وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔

چہ اس کا ہے، جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زنا کار کے لیے پتھر ہے اور اس کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

جو اپنے باپ کے سوا کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے آقا کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے، اس پر اللہ کی لعنت۔

عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ دینا جائز نہیں۔

قرض ادا کیا جائے، عاریتاً لی ہوئی ہر چیز واپس کی جائے، عطیے کا بدلہ عطیہ ہے اور ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔“

میدانِ عرفات میں چاروں طرف پھیلے ہوئے منبر آپ کا ایک ایک لفظ نثر کر رہے تھے اور

حضور کے لیے کوہِ شیبہ کے ایک غار کے دہانے پر سرخ اونٹنی کپڑے کا ایک خیمہ نصب کر دیا گیا۔ آپ نے دن ڈھلے تک خیمے میں قیام فرمایا اور عبادات میں مصروف رہے۔ پھر اپنی اونٹنی قسواء پر سوار ہوئے اور وادیِ عرفات میں جبل الرحمت کی طرف بڑھے۔ میں پایادہ قسواء کی مہارتھامے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ فرزند ان توحید نے حضور کو جبل الرحمت کی طرف جاتے دیکھا تو سب کے سب بصدا شتیاق اس چھوٹی سے پہاڑی کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ قسواء خراباں خراباں قدم اٹھاتی ہوئی اپنے عظیم المرتبت سوار کو پہاڑی کے اوپر لے گئی۔ ہمارے نیچے وادی میں ایک لاکھ سے بھی کہیں زیادہ کا اجتماع تھا۔ احرام میں ملبوس فرزند ان توحید کا اتنا بڑا اجتماع چشمِ فلک نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

چاروں طرف مہمّرت تعینات تھے کہ حضور کے لب مبارک سے ادا ہونے والے ایک ایک جملے کو اس طرح ڈھراتے جائیں کہ ایک ایک لفظ ہر شخص کے کانوں تک پہنچ جائے۔

حمد و ثناء کے بعد آپ نے فرمایا:

”جاہلیت کے تمام دستور میرے قدموں تلے ہیں۔

اے لوگو! بیشک تمہارا رب ایک ہے، اور بیشک تمہارا باپ ایک ہے۔

کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی سرخ کو سیاہ پر اور کسی سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں ہے، اگر کوئی فضیلت ہے تو محض تقویٰ کی بنیاد پر۔

سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

جو خود کھاؤ وہی اپنے غلاموں کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

آج جاہلیت کے تمام خون معاف کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے

جُحجُح ہمہ تن گوش، نہایت غور سے آپ کا خطبہ مبارک سُن رہے تھے۔ خطبہ کے بعد آپ نے حاضرین سے دریافت فرمایا:

”تم سے اللہ کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟“

مجھ سمیت سب نے بیک آواز عرض کیا:

”یا رسول اللہ! ہم کہیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام ٹھیک ٹھیک ہم تک پہنچادیا“

اس پر آپ نے اپنی اعنٹت مبارک آسمان کی طرف بلند کی اور تین مرتبہ یہ الفاظ

دہرائے:

”اے اللہ تو گواہ رہنا کہ یہ لوگ کیسی صاف صاف گواہی دے رہے ہیں۔“

خطبہ تمام ہوا تو آپ نے مجھے اذان دینے کا حکم دیا۔ چند ہی لمحوں میں ساری وادی میری آواز سے گونج رہی تھی۔ میں سراپا آواز بن چکا تھا، ایسی آواز، جو ہر طرف پہنچ رہی تھی اور عرفات کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس مجھ تک آرہی تھی۔ آپ نے آج سیاہ و سفید کی تمیز مٹا کر مجھ سیاہ فام کو وہ توانائی بخش دی تھی کہ میری آواز نور کا ایک سیل بن کر سارے عرفات میں موجزن تھی۔ اذان کے بعد حضور نے امامت فرمائی اور دو رکعت نماز ظہر اور پھر ساتھ ہی دوسری اقامت کے ساتھ دو رکعت نماز عصر قراءت کے ساتھ ادا کی۔ دونوں نمازیں قصر کے ساتھ پڑھیں۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ اپنے خیمے کے پاس تشریف لائے، کچھ دیر جبل مشاة کے سامنے صحرات کے پاس قبلہ رخ کھڑے رہے اور رب العزت کے حضور دعائیں مانگتے رہے۔ پھر قصواء سے اترے اور خیمے میں داخل ہو گئے۔ آخری وحی اسی خیمے میں نازل ہوئی جو سورہ مادہ کی تیسری آیت کی شکل میں محفوظ ہے۔ یہ وحی ہمارے دین کی تکمیل کا اعلان تھی۔ وہ دین جو پندرہ نمبر اول سے شروع ہو کر نبی آخر الزماں پر مکمل ہوا۔

## غلامی

دمشق بہت بڑا شہر ہے۔ دنیا کا شاید قدیم ترین شہر۔ کئی قدیم و جدید تہذیبوں کا سنگم۔ صدیوں سے تجارت کا عظیم مرکز۔ یہاں بھانٹ بھانٹ کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک سے ایک نکتہ داں، بال کی کھال کھینچنے والا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں صرف نکتہ چینی سے سروکار ہے۔ میں نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اسلام نے غلامی کے رواج کو برا کہتے ہوئے بھی اُسے روار کھا اور زمانہ جاہلیت کی دیگر مذموم رسوم کی طرح اُسے یک قلم منسوخ کرنے کی جائے اصل مسئلے سے چشم پوشی برتی۔ طبع آزمائی ہر شخص کا حق ہے لیکن فکر کا توازن اللہ کی دین ہے۔ میں، جس نے غلامی کے ہر ڈکھ کو اپنی جان پر جھیلا ہے، شاید اس موضوع پر کچھ کہنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر رسم کا ایک سماجی یا معاشرتی پس منظر ہوتا ہے۔ ہر رسم کی ابتدا کسی معقول وجہ سے ہوتی ہے۔ کچھ عرصے تک اُس کی معقولیت اور جواز قائم رہتا ہے، بعد میں انسان کی وقتی ضروریات یا اُس کا نفسیاتی عدم توازن اُس کی شکل بگاڑ دیتا ہے اور وہ اس

تقسیم لگاتے رہتے۔

عربستان میں بھی غلاموں کا رواج تھا۔ غلاموں کی اصل وجہ تو شاید وہی جنگل کا تانوں ہے کہ ایک طاقتور اپنی طاقت کے بل بوتے پر ایک کمزور کو اپنے حکم کا پابند بنا لیتا ہے اور کمزور اپنی جان کے خوف سے اُس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ طاقت خواہ جسمانی ہو، خواہ مال و متاع کی، خواہ خاندانی شرف یا حسب نسب کی برتری کی۔ دوسری صورت میں غلامی ایک سزا تھی جو ناکام حملہ آوروں کے گرفتار شدہ افراد پر عائد کر دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنی طالع آزمائیوں کا خمیازہ بھگتیں اور اُن کی حالت زار دیکھ کر دوسرے ایسی زیادتیوں سے باز رہیں۔ اس سے پہلے شکست پانے والوں کو قتل کر دینے کا رواج تھا۔ اب اُن کی افادیت ڈھونڈ لی گئی۔ ان غلاموں سے مختلف کام لئے جانے لگے تو یہ اپنے آقاؤں کی ضرورت بن گئے۔ رفتہ رفتہ ان کا وجود عزت و امارت کی علامت بن گیا۔ اب زمانہ امن میں بھی ان کی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ اُن کی خرید پر رقم خرچ ہونے لگی تو اُن کے لئے ایسے سخت قوانین وضع کر دئے گئے کہ وہ حکم عدولی یا فرار ہو جانے کا تصور بھی دل میں نہ لاسکیں۔ چونکہ اس حمام میں سبھی ننگے تھے، اس لئے ان قوانین پر سارے با اختیار طبقے کا اتفاق رائے ہو گیا۔ غلام جب ہر طرح کی سختیاں برداشت کرنے لگے تو آقاؤں کی ہوس اور بڑھ گئی اور یہ قوانین زیادہ سے زیادہ سخت گیر ہوتے ہوتے ظلم و تعدی کی آخری حدود میں داخل ہو گئے۔

عرب میں، جہاں تک مجھے علم ہے، پہلے پہل حبشہ کے لوگوں کو باقاعدہ غلام بنایا گیا تھا اور یہ اس لئے کہ یہ لوگ سمندر پار سے آکر عربوں پر حملے کرتے رہتے تھے اور اُن کے علاقوں میں آئے دن لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ بعد میں بے گناہ حبشیوں کو بھی غلام بنایا جانے لگا۔ حبشی اور غلام تقریباً ہم معنی الفاظ ہو کر رہ گئے۔ پھر غلاموں کی ضرورت اور بڑھی تو کمزور عرب قبیلوں کے لوگوں کو، بے سہارا افراد کو، یہاں تک کہ نئے مسافروں کو بھی پکڑ پکڑ کر غلام بنایا جانے

حد تک مسخ ہو جاتی ہے کہ اُس کا بنیادی مقصد ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر سب بغیر سوچے سمجھے لیکر پیٹتے رہتے ہیں۔ یونان کے قدیم فلسفیوں نے تو آزاد لوگوں کو بھی مستقل طبقات میں تقسیم کرنے کی سفارش کی تھی۔ اُن کا منشا تھا کہ انسانوں کے پیشے مقرر کر کے لبد آباد تک اُن کی اور اُن کی آنے والی نسلوں کی سماجی حیثیت متعین کر دی جائے۔ کم و بیش ان ہی خطوط پر ہندومت نے مذہب کی آڑ میں آزاد لوگوں کو الگ الگ اکائیوں میں بانٹ کر اُن کے خون، خاندان، نسل اور نسب کے اعتبار سے اُن کی ذاتیں بنا رکھی ہیں جن میں کچھ کو کچھ پر ذامی فوقیت حاصل ہے۔ وہ ایسی آہنی دیواروں کے پیچھے قید کر دئے گئے ہیں کہ اپنی تمام تر بشری خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود وہ انہیں پھلانگ نہیں سکتے، گویا یہ خود ساختہ سماجی زنجیریں قیامت تک کے لئے اُن کا مقدر بنا دی گئی ہیں۔ ایسے معاشروں میں غلاموں اور بیچ ذات کے لوگوں کو اپنے آقاؤں یا اونچی ذات والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اُن کی من مانیوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اُن پر چھوٹے چھوٹے انسانی خدام مسلط کر دئے گئے ہیں جن کے ہاتھوں میں اُن کی ساری خوشیاں، ساری خواہشات، ساری آرزوئیں دے دی گئی ہیں کہ وہ انہیں جس طرح چاہیں روندتے پھریں۔

رومن دور میں یہی کم تر انسان اپنے آقاؤں کی خدمت گزاری کے علاوہ اُن کے ہمسار ذہنوں کو تفریح بھی مہیا کرتے تھے۔ جب ذرا اشغل کوچی چاہا تو دو چار نئے غلاموں کو بھوکے شیروں کے آگے ڈال دیا۔ وہ چیختے چلا تے رہتے، قتل کرتے، ساجتیں کرتے، بھاگ بھاگ کر خونیں درندوں سے زندگی کے چند اور لمحے مانگتے رہتے، خون خوار شیروں کے پے در پے حملوں سے لہولہاں ہو کر رحم کی بھیک مانگتے مانگتے نڈھال ہو کر گر پڑتے۔ اور درندوں کا نوالہ بن جاتے۔ اُن کی دردناک چیخیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتیں۔ اُن کے آقا یہ سارے مناظر ایک دلچسپ کھیل، ایک تماشے کی طرح دیکھتے رہتے اور اپنی بیویوں بچوں اور مہمانوں سمیت

لگا۔ سلمان فارسیؓ کے ساتھ بعینہ یہی صورت پیش آئی تھی، وہ اللہ لوگ، تلاشِ حق میں اپنے مرشد کی وصیت پر موصل سے حجاز کے سفر کو روانہ ہوا تو کچھ رقم دے کر بنو کلب کے ایک قافلے میں شامل ہو گیا۔ چند بھید بھریاں جو اُس کا کل مال و متاع تھا، اُس کے ساتھ تھیں۔ قافلہ والوں نے بد معاملگی کی۔ راستے میں پہلے تو اُس کی بھید بھریاں کھالیں اور وادیِ اَلرُّمٰی پہنچ کر خود اُسے بھی ایک یہودی کے ہاتھ غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا۔ اُس یہودی نے اُسے کچھ عرصہ اپنے پاس رکھ کر مدینے کے بنو قریظہ میں اپنے ایک رشتے کے بھائی عثمان بن الاشہل کو بیچ دیا۔ اس طرح یہ مردِ حق مدینے میں وارد ہوا جہاں تاریخ نے اُس کے لئے لازوال عظمت و جلالت کا تاج تیار کر رکھا تھا۔ میرے والد اور والدہ تو شاید محض حبشی ہونے کے ناتے غلام بنا لئے گئے تھے۔ شقران صالحؓ اور عامر بن فہیرہؓ کا بھی اتنا ہی قصور تھا کہ وہ حبشی نژاد تھے۔

زیدؓ کے والد حارثہ یمن کے ایک نہایت معزز قبیلہ قضاء سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی والدہ سعدی مشہور زمانہ حاتم طائی کے قبیلے کی ایک شاخ بنو معن سے تھیں۔ ایک دفعہ وہ اپنے چچے کو لے کر میکے جا رہی تھیں کہ راستے میں بنو قین کی ایک جماعت نے غارت گری کی اور زیدؓ کو غلام بنا کر کئے لے آئے اور عکاظ کے میلے میں چار سو درہم کے عوض بیچ دیا۔ حکیم بن حزام اُن کے پہلے آقا تھے۔ ثوبانؓ اور یاسرؓ کا تعلق بھی یمن سے تھا۔ یاسرؓ کا ایک بھائی لاپتہ ہو گیا تھا۔ وہ اُس کی تلاش میں اپنے دو بھائیوں حارث اور مالک کے ساتھ کئے آئے۔ بھائی تو واپس یمن چلے گئے مگر وہ خود کئے میں رہ پڑے، بنو مخزوم کے حلیف ہو کر اسی قبیلے کے ابو حذیفہ بن المغیرہ کی جا رہی، سُمیہ بنتِ خُبابؓ سے شادی کر لی۔ انہی کے بطن سے عمادؓ پیدا ہوئے۔ سُمیہؓ کی نسبت سے یاسرؓ اور عمادؓ کا شمار بھی غلاموں میں ہونے لگا۔ سالمؓ، مولیٰ ابی حذیفہؓ بھی سلمان فارسیؓ کی طرح فارس نژاد تھے۔ صہیب بن سنانؓ عرب تھے۔ اُن کے والد شاہ فارس

کی طرف سے شہر موصل کے پاس دریائے دجلہ کے کنارے ایک مقام ابلہ میں حاکم تھے۔ رومیوں نے اُن پر شب خون مارا اور صہیبؓ کو جو اُس وقت بچے تھے، پکڑ کر لے گئے۔ وہ وہیں رومیوں کے ساتھ پلے بڑھے۔ بعد میں قبیلہ کلب کے لوگوں نے انہیں خرید لیا اور مکے لاکر فروخت کر دیا۔ خُباب بن ارتؓ بنو تمیم کے اور ابو فحیہؓ قبیلہ اُزد کے تھے۔ انہیں بھی باہر سے لا کر مکے میں فروخت کیا گیا تھا۔

اب غلامی کی حیثیت سزا کی نہیں رہ گئی تھی بلکہ ذی مرتبہ لوگوں کی ضرورت بن کر اُس نے ایک معاشرتی حقیقت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ سزائیں تو دیر سویر سے ختم ہو جاتی ہیں مگر اب جو غلامی کا طوق کسی کی گردن میں پڑتا تو پھر موت ہی اُسے اُس بدھن سے آزاد کراتی اور اس نجات دہندہ کے لئے غلاموں کی نظریں اور ہاتھ ہر وقت آسمان کی طرف اٹھے رہتے۔ غلامی کے اس ہمہ گیر رواج میں تاریخی اور جغرافیائی عوامل کے علاوہ علاقائی اور قبائلی عصبیتیں اور آقاؤں کے ذاتی مزاج کی بداعتدالیاں بھی شامل ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ یہ ایک ایسا ہم رنگ زمیں جال بن گیا جو کسی کو نظر بھی نہیں آتا تھا، محسوس بھی نہیں ہوتا تھا۔ مراعات یافتہ طبقہ اُسے اپنی روزمرہ زندگی کا معمول سمجھ کر اُس پر غور بھی نہیں کرتا تھا مگر جن کے لئے یہ جال چھا تھا اُن کی زندگی میں زہر گھولے رہتا تھا۔ مسئلے کی نوعیت یوں ہو تو اصلاح احوال کا کیا محل ہے۔ حل تو اُس چیز کا ڈھونڈا جاتا ہے جو حل طلب ہو۔ غلامی تو کسی کے نزدیک کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں اور جن کے نزدیک تھا وہ مجھ جیسے بے نوا، بے سہارہ لوگ تھے جو وقت کے معاشرتی تناظر میں کوئی آواز نہیں رکھتے تھے۔

مکے میں، صہیب رومیؓ اپنے روم کے قیام کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ روم میں جبر و استبداد سے تنگ آکر غلاموں نے اپنے آپ کو ایک غلام کی قیادت میں منظم کیا اور اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت کر دی۔ رومیوں نے اُن کی سرکوبی

کے لئے کئی لشکر روانہ کئے لیکن سر فروش غلاموں کی فوج اس بہادری سے لڑی کہ انہیں شکست دے دی، مگر آخری لڑائی میں باوسیلہ آقاؤں کی فوج فتح یاب ہوئی اور غلام ہار گئے۔ غلاموں نے یہ جنگ اپنی آنکھوں میں آزادی کا خواب سجا کر لڑی تھی کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ وہ روٹیوں سے نجات حاصل کر کے اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں گے۔ لیکن ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور آزادی کی اُس تک و دو میں ہزاروں غلام اپنی جان کی بازی ہار گئے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ انسان اکثر رات کی تاریکی میں سانپوں، چھوڑوں اور ملکہ حشرات الارض کے قریب سے گزر جاتا ہے مگر چونکہ وہ اُسے دکھائی نہیں دیتے اس لئے، اُس کے دل میں کسی قسم کا خوف نہیں پیدا ہوتا مگر دن کے اُجالے میں اگر وہ ان موذی کیڑوں مکوڑوں کو دیکھ لے تو چھلانگ لگا کر الگ ہو جائے اور مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگے۔ یہی حال غلامی کے انسانیت سوز ماحول کا تھا۔ زمانہ جاہلیت کی ظلمت میں اس رواج کی ہولناکیاں کسی کو نظر نہیں آتی تھیں مگر جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو اس رواج کے گھناؤنے خدو خال سے بے حسی کا پردہ ہٹ گیا اور اس کی تمام تر کراہت کھل کر سامنے آگئی۔ انسانوں کے ہاتھوں انسانیت کی تذلیل، اشرف المخلوقات پر اس کے اپنے بھائی بدوں کا جبر، اللہ کی برگزیدہ مخلوق پر غیر اللہ کی حاکمیت، یہ انسانی تاریخ کا وہ شرم ناک باب تھا جس کا ہر صفحہ لہولہان تھا، جس کی ہر سطر سے انسانیت کا خون رس رہا تھا۔

مرض کی تشخیص ہو گئی تو اس کا علاج بھی لازم ہو گیا۔ علاج بالضد بھی ہوتے ہیں بالمثل بھی۔ اللہ کے رسول نے مرض کی نوعیت کے پیش نظر، چند تحفظات کے ساتھ، علاج بالمثل تجویز فرمایا۔ ایک بین علاج جس سے مخالفین کو اُس کے خلاف متحد ہو کر صف آرا ہونے کا موقع نہ مل سکے اور مرض رفتہ رفتہ لیکن حتمی طور پر رفع ہو جائے۔ دوسری

صورت یعنی علاج بالضد میں بھی اصلاح احوال تو ہو جاتی اور شاید جلدی بھی ہو جاتی مگر دیرپا یقیناً نہ ہوتی۔ روزمرہ کی زندگی میں رچی بسی اس رسم کے خلاف محض ایک حکم امتناعی جاری کر دینے سے، اس رواج سے فائدہ اٹھانے والے بااثر طبقے میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا، ایک معاشرتی بحران پیدا ہو جاتا، اُن کے معمولات میں فرق آجاتا اور غلام آزاد ہونے کے بعد بھی ایک معتبور اور قابلِ نفرت اکائی بن کر رہ جاتے۔ ارباب اختیار کا غصہ انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک کم تر طبقہ بنا کر رکھ دیتا اور انہیں مکمل ذہنی آزادی دلانے اور اُن کی عام انسانوں کی سی فکری نشوونما کرنے کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو پاتا۔ یہ نوزائیدہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسم نہیں تھی کہ یکسر منسوخ کر دی جاتی اور اُس پر کوئی خاص لے دے بھی نہ ہوتی۔ اُس رسم کا تو کسی کے پاس کوئی معقول جواز تھا ہی نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں بھی بہت سے اہل درد اُسے بڑا سمجھتے تھے مگر اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے تھے کہ اُس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ غلامی کا معاملہ دوسرا تھا۔ یہ امر اور مراعات یافتہ طبقے کی عادت ہو گیا تھا۔ اُن کی ضرورت بنا ہوا تھا۔ اُن کے مرتبے اور حیثیت کا اعلان اور اُن کی تسکینِ نخوت کا ذریعہ تھا۔ اس کی اصلاح کے لئے ذہنوں کی اصلاح ضروری تھی۔ اس کے لئے سارے معاشرے کا فکری ارتقا لازم تھا۔ یہ لوگوں کے ضمیر جھنجھوڑنے کی بات تھی۔ اُن کے اندر ایک جوت جگانے کا جتن تھا، لہذا جو اقدامات یکے بعد دیگرے کئے گئے، اُن کے اثرات گو بدرتج مرتب ہوئے مگر انہیں دوام اور استقلال حاصل ہوا۔ ارشاد نبوی ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اُسے غلاموں کی آزادی سے زیادہ عزیز ہو۔

غلام کو آزاد کرنا ثواب قرار پایا تو لوگوں نے نہ صرف اپنے غلاموں کو آزاد کرنا شروع کر دیا بلکہ خرید خرید کر انہیں آزاد کرنے لگے۔ اُن سے حسن سلوک کا حکم ہوا تو اُن کے لئے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھرنے لگیں۔ وہ اسلامی مساوات کے رشتے میں بدوئے گئے تو عرب کے معزز قبیلوں سے اُن کی رشتہ داریاں اور قرابت داریاں استوار ہو گئیں۔ اُن کے

ساتھ جب انسانوں کا سا تعلق پیدا ہوا تو ان کا معاشرے کے معزز افراد میں شمار ہونے لگا۔ ان کی ذہنی تربیت اور نشوونما کی راہیں کھلیں تو انہوں نے اپنی علیت، اپنی شجاعت، اپنے تقویٰ اور اپنی قربانیوں سے اسلامی تاریخ کے دفتر بھر دئے۔ انہیں امامت سونپی گئی اور بڑے بڑے ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا گیا۔ انہیں اسلام کے عظیم معرکوں میں لشکروں کی قیادت عطا ہوئی۔ ان کی دلجوئی کے لئے حضورؐ نے ابو بکرؓ جیسی مقتدر ہستی کو وعید سنائی۔ ان کی قدر و منزلت کے اعلان کے لئے آیات قرآنی نازل ہوئیں اور پھر فتح بیت المقدس کے موقع پر چشم عالم نے یہ منظر بھی دیکھا کہ غلام اونٹ پر سوار ہے اور عمر فاروقؓ، فاتح قوم کے سب سے بڑے امیر اونٹ کی مہار تھامے پیدل شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔

## غلام

انسانیت اختیار کا نام ہے۔ فعل اور ترک فعل دونوں پر برابر قدرت رکھنے کو انسانیت کہتے ہیں۔ غلامی کے دور میں ہماری بے اختیاری نے ہمیں دائرہ انسانیت ہی سے خارج کر رکھا تھا۔ آزادی کے بعد، بلکہ کئی دن بعد جب آہستہ آہستہ ہمیں اس کا شعور حاصل ہونے لگا تو ہمارے محسوسات کچھ ایسے تھے جیسے ہم من مانیاں کرنے والے، قدرت کے لاڈلے، بچوں کے ہوئے بچے ہوں جو بغیر روک ٹوک کے جو چاہیں کرتے پھریں۔ ایک عجیب احساس تھا جیسے سر پر رکھا ہوا پہاڑ کسی نے اتار کر رکھ دیا ہو اور ہم ہوا کے جھونکوں کی طرح، فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے پرندوں کی طرح، آسمانوں پر تیرتے بادلوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی کائنات میں جدھر چاہیں جائیں، جو چاہیں کریں۔ کبھی خوف محسوس ہوتا تھا کہ کہیں ہم اپنی حدود سے تجاوز نہ کر جائیں۔ کبھی ایسا لگتا تھا کہ کہیں یہ سب کچھ ایک سمانا خواب نہ ہو جو صبح ہوتے ہی بکھر جائے۔ میرے ذہن میں اختیار کی پہلی کرن پھوٹنے پر میرے جو

محسوسات تھے، اُن کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کوئی بھی شخص جس نے خود غلامی کی بیڑیاں نہ پہنی ہوں، اُن محسوسات کا ادراک نہیں کر سکتا۔ میں خود بھی اگر چاہوں کہ آج اتنے عرصے کے بعد اُن کا اعادہ کروں تو شاید نہ کر سکوں۔ بس اتنا یاد ہے کہ اُس شعور کے بیدار ہوتے ہی اللہ کی ساری کائنات مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے لگی جیسے میں واقعی اُس کا حصہ ہوں، جیسے اُس میں کچھ میرا بھی حصہ ہے۔ ہر شے وہی تھی مگر نئی نئی لگتی تھی۔ مجھے پہلی بار لگا جیسے میں بھی انسان ہوں اور میری تخلیق کا شاید کوئی مقصد بھی ہے۔ مقصد کیا ہے؟ یہ جاننے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

یہ جن لوگوں کے نام میں رواروی میں لے رہا ہوں، کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اولین اشاعتِ اسلام کا ایک ایسا روشن منارہ ہے جس سے جاوہِ اسلام کا چہ چہ متور ہے۔ ان میں سے ہر ایک فضیلت و شرف کی رفعتوں پر لہراتا ہوا ایک دانگی پرچم ہے جس نے تاریخِ اسلام کے ہریاب پر سات رنگوں کی دھنک بھیر رکھی ہے۔

زید بن حارثہؓ، دعوتِ حق پر لبیک کہنے والے پہلے غلام اور پہلے ہی نوجوان، نودفعہ اسلامی لشکروں کے سپہ سالار بنا کر بچھے گئے۔ عائشہؓ نے ایک دفعہ کہا تھا جس فوج کشی میں زید شریک ہوتے تھے، اُس میں امارت کا عمدہ اُن ہی کو عطا ہوا تھا۔ موتہ کی مہم میں جہاں انہوں نے شہادت پائی، جعفر طیارؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ جیسے جلیل القدر صحابی اُن کے جلو میں تھے۔ رسول اللہؐ نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنایا۔ اُن کا خصوصاً شرف یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام میں وہ واحد شخص ہیں جن کا نام قرآن کریم میں آیا ہے۔ موتہ کی دوسری مہم کے لئے سرورِ کائنات نے اُن کے بیٹے اُسامہؓ کو صغریٰ کی باوجود ہمیشہ اسلامی کی امارت سونپی جبکہ عمرؓ جیسے اجل صحابی اُن کی فوج میں شامل تھے۔ عمر فاروقؓ نے خلافت کا عہدہ سنبھالا تو اُسامہؓ کا وظیفہ اپنے صاحبِ زاوے عبد اللہؓ سے زیادہ رکھا۔ عبد اللہؓ نے وجہ دریافت کی تو عمرؓ نے فرمایا:

”یہ اس لئے کہ رسول کریمؐ کو تجھ سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور اس کے والد انہیں تم سے والد سے زیادہ محبوب تھے۔“

غزوہٴ مریض کے موقع پر حضورؐ نے زیدؓ کو مدینے میں اپنی جانشینی کا شرف عطا۔ عامر بن فہیرہؓ نے ہجرت کے ہند خطر تاریخی سفر میں ان کے ساتھ رہ کر اُن کا وہ اعہاد حاصل کیا جو رہتی دنیا تک سب کے لئے باعثِ رشک رہے گا۔ اُن کی تربیت کا یہ عالم تھا کہ جب سانحہٴ یرموکہ میں جب ابنِ سلمیٰ کلابی کا نیزہ اُن کے سینے سے پار ہوا تو بے ساختہ منہ سے نکلا:

فَوَتُّ وَاللَّهِ،

یعنی خدا کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ جبار جو اس موقع پر اپنے آپ کو کامیاب سمجھ رہا تھا کچھ نہ کہہ پایا۔ یہ الفاظ اس جوشِ ایمانی اور جذبہٴ یقین کے ساتھ کہے گئے تھے کہ اُن کی گونج اُس وقت تک قاتل کے ذہن کے پردوں سے ٹکراتی رہی جب تک وہ سخاک بن سفیانؓ سے اُن الفاظ کا مفہوم جان کر مسلمان نہیں ہو گیا۔

شقران صالحؓ، عبد الرحمن بن عوفؓ کے غلام تھے۔ انہوں نے رسول کریمؐ کی نذر کر دیا تو حضورؐ نے انہیں آزاد فرمادیا مگر شقرانؓ اپنی خوشی سے حضورؐ کی خدمت پر مامور رہے۔ حضورؐ اُن کی خدمات سے اس قدر خوش تھے کہ وفات کے وقت بطورِ خاص اُن سے حسنِ سلوک کی وصیت فرمائی۔ رسولؐ کے اہل خانہ میں اُن کا مقام یہ تھا کہ خیر الانامؐ کی تجمیز و تمکین میں وہ گھر والوں کے ساتھ شامل رہے۔ جو چادر اُس وقت حضورؐ کے زینِ بدن تھی، شقرانؓ اُس کو حضورؐ کے جسدِ اطہر کی تدفین تک اپنے ہاتھوں میں تھامے رہے یہاں تک کہ روشنی غروب ہو گئی۔

رسول اللہؐ نے ایک بار فرمایا تھا:



آج کل سنا ہے عراق چلے گئے ہیں۔ اُن کے ساتھ گزرا ہوا وقت میری زندگی کا حسین سرمایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اُن کی راہوں میں خوشیاں بکھیرے رکھے!

بوفقیہہؒ میری طرح خاندانِ امیہ کے غلام تھے۔ یہ کوئلوں کے داغ جو میری پیٹھ پر آپ کو نظر آرہے ہیں، اُن کی پیٹھ پر بھی تھے۔ امیہ نے کوئی ستم مجھ پر ایسا نہیں ڈھایا جو اُس نے بوفقیہہؒ پر بھی نہ آزمایا ہو۔ اُن کو بھی بوجھڑنے اُس حال میں خرید کر آزاد کر لیا جب امیہ انہیں کوڑے مارا کہ مردہ سمجھ بیٹھا تھا۔ وہ دوسری ہجرتِ حبشہ میں شامل تھے لیکن سخت ترین مصائب جھیلنے کی وجہ سے اُن کے اعضا میں اضطلال پیدا ہو گیا تھا اور وہ غزوہٴ بدر سے پہلے ہی انتقال کر گئے مگر ہمیشہ کے لئے اپنی پامردی اور استقامت کی مثال چھوڑ گئے۔

سالمؓ، مولیٰ اہلِ حُدَیْفَہٴ قرأت اور صوت کے امام تھے۔ خوش الحانی کا یہ عالم تھا کہ خود زبانِ نبوت نے اُن پر فخر کیا۔ ایک دفعہ عائشہؓ صدیقہٴ آنحضرتؐ کے پاس آرہی تھیں کہ راہ میں رک گئیں۔ حضورؐ نے دیر سے آنے کا سبب دریافت فرمایا تو کہنے لگیں ایک شخص تلاوتِ قرآن کر رہا تھا میں اُس کو سننے لگی۔ حضورؐ کو بھی اشتیاق ہو اور ردائے مبارک شانوں پر ڈال کر باہر تشریف لے گئے۔ دیکھا تو سالمؓ قرأت کر رہے تھے، انہیں سُن کر حضورؐ نے ارشاد کیا:

”ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے میری امت میں تم جیسے لوگ پیدا کئے

ہیں۔“

اُن کی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے بھی لگائیے کہ ایک دفعہ عمر فاروقؓ نے اپنے چند ساتھیوں سے کہا کہ تم لوگ کسی چیز کی تمنا کرو۔

ایک نے کہا:

”میری تمنا ہے کہ یہ گھر سونے سے بھر اہو لور میں اُسے راہِ حق میں صدقہ کر

”لوگو! ابو بکر اور عمر کی اقتدا کرو اور عمار کی روش سیکھو۔“

ایک اور موقع پر انہوں نے ارشاد فرمایا تھا:

”اگر عمار کو دو باتوں کے درمیان اختیار دیا جائے تو وہ اسی بات کو اختیار کریں گے جو بہتر ہوگی۔“

میں نے عبد اللہ بن عباسؓ سے سنا ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیت عمارؓ ہی کی شان میں نازل ہوئی تھی کہ وہ شخص جو رات کو سجدے اور قیام کر کے عبادت کرتا ہے اور آخرت کے خوف سے اپنے رب سے رحمت کی امید رکھتا ہے، گناہ گاروں کے برابر نہیں ہو سکتا۔

عمارؓ نے بھی بڑی منزلت پائی۔ ابھی چند روز قبل میں نے سنا کہ انہیں کوئے کا والی مقرر کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر قدم پر اُن کی رہنمائی فرمائے۔

مسلمان فارسی جنہوں نے جنگِ احزاب میں خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا، رہتی دنیا تک اہلِ اسلام پر ایک تابدہ ستارے کی طرح جگمگاتے رہیں گے۔ اب تو کسی کو یاد بھی نہیں کہ کبھی وہ غلام بھی تھے۔ سارے صحابہ میں اُن کا بے حد احترام ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے ایک بار فرمایا تھا:

”جنت تین شخصوں کی مشاق ہے۔ علیؓ، عمار اور سلمان۔“

علیؓ نے ایک بار کہا تھا:

”سلمان ایسا سمندر ہیں جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔“

حضورؐ انہیں سلمان الخیر کہا کرتے تھے۔

معاذ اللہ جن جیل جیسے جید عالم نے ایک موقع پر اپنے ایک شاگرد سے کہا تھا:

”میرے بعد چار آدمیوں سے علم حاصل کرنا۔“

ان چار میں سلمانؓ کا بھی نام تھا۔ چند ماہ قبل تک تو سلمانؓ مدینے ہی میں تھے لیکن

”دوں“

دوسرے نے کہا:

”کاش! یہ گھر جو اہرات سے بھر جائے اوز میں انہیں اللہ کی راہ میں لٹا دوں۔“

پھر امیر المومنین نے پوچھا: ”کوئی اور تمنا، تو سب خاموش ہو گئے۔ اس پر عمر

نے کہا:

”میری تمنا ہے کہ یہ گھر ابو عبیدہ بن الجراح، معاذ بن جبل، حذیفہ بن

الیہان اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ جیسے بزرگوں سے بھر اہو۔“

امت مسلمہ میں سالم کے علم و فضل کی یہ پذیرائی تھی کہ وہ مسجد قبا کے پیش امام

تھے جہاں اجل صحابہ اکثر ان کے اقتدار میں نماز ادا کرتے تھے۔ ان میں ابو بکر اور عمر جیسی

ہستیاں بھی شامل تھیں۔

ثوبان بھی میری طرح ہمیشہ بارگاہ نبوی میں رہتے تھے۔ حضور ان کو اپنے اہل بیت

میں شمار کرتے تھے۔ آنحضرت کے وصال کے بعد وہ کچھ دن مدینے میں رہے، پھر شام چلے

آئے اور آج کل ہمیں رملہ کے علاقے میں رہتے ہیں۔ حضور کی نسبت سے ان کا اس قدر

احترام ہے کہ ایک دفعہ حمص میں بیمار پڑ گئے۔ وہاں کا گورنران کی عیادت کو نہ آیا تو اُسے

شکوے کا خط لکھ بھیجا۔ گورنران کی تحریر دیکھ کر لرز گیا اور جس حالت میں بیٹھا تھا اسی حالت

میں اٹھ کر ان کے گھر گیا اور دیر تک مزاج بُدی کر تارہا۔

دعوتِ توحید پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے بزرگوں میں جہاں ابو بکر اور عثمان

جیسے بزرگانِ قریش کے نام آتے ہیں، وہاں چند ایسے غلاموں کا بھی ذکر ہے جن کے اعمال و

اطوار ہمارا سرمایہ افتخار ہیں۔ صہیب بن سنان انہیں میں سے ایک ہیں۔ ان کے رومی لہجے کی

وجہ سے حضور ازرہ التفات فرمایا کرتے تھے:

”صہیب روم کا پھل ہے۔“

وہ تیر اندازی اور شمشیر زنی کے بہت بڑے ماہر مانے جاتے ہیں۔ سارے غزوات

میں حضور کے ہمراہ رہے۔ ایک دفعہ صہیب، سلمان اور میں کھڑے تھے کہ ابو سفیان کا

اُدھر سے گزر ہوا۔ یہ ان کے اسلام لانے سے پہلے کی بات ہے ہمارے منہ سے بے ساختہ

نکلا:

”اللہ کی تلوار نے پتا نہیں کیوں اب تک اس دشمن دین کی گردن نہیں اڑائی۔“

ابو بکر بھی اُدھر سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ہماری بات سن کر کہا:

”تم لوگ قریش کے بزرگوں کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو۔“

یہ کہہ کر وہ حضور کے پاس گئے اور انہیں سارا ماجرا سنایا۔ حضور نے فرمایا:

”ابو بکر، تم نے شاید انہیں خفا کر دیا ہے اور اگر یہ سچ ہے تو تم نے اپنے اللہ کو ناراض

کر دیا۔“

یہ سن کر ابو بکر اُلٹے پاؤں ہمارے پاس آئے اور جب تک ہم نے یہ نہیں کہہ دیا کہ

ہم ناراض نہیں ہوئے، واپس نہیں گئے۔ یہی وہ وعید تھی جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

ایسے ہی ایک مرتبہ مدینے میں، میں، سلمان، صہیب، عمار اور خباب بن ارت

رسول کریم کے پاس بیٹھے تھے کہ الاقرع بن حابس التیمی اور عینہ بن حصن الغزالی اپنے وفود

کی آمد کی اطلاع لے کر حاضر ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر وہ حقارت سے پیچھے ہٹ گئے اور حضور

سے کہنے لگے ہم اس بات میں شرم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ آنے والے عرب

شرقا آپ کو ان غلاموں کے ساتھ بیٹھا دیکھیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جب ہمارے وفود یہاں

پہنچیں تو یہ لوگ آپ کے پاس نہ ہوں۔ ہم لوگ یہ سن کر فوراً وہاں سے اُٹھ کر کچھ فاصلے پر جا

بیٹھے۔ اسی وقت سورۃ انعام کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

آئی تھی۔ حضورؐ سے ملنے کے لئے کلثوم بن ہدمؓ کے مکان پر پہنچے تو کھجوروں کا نقل ہو رہا تھا۔ صہیبؓ کئی دن کے فاقے سے تھے، بھوک کی شدت سے بیتاب تو تھے ہی، جلدی جلدی کھجوریں کھانی شروع کر دیں۔ حضورؐ ان سے بہت التفات فرماتے تھے۔ انہوں نے دیکھا تو ازراہ تلمظ فرمایا:

”صہیب، تمہاری آنکھ آئی ہوئی ہے اور تم کھجوروں پر کھجوریں کھائے چلے جا رہے

ہو۔“

صہیبؓ نے جن کی جس مزاح بہت تیز تھی، ہر ملا جواب دیا:

”حضورؐ میں اُس آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں جو ٹھیک ہے۔“

اس حاضر جوابی پر حضورؐ بے ساختہ ہنس پڑے۔

ان کی باتیں چھڑ گئی ہیں تو اس وقت وہ بہت یاد آرہے ہیں کیا باغ و بہار شخصیت پائی، ہے۔ خدا انہیں ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ان سے آخری ملاقات مدینے میں ہوئی تھی، جب میں حضورؐ کے روضے پر حاضری دینے گیا تھا۔

ابورافعؓ، جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، عباسؓ کے غلام تھے، انہوں نے رسالت مآبؐ کی خدمت میں پیش کر دیا تو حضورؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔ آزادی کے بعد بھی انہوں نے میری طرح اپنی زندگی کا بہترین مصرف یہی سمجھا کہ خود کو سرورِ عالم کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ حضورؐ نے ان سے اتنا پیار کیا، اتنی فضیلت عطا کی کہ انہیں اپنے خاندان کا فرد بنا لیا۔ آج بھی جس کا جی چاہے مدینے جا کر دیکھ لے کہ ایک سابق غلام کا کیا احترام ہے۔ کیسے لوگ ان کی راہوں میں آنکھیں پھنسا رہے ہیں۔

میں خود آپ کے سامنے ہوں۔ ہجرت مدینہ کے کچھ عرصہ بعد میں نے اپنا گھر بسانا چاہا مگر حالت میری یہ تھی کہ شادی کی مطلق استطاعت نہیں تھی۔ نہ زمین، نہ مکان،

”ان لوگوں کو نہ نکالنے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں، محض اُس کی رضا کے لئے۔“

آپ کے ذمے ان کا ذرا بھی حساب نہیں اور نہ ان کے ذمے آپ کا ذرا بھی حساب ہے جس سے آپ انہیں نکالنے لگیں

اور آپ کا شمار بے انصافوں میں ہو جائے۔“

اس کے بعد حضورؐ نے ہم پر سلامتی بھیجی اور ہمیں بلا کر پھر پاس بٹھالیا۔ اتنے قریب کہ ہمارے گھٹنے ان کے گھٹنوں کو چھونے لگے۔ خاصی دیر پاس بٹھائے رکھنے کے بعد وہ اٹھ کر جانے لگے تو جبریل امین دوبارہ حاضر ہوئے اور سورہ کف کی آیت نازل ہوئی۔

”آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ متعذر رکھائیے

جو اپنے پروردگار کو محض اُس کی رضا جوئی کے لئے پکارتے ہیں۔“

اور دنیاوی زندگی کی رونق کے خیال سے اپنی آنکھوں کو ان پر سے نہ ہٹائیے۔ اور اُس کا کلمہ ماننے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔ وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔

اُس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔

اور آپ کہہ دیجئے کہ حق پروردگار کی طرف سے آپ کا ہے۔

جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔“

اس کے بعد ہم حضورؐ کی ہدایت پر ہمیشہ ان کے بالکل قریب ہو کر بیٹھنے لگے۔

صہیبؓ مکے سے ہجرت کرنے والوں میں آخری مرد تھے جو علیؓ کے ساتھ آئے۔

سخت گرمیوں کے طویل سفر کی صعوبتیں سستے سستے جب وہ قبا پہنچے تو ان کی ایک آنکھ آشوب کر

رہا تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ میں نے سنا ہے، ابھی چند روز ہوئے کوفے کے قاضی مقرر ہو گئے ہیں۔ یہ اُن کے فخر علمی کا اعتراف ہے اور اس بات کا بھی کہ اسلام میں فضیلت کا معیار تقویٰ اور محض تقویٰ ہے۔ نہ نسل برتری، نہ خاندانی شرف۔

شام کے معرکوں میں ایک موقع پر عمر فاروقؓ اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ بیٹھے تھے اور چند اہم فوجی معاملات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں بھی موجود تھا۔ میرے ذہن پر کچھ بوجھ تھا۔ میں نے انہیں پکار کر کہا:

”یا امیر المومنین! یہ لوگ جو آپ کے دائیں بائیں بیٹھے ہیں، واللہ یہ

لوگ عیش پرستی میں پڑ گئے ہیں۔ یہ پرندوں کا گوشت کھاتے ہیں جبکہ

عام مسلمانوں کو دو وقت کا کھانا بھی تیسر نہیں“

عمرؓ نے میری آواز سنی تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔ قیس بن اہلی عازمؓ میرے سامنے کھڑے تھے۔ خلیفہ المومنین کو مجھ سے مخاطب ہوتے دیکھا تو سامنے سے ہٹ گئے۔ امیر المومنین فرمانے لگے:

”یللال، بیٹک آپ سچ کہتے ہیں۔ میں اُس وقت تک یہاں سے نہیں

اٹھوں گا جب تک ہر مسلمان کے لئے مٹھی بھر جو، سرکہ اور زیتون

کے تیل کا بندوبست نہیں ہو جاتا“

اُن کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی اطراف میں بیٹھے ہوئے اُمرانے اس کفالت کو قبول کر لیا۔ کس نے دی تھی ایک غلام زاوے کو یہ جرأت کہ وہ بھرے دربار میں یوں امیر المومنین سے مخاطب ہو۔ کس نے دیا تھا حاکم وقت کو یہ حوصلہ کہ وہ اُس کا اعتراض اس خندہ پیشانی سے سنے۔

نہ مال و دولت، نہ آمدنی کا کوئی مستقل وسیلہ۔ میرا حسن ظاہری تو آپ کے سامنے ہے۔ سیاہ قام رنگت، موٹے موٹے ہونٹ، لاغر بدن، عمر بھی چالیس سال سے بڑھ چکی تھی لیکن جوں ہی میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو مجھ جیسی زادے کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تمام مہاجرین اور انصار نے جو شرفائے عرب کی جان تھے، اپنے دیدہ و دل میرے لئے فرش راہ کر دئے، یہاں تک کہ میرے لئے رشتے کا انتخاب کرنا مشکل ہو گیا۔ رنگ و نسل اور حسب نسب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عرب معاشرے میں یہ ایک عظیم انقلاب تھا جس کا چند برس پہلے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

رسول کریمؐ کے وصال کے بعد ہمیں اُن کے بغیر مدینے کے گلی کوچے سونے لگے لگے تو میں نے اور عبداللہ بن مسعودؓ نے کہیں اور جانسنے کی باتیں شروع کر دیں۔ ابن مسعودؓ بھی گزشتہ دس سال سے حضورؐ کی خدمت میں تھے اور مجھے اپنے مواخاتی بھائی ابو رویحہؓ کی طرح عزیز تھے۔ وہ تو کہیں نہیں گئے، وہیں مدینے ہی میں عزت نشیں ہو گئے، مگر میں نے سوچا کہ اسلام میں جہاد کا بواؤ اب ہے کیوں نہ باقی زندگی اسی کار خیر میں گزار دی جائے، چنانچہ میں خلیفہ وقت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے جہاد پر جانے کی رخصت طلب کی۔ میرے اور ابو بکرؓ کے تعلق کا تو آپ کو علم ہے، میں تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ اس تعلق کے تناظر میں میری بات پر ذرا غور کیجئے گا اور یہ بھی یاد رکھئے گا کہ وہ خلیفہ وقت تھے۔ تمام اسلامیان عالم کے سربراہ! انہوں نے جو مجھ پر ہزار حق جتا سکتے تھے، محض اپنی ضعیفی کا واسطہ دے کر مجھے روکا۔ کہنے لگے بلال، مجھے اس عمر میں تمہاری رفاقت کی ضرورت ہے۔ نہ اپنے جلیل القدر منصب کا استعمال فرمایا، نہ اپنا کوئی ذاتی احسان جتایا۔ یہ تھا محمدؐ کی تعلیم کا اثر کہ سلطنت اسلامیہ کا سب سے مقتدر شخص، ایک ادنیٰ غلام کو اپنی رائے رکھنے کا مکمل حق دے رہا تھا۔ اپنی بات منوانے کے لئے اسے برابر کا درجہ دیتے ہوئے منت سماجت کا لہجہ اختیار کر

میں سب کے ساتھ یوں شانہ بہ شانہ چلنا، سماجی ماحول میں مکمل مساوات کے ساتھ رچ بس جانا، غلاموں کے بارے میں اسلام کی حکمتِ عملی کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ راہ کٹھن تھی مگر حضورؐ کی تربیت نے ایسی مشعلیں روشن کر دیں کہ آسان ہو گئی۔ اسلام کے پرچم تلے جمع ہونے والے مجھ ایسے مسکینوں، غلاموں کو ہمارے دشمن اکثر طنز آہنا کرتے تھے:

”یہ ہیں وہ ہستیاں جنہیں عرب و عجم کی حکمرانی سوچی جائے گی؟ یہ لوگ نہیں گے

مصر و روم کے سردار؟“

ہزار طرح کی جاہلانہ عصیانیں ابھاری جاتی تھیں مگر ایمان والوں کے قول و فعل سے ریت کے یہ گھر و ندے اپنے آپ گرتے گئے۔ کسی نے ان کی باتوں کا اثر نہیں قبول کیا۔ زیر دستوں پر اسلام کے نظامِ عدل و احسان کے فیوض و برکات کا سایہ بدستور قائم رہا اور ہمارے بد خواہوں نے اپنے استہزاء کا جواب خود تاریخ کی زبان سے سن لیا۔

یہ باتیں جو میں کر رہا ہوں کوئی قصہ پارینہ نہیں، دورِ حاضر کی جیتی جاگتی کہانی ہے۔ عصرِ رواں کی ایک زندہ روایت ہے۔ میں دمشق کے نکتہ دانوں ہی کو نہیں، کل اہلِ نظر کو غلامانِ اسلام کی زندگیوں کا بغور مطالعہ کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ خود دیکھیں کہ اسلامی معاشرے نے سابق غلاموں کو کس طرح پروان چڑھایا، ان کی کشتِ فکر کی کس طرح آبیاری کی، ان کی شخصیتوں کو کیسی جلا بخشی، کس طرح ان کی ذہنی نشوونما کی اور کس کس انداز سے اپنی محبت، اپنا خلوص اور اپنا اعتماد ان پر بچھا اور کیا۔ ہر شخص خود اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ سابقہ غلاموں کی زندگی میں کوئی ایک لمحہ، کوئی ایک چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی ایسا دکھائی دیتا ہے جہاں ان سے کسی قسم کا کوئی تعصب برتا گیا ہو، کوئی خصوصی برتاؤ، کوئی سلوک جو مساواتِ محمدی کے اصولوں کے منافی محسوس ہو! جس نے اپنے آپ کو جس شرف کا اہل ثابت کر دیا، وہ اُسے عطا ہو گیا اور بالکل ایسے جیسے کسی برادر والے کو اُس کا حق دیا جاتا ہے۔ ایسے نہیں کہ اُس میں کسی لطفِ خاص یا شش بے جا کا شائبہ ہو، جس سے ان کی توقیر میں ان کی تذلیل کا پہلو نکلتا ہو۔ یہ بھی نہیں ہو کہ ان کا جائز مقام دینے میں کوئی حیل و حجت ہوئی ہو یا کسی قسم کا کوئی ذہنی تحفظ برتا گیا ہو۔

دوسرے معاشروں میں بھی آقا خوش ہو کر غلاموں کو انعام و اکرام سے نوازتے رہتے ہیں مگر ہزار عنایات کے باوجود غلاموں کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا جاتا کہ وہ ان کے برابر ہو گئے ہیں۔ اسلام کی صورتِ حال یہ ہے کہ ہم غلاموں میں سے کوئی اگر عادتاً بھی خود کو کم تر بنا کر پیش کر تا تو اسے ہر طریقے سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی کہ اُس میں اور دیگر انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کوشش اُس وقت تک جاری رہتی جب تک کہ ہم واقعی اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر اپنے طرزِ عمل سے اس کا ثبوت نہ مہیا کر دیتے اور سب کو یقین نہ ہو جاتا۔ معاشرتی دھارے میں ہم غلاموں کا اس طرح گھل مل جانا، زندگی کے سفر

## میں رہن رکھا گیا

غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو بدر سے لے کر تبوک تک مجھے ان کی ہمرکابی کا شرف حاصل رہا۔ عیدین اور استقا کے موقعوں پر میں نیزہ لے کر ان کے آگے آگے چلتا۔ میں ان کے گھر کا مدار الہام تھا۔ سو اسلف لانا، ان کے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا میری ذمہ داری تھی۔ کئی بار گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا اور نہ کوئی ایسی چیز جس کو بیچ کر یا گروی رکھ کر خورد و نوش کا سامان لایا جاسکے۔ ایسے موقعوں پر وہ فاقے رہتے اور ان کے ساتھ میں بھی فاقہ کرتا۔

مدینے میں وفود کی آمد کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی وفد کی آمد ہوتی۔ بعض وفود بہت اہم ہوتے تھے۔ ان سب کی خاطر مدارات اور مہمان داری میں مجھے عام حالات سے زیادہ تنگ و دو کرنی پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ آج سے کوئی دس سال پہلے نجران سے ایک وفد رسول کریمؐ سے چند اہم امور پر بات چیت کے لئے آیا تو آپ نے مجھے ان کے

”پتا ہے کتنے دن رہ گئے ہیں ایک مہینے میں، صرف چار راتیں باقی ہیں۔ چار راتیں! پھر میں تجھ سے وہ حاصل کروں گا جو میرا تیری طرف نکلتا ہے اور کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ میں کوئی لحاظ مروت نہیں کروں گا۔ نہ تجھ سے نہ تیرے صاحب سے۔ میں نے تجھے قرض دیا ہی اس لئے تھا کہ تو چکانہ سکے اور غلام بن جائے جیسا تو پہلے تھا۔ پھر میں تجھ سے اپنی بھیر بھریاں چرواؤں گا۔ یاد رکھنا بلال، مجھ سے کسی رو رعایت کی توقع نہ رکھنا۔“

یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا مگر میں بہت زیادہ فکر مند ہو گیا۔ رسول کریم اور صحابہ کرام کے ساتھ رہتے رہتے مجھے اس قسم کی بد اخلاقی اور بد تمیزی کی باتیں سننے کی عادت نہیں رہی تھی۔ طبیعت پر بہت بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر میں نے اذان دی۔ دو نفل ادا کئے اور سوچنے لگا کہ حضور کو کن الفاظ میں اپنی مصیبت کا حال سناؤں۔

عشا کی نماز کے بعد جب رسول اللہ گھر جانے لگے تو میں نے ان سے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ میں نے ان سے یہ بھی درخواست کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں راتوں رات مدینے سے باہر چلا جاؤں اور صحرا میں روپوش ہو جاؤں۔ انہوں نے ہنستی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہا:

”تم جاؤ اور سو جاؤ، کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔“

سونے کو تو میں سو گیا مگر نیند میں بھی پریشانی رہی۔ دوسری رات پھر میں نے ان سے وہی درخواست کی۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے وہی جواب دیا۔ تیسری رات بھی یہی ہوا۔ اب صرف ایک دن باقی تھا اور ایک رات۔ رقم کا حال مجھ سے زیادہ کون جانتا تھا۔ کہیں سے فوری کچھ آنے کی توقع نہیں تھی۔ دن تو جوں توں کام کاج میں گزر گیا مگر شام ہوتے ہوتے

کھانے پینے کا انتظام کرنے کا حکم دیا۔ حکم مل چکا تھا، تعمیل لازم تھی۔ گھر میں رقم کا ہونا یا نہ ہونا سرور عالم کے لئے کوئی قابلِ اعتنا مسئلہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان چیزوں سے وہ کوئی سروکار رکھتے تھے جو روپے پیسے سے خریدی جاتی ہیں۔ یہ میرا کام تھا۔ اس وقت گھر کی مالی صورت یہ تھی کہ کوئی چیز ایسی موجود نہیں تھی جن سے مہمانوں کی تواضع ہو سکے اور نہ ہی کوئی رقم، کہ بازار سے کچھ لے آتا۔ گھر کا جو جو سامان گروی رکھا جاسکتا تھا پہلے ہی سے مدینے کے مشہور مشرک تاجر لیبہہ کے پاس رہن تھا۔ لیبہہ نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ بلال تمہیں جب قرض کی ضرورت ہو مجھ سے لے لیا کرو۔ چنانچہ میں اسی کے پاس چیزیں رہن رکھ کر حسبِ ضرورت قرض لیتا رہتا تھا۔ اس وقت مشکل یہ آن پڑھی تھی کہ رہن رکھنے کو کچھ نہ تھا۔ خیر، میں ہمت کر کے اس کے پاس گیا اور اس سے ادھار کی درخواست کی مگر اس نے ضمانت کے بغیر قرض دینے سے صاف انکار کر دیا۔ منت سماجت کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ میرے اپنے پاس کیا تھا جو میں ضمانت کے طور پر پیش کرتا۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے س گروی رکھ دیا اور سودا سلف خرید لایا۔ شرط یہ طے ہوئی کہ اگر ایک ماہ کے اندر رقم واپس نہ ہوئی تو میری ذات پر اس کا حق ہوگا۔

مہمانوں کی دعوت ہو گئی۔ میرے انتظامات کو سراہا گیا اور شکر ہے وقت ٹل گیا مگر ساتھ ہی مجھے اپنی فکر لگی ہوئی تھی۔ دن یونہی ایک ایک کر کے گزرتے گئے۔ کہیں سے قرض چکانے کا بندوبست ہو تا نظر نہیں آتا تھا۔ میں اندر ہی اندر سخت پریشان تھا مگر حضور سے ذکر نہیں کیا تھا۔ ایک دن میں عشا کی اذان کے لئے وضو کر رہا تھا کہ لیبہہ اپنے چند دوستوں سمیت ادھر سے گزر اور اس نے نہایت درشت، حقارت آمیز لہجے میں مجھے پکارا:

”ارے او حبشی!“

میں نے اس بد کلامی کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگا:

نے اللہ اکبر کہا اور فرمانے لگے :

”کچھ باقی بھی چاہے۔؟“

میں نے کہا :

”دودینار“

فرمایا :

”انہیں بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔“

یہ واقعہ میں نے ابھی چند روز قبل حلب میں عبد اللہ الہوریٰ کو بھی سنایا تھا۔ وہ مجھ سے حضورؐ کے ’انفاق‘ کے کچھ واقعات پوچھنے آئے تھے۔

اپنی ناداری کے باوجود جہاں کہیں سے جو کچھ مجھے میسر آجاتا اُس کا ایک حصہ میں ضرور مُخمس عالم کے لئے چاکر رکھتا تھا۔ ایک دفعہ وہ انسؓ سے عجیب گفتگو تھی۔ اسلام کے اولین دنوں میں کھار کے مظالم کا ذکر ہو رہا تھا۔ فرمانے لگے :

”ایک موقع پر تیس راتیں اور تیس دن مجھ پر ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلال کے پاس کھانے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے کوئی جاندار کھا سکے، سوائے اُس کے جو بلال کہیں نہ کہیں سے لا کر رکھ ڈھک چھوڑتا تھا۔“

ایک مرتبہ میں نے کچھ برنی کھجوریں اُن کی خدمت میں پیش کیں۔ یہ کھجوروں کی ایک نہایت خوش ذائقہ قسم ہے جو عام طور پر نہیں ملتی۔ انہوں نے دیکھا تو حیرت سے کہنے لگے :

”بلال یہ کہاں سے؟“

میں نے عرض کیا :

”میرے پاس دو صاع عام کھجوریں تھیں، اُن کے عوض کسی سے یہ

میری حالت خاصی دگرگوں ہو گئی۔ مغرب کے بعد دُعا مانگی، عشا کے بعد دُعا مانگی اور پھر اپنی فکر میں ڈوب گیا۔ حضورؐ سے بھی ہر روز ایک ہی بات کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ عشا کے بعد وہ کچھ دیر مسجد میں ٹھہرے اور جاتے جاتے جیسے انہوں نے میرے چہرے سے میرا سوال پڑھ لیا۔ کہنے لگے : ”جاؤ بلال آرام کرو۔“

اُن کے حکم کے مطابق میں آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا مگر نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ کیا واقعی آج کی رات میری آزادی کی آخری رات تھی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو اپنی غلامی کے دور میں محسوس کیا۔ اب میرا آقا لیبہ تھا۔ وہی ظلم، وہی تشدد، وہی میری کس مہر سی۔ پھر خیال آتا کہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو اگر یہ منظور ہوتا تو مجھے آزادی عطا ہی کیوں کرتا۔ اسی ادھیڑ بن میں رات گزر گئی۔ علی الصبح بلکہ اس سے بھی پہلے ابھی رات کا آخری پہر ہی تھا کہ ایک آدمی نے مجھے آواز دے کر باہر بلایا۔ یہ آدمی حاکم فدک کی طرف سے رسول کریمؐ کے لئے تحائف لے کر آیا تھا جو چار اونٹوں پر لدے ہوئے تھے۔ تحائف میں کپڑا اور اجناس کے علاوہ کچھ رقم بھی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے حضورؐ کو بے وقت ہی جگا کر انہیں اطلاع دے دی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا :

”الحمد للہ، لیبہ کی رقم ادا کر دو اور کچھ زیادہ بھی دے دینا کیونکہ اُس نے

بہت انتظار کیا ہے۔“

اونٹوں سے سامان اتارتے اتارتے اذان کا وقت ہو گیا۔ فجر کی نماز کے بعد میں بیع کی سمت نکل گیا اور زور زور سے اعلان کیا کہ جس جس کو حضورؐ سے کوئی قرض وصول کرنا ہو وہ لے جائے۔ ایک ایک قرض خواہ کی ایک ایک پائی چکانے کے بعد میں رسول کریمؐ کے پاس گیا۔ وہ مسجد میں محرابِ نبویؐ کے پاس ابو بکرؓ سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے تمام قرض چکا دئے ہیں اور اب کسی کا کچھ واجب الادا نہیں ہے۔ حضورؐ



ایک صاعہ کھجوریں لی ہیں، آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے۔“

نہن کر فرمانے لگے:

”ارے بلال تم نے تو غضب کر دیا۔ یہ تو ریا ہو گیا۔ تمہیں چاہئے تھا کہ پہلے تم اپنی کھجوروں کو پختے، پھر ان کی قیمت سے یہ خریدتے۔“

کتنا سیدھا سچا طریقہ تھا ان کا تعلیم دینے کا، بات سمجھانے کا۔ ایک ایک لفظ دل میں گھر کر جاتا تھا اور طبیعت پر کوئی بوجھ نہیں محسوس ہوتا تھا۔

ایسے ہی ایک بار حضور میرے پاس میرے حجرے میں تشریف لائے تو دیکھا کہ میرے پاس کھجوروں کا ڈھیر رکھا ہے۔ فرمانے لگے:

”بلال یہ کیا؟“

میں نے عرض کیا:

”سہمان داری کے لئے جمع کی ہیں۔“

کہنے لگے:

”بلال تمہیں جہنم کی آگ سے ڈر نہیں لگتا۔ جاؤ انہیں اللہ کی راہ میں خیرات کرو اور یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ تمہارے پاس کوئی کمی ہو جائے گی۔“

خیرات کرو اور یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ تمہارے پاس کوئی کمی ہو جائے گی۔“

حضور کے خاندان کے علاوہ غریب الدیار نو مسلموں کے کھانے پینے کا بے دست بھی میرے ذمے تھا۔ ان لوگوں کے لئے مسجد نبوی کے ایک حصے میں ایک چوڑا بنا دیا گیا تھا۔ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا اور یہ دیگر اہل ایمان کے عطیات، خیرات اور صدقات پر گزار کرتے تھے۔ یہ لوگ اہل صفحہ کھلاتے تھے اور اکثر لوقات قاتوں سے دوچار رہتے تھے۔

ایسے موقعوں پر حضور خود بھی ان کے ساتھ فاتحہ فرماتے تھے۔ دراصل اصحاب صفحہ کی کفالت سارے مسلمانوں کے ذمے تھی مگر رسالت مآب انہیں اپنے اہل خاندان جیسا ہی سمجھتے تھے اور ہر ممکن طور پر ان کی دیکھ بھال فرماتے تھے۔ ان کو اپنے گھر سے کھانا کپڑا وغیرہ بھجواتے رہتے تھے۔ مال غنیمت میں بھی ان کا باقاعدہ حصہ رکھتے تھے۔ حضور نے میرے علاوہ فاطمہ کو بھی ان کی خبر گیری پر مامور کیا ہوا تھا۔ ہم ہر روز حضور کو ان کے مسائل اور مشکلات سے آگاہ کرتے اور حتی الوسع ان کی خدمت انجام دیتے رہتے۔ فاطمہ کے عقد کے بعد اس ذمے داری میں میرے ساتھ ام ایمن اور ام کلثوم پیش پیش تھیں۔ ان کے علاوہ ام سلمہ اور ان کے بیٹے انس، ابو طلحہ، ابن مسعود، ابو رافع اور عثمان بن مظعون کی بیوہ خولہ بھی اس کام میں ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔

رسول کریم کو اہل صفحہ کا اتنا خیال تھا کہ ایک مرتبہ جب فاطمہ نے روز کی محنت

مشقت سے تنگ آکر ان سے ایک غلام کا سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

”یہ ممکن نہیں۔ میں آج کل اصحاب صفحہ کے کھانے پینے کے سلسلے میں فکر مند

ہوں۔ میں کچھ کر سکتا تو پہلے ان کی مدد کرتا۔ تم رات کو سوتے وقت، سبحان اللہ،

الحمد للہ، اللہ اکبر کی تسبیح پڑھا کرو۔ پریشانی ختم ہو جائے گی۔“

فاطمہ جو اہل صفحہ کی فاتحہ کشی اور مقلوک الخالی سے خود بھی واقف تھیں، خاموش

ہو رہیں۔

حضور کے گھر کا پانی بھرتا بھی میرا کام تھا کبھی کبھار کھانا پکانے میں بھی مدد دے دیا کرتا تھا۔ اور آتا تو اکثر میں ہی گوندھا کرتا تھا۔ حضور خود بھی کبھی کبھی آنا گوندھ دیا کرتے تھے۔ بلکہ وہ اکثر اہمات المؤمنین کے ساتھ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ اللہ کے رسول کے گھر کا کوئی چھوٹا کام ایسا نہیں تھا جس کے کرنے کی سعادت مستقلاً

یا کسی نہ کسی وقت اس غلام کے حصے میں نہ آئی ہو۔ ان ذمے دار یوں سے عمدہ براہونے میں مجھ سے بہت سی کوتاہیاں بھی ہوئی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے!

میں بلال سیدہ فام، غلام ابن غلام، نبی عالی مقام کا مدارالمہام، ان کا بے دام غلام، ان کا معتمد خاص، داروغہ مطہح، بلورچی، ہر کارہ، سقہ، چوب دار، چوکیدار، عصا بردار، پیش کار، مہماندار، ذاتی خدمت گزار، معلن، خازن، ہر صبح ان کو نماز کے لئے بیدار کرنے والا اور ان کا مؤذن خاص تھا۔ مؤذن کی حیثیت سے میں ہر وقت خانہ خدا میں رہتا تھا اور خادم رسول کی حیثیت سے ہر وقت نبی رحمت کے قدموں میں۔ کیا وظیفہ تھا میرا، اللہ کا گھر اور محمد کی چوکھٹ۔

## اشاعتِ اسلام

میں نے دمشق میں کچھ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ کیسی حماقت کی بات ہے! وہ لوگ یہ چھوٹا سا نکتہ نہیں سمجھتے کہ دین فصل کاٹنے کا نہیں، فصل بونے کا نام ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ فصل کاٹتا ہے۔ اُس سے ڈرنا چاہئے۔ ایسی غیر سنجیدہ، سطحی باتیں ذہنی عیاشی کے دائرے میں تو آجاتی ہیں لیکن منصفانہ، ذمہ دارانہ سوچ کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔

مجھ جیسے لوگوں کو جنہوں نے اسلام کو ایک بیج سے تناور درخت بنتے ہوئے دیکھا ہے، ایسی باتیں بڑی چمکانہ محسوس ہوتی ہیں۔ کہاں ہماری تربیت کی احتیاطیں کہ زبان کٹ جائے جو ایک لفظ بھی ادھر کا ادھر ہو جائے۔ لفظ تو لفظ لہجہ بھی غلط ہو جائے تو گرفت میں آ جائے اور کہاں یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کہ جو جی میں آیا بغیر سوچے، بغیر سمجھے، بغیر تصدیق کئے کہہ ڈالا۔

تصدیق کر لے۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ مسلمان اپنے ہر قول و فعل کے لئے صرف اور صرف اپنے اللہ کو جواب دہ ہے اور وہ کسی صورت میں بھی اللہ کی گرفت میں نہیں آنا چاہتا۔ میرے دمشق کے دوستوں پر کبھی ایسی ذمے داری پڑی ہی نہیں۔ اُن پر تحقیق و تصدیق کے دور گزرے ہی نہیں۔ اس لئے مجھے اُن کی باتوں پر غصہ نہیں، ترس آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نبی نوع انسان کو اُس کی فکری سطحیت کے شر سے محفوظ رکھے۔

میں جب اُن سے پوچھتا ہوں کہ کوئی ایک فرد، ایک شہر، ایک قبیلہ مثال کے طور پر پیش کریں جسے اسلام لانے پر مجبور کیا گیا ہو تو اس کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ انہیں غالباً یہ علم بھی نہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی کو زبردستی اسلام لانے پر مجبور کرے تو وہ شاید نہیں، حتیٰ طور پر دوزخ میں جائے گا۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کا انتباہ مختصر، مگر دو ٹوک ہے:

لا اکراه فی الدین

یعنی دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ کوئی تلوار، کوئی دھمکی، کوئی دھونس، کوئی لالچ، کوئی دباؤ، کوئی رشوت انسان کو اہل ایمان نہیں بنا سکتی۔ اس فیصلے کا توبعدہ مجاز ہی نہیں ہے۔ یہ ذاتِ وحدہ لا شریک ہے جو طے کرتی ہے کہ کسے ایمان لانے کی توفیق دی جائے گی۔ سورہ بونس میں اللہ تعالیٰ تمام انسانوں سے، دمشق کے دانشوروں سمیت، یہ سوال پوچھتا ہے:

اگر آپ کا پروردگار چاہتا

تو روئے زمین پر جتنے بھی لوگ ہیں

سب کے سب ایمان لے آتے،

سو کیا آپ لوگوں پر جبر کر سکتے ہیں

جس سے وہ ایمان لے آئیں۔

در اصل ہماری تربیت میں احتیاط کا عنصر ہمارے دین کا صدقہ ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ کلمات اللہ کے رسول کے ہیں۔ یہ بات اللہ کے رسول نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت کی ہے۔ یہ قول اُن کی اپنی ذاتی حیثیت میں ہے، یہ فرض ہے، یہ واجب ہے، یہ حرام ہے، یہ سنت ہے، یہ مستحب ہے، یہ مباح ہے، یہ مکروہ ہے۔ کس قدر التزام سے ہمیں ان کے فرق سمجھائے جاتے تھے۔ کلامِ الہی کے بیان کرنے کے، پڑھنے کے، سننے کے اور اُن پر عمل کرنے کے آداب الگ بتائے جاتے تھے اور رسول کریم کے الفاظ کو کلامِ الہی سے واضح طور پر الگ کر کے اُن پر عمل کرنے اور اُن کی اشاعت کرنے کے آداب الگ سکھائے جاتے تھے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے الفاظ کی توجیہ اپنے نبی کی زبان سے سنتے اور اُن کے عمل میں دیکھتے۔ اُن کا بغور مطالعہ کرتے اور جو دیکھتے، سنتے اُسے ذہنوں میں محفوظ کر لیتے اور اسی طرح حرف بہ حرف لوگوں کو منتقل کر دیتے۔ ہمیں نہ صرف اُن پر غور و فکر کی اجازت تھی بلکہ حکم تھا۔ لیکن کسی قسم کی رائے زنی اور حاشیہ آرائی گناہِ عظیم کے زمرے میں آتی تھی اور ہم سب کو اپنی عاقبت عزیز تھی۔

رسول کریم کے اپنے ارشادات کی وضاحت کبھی تو اُس سیاق و سباق ہی سے ہو جاتی جن میں وہ الفاظ کہے جاتے، کبھی ہم سب بیٹھ کر اُس پر فکر کرتے اور جب تک اپنے اخذ کئے ہوئے نتیجے کی تصدیق خود حضور سے نہ کر لیتے، انہیں کسی کے آگے دہرانے کے جرات نہ کرتے۔ نبی کریم کا اس سلسلے میں واضح ارشاد ہے کہ جو شخص کسی سنی سنائی بات کو بلا تصدیق کسی اور کے سامنے دہرائے، وہ کاذب ہے۔ بعض دفعہ ایک ایک لفظ کی تشریح و توجیہ اور اُس کے محل استعمال پر کئی کئی دن صرف ہو جاتے۔ ان سب احتیاطوں کے باوجود جو لفظ ہم اللہ اور رسول کی طرف منسوب کرتے، اللہ تعالیٰ سے اپنے ممکنہ بشری سو کی ہزار ہزار معافیوں مانگ کے اور جس کے سامنے بیان کرتے اُس کو بھی تلقین کرتے کہ وہ مزید

أَسْفَلُ السَّافِلِينَ ہو جاتا ہے۔

بختر ان سلف اور الہامی کتابوں پر ایمان لائے بغیر جن کا دین ہی مکمل نہیں ہو سکتا ان سے غیر مذہبوں کے پیروکاروں پر جبر کی توقع سراسر بدگمانی ہے۔ ہم نے اسلام ظلم و تشدد سے نہیں پھیلایا، محبت اور اصولوں سے لوگوں کے دل جیتے ہیں۔

کسی شخص کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ ایمان لے آئے  
جز مشیتِ الہی کے۔

(آیات ۹۹ اور ۱۰۰)

پھر کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام تلو لو کے زور سے پھیلا لیکن آپ کسی بات کو کسی بھی حد تک ناممکن ثابت کر دیں، پھر بھی آپ کو ایسے لوگ ہمیشہ مل جائیں گے جو اسے یقینی کہتے رہیں گے۔ اس قسم کی باتیں کرنے سے پہلے انہوں نے اتنا تو التفات فرمایا ہو تا کہ اگر اسلام کو تلوار ہی کے ذریعے پھیلانا مقصود ہوتا تو استدلال کی کیا ضرورت تھی جو قرآن کریم کے دو تہائی سے زیادہ حصے پر پھیلا ہوا ہے۔

اتنا ضرور ہو کہ ہمیں تہذیب کے خلاف جہاد کا حکم مل گیا اور تہذیب کی بھی یہی وجہ تھی کہ دشمنانِ اسلام کے پاس اسلام کے دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا اور وہ زچ ہو کر ہمیں اپنی طاقت سے کچلنا چاہتے تھے۔

بعض حالات جنگ پر مجبور بھی کر دیتے ہیں۔ توریت کا خدا بھی قرآن کے خدا سے زیادہ نرم دل نہیں تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک مرتبہ گر جا گھر میں زرمبادلہ کا لین دین کرنے والے بیوپاریوں کے ساتھ سختی برتنا پڑی تھی لیکن جنگ کی صورت میں بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں اور ضابطوں کا پابند رہنا چاہئے۔ انسان، جنگل کے قانون کو اپنی تہذیب کی ضد کے طور پر پیش کرتا نہیں تھکتا مگر اس قانون میں بھی جو سختی نظر آتی ہے وہ جانوروں کی جسمانی ضروریات کے تقاضوں کے تحت ہوتی ہے۔ جانور کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتے، کبھی کمینگی کا مظاہرہ نہیں کرتے، کبھی ہوائے نفس یا خود سری کی خاطر اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود نہیں پھیلا سکتے۔ یہ صرف انسان ہی ہے جو گرتا ہے تو

## نبیؐ کی وفات

اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبرؐ کی وفات کو آسمان بنا دیا۔ انہوں نے ۶۳۲ سن عیسوی میں انتقال فرمایا۔ سارے شہر میں سناٹا تھا۔ گھر گھر سے سسکیوں کی آواز ابھر رہی تھی۔

انسان مرگ انبوہ میں وفات پائے، ہزاروں لوگوں کے ساتھ جنگ میں جان دے یا کسی وبائی مرض میں مبتلا ہو کر اس دابرِ قافی سے رخصت ہو، اُس کی موت، اُس کی اپنی موت ہوتی ہے۔ موت میں شراکت نہیں ہوتی۔ کسی کو کسی لور کی موت کو سمجھنے کی توفیق نہیں دی جاتی۔ لوگ محض دوسروں کی وفات کی تفصیل بنا سکتے ہیں یا اُن وجوہ لور امراض کا ذکر کر سکتے ہیں جن سے موت واقع ہوئی جیسا کہ میں کر رہا ہوں۔

رسول اللہؐ کے آخری لمحات کے بارے میں، میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی وفات نہ تو اچانک ہوئی نہ متوقع تھی۔ نہ اسے کاملاً پرسکون کہا جا سکتا ہے، نہ سختی اور شدت لئے

بالٹی دی اور ٹھنڈا پانی لانے کے لئے کہا۔

میں بالٹی لیتے ہی دوڑ پڑا۔ ایک کنواں، دوسرا کنواں، تیسرا، چوتھا چھوڑتا ہوا میں اس کنوئیں پر پہنچ گیا جس کا پانی مدینے میں سب سے ٹھنڈا تھا۔ بالٹی رستی سے باندھ کر جلدی سے کنوئیں میں ڈالی تو کنوئیں کی تہ میں ایک چھپا کاہوا، مجھے وہ آواز آج بھی یاد ہے۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اس پانی کی ٹھنڈک فوراً ہی حضورؐ کے جسم کی حدت ختم کر دے گی۔ پانی لے کر جلدی سے واپس گیا اور عائشہؓ کے حوالے کیا۔ میرے پاس اتنا ہی وقت تھا کیونکہ دن چڑھنے سے پہلے مجھے اپنے فرض سے سبکدوش ہونا تھا۔ میں جانتا تھا اگر حضورؐ کے کانوں میں اذان کی آواز نہ بڑی تو وہ اپنی بھاری کی تکلیف سے بھی زیادہ تکلیف محسوس کریں گے۔

اذان دے کر میں نے پھر عائشہؓ کے حجرے پر دستک دی۔ حجرے کی پریشانی کچھ کم تھی۔ میرے دل کو بھی ذرا اطمینان ہوا۔ عائشہؓ نے کہا رسول اللہؐ نے تمہارے لئے یہ پیغام دیا ہے کہ آج سے بہتر اذان تم نے کبھی نہیں دی۔

ذاتی طور پر مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا۔ میرے خیال میں، میں نے کئی بار اس سے زیادہ تاثر میں ڈوبی ہوئی اذانیں دی تھیں۔ اُس صبح تو ہوا بھی اتنی تیز تھی اور درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ نے بھی میری آواز کی بہت سی خوبیوں کو دبا دیا تھا۔ میری آواز میں وہ رچاؤ ہی پیدا نہیں ہونے پایا تھا جو میں اکثر محسوس کیا کرتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا میں ہوا کو ساکن کر دوں، پتوں کی سرسراہٹ روک دوں۔ پھر شہادت رسالت کے الفاظ پر میرے ذہن میں اپنے نبیؐ کی تکلیف کا خیال آ گیا تھا جس نے مجھے پریشان کر دیا تھا لیکن ہر مؤذن کو یہ جاننا ضروری ہے کہ اُس کی اذان کا حسن کانوں سے نہیں دل سے پرکھا جاتا ہے۔ کان تو محض ایک بیرونی آلہ ہیں۔ دل انسان کا باطن ہے۔ اگر سرور کائنات نے ارشاد فرمایا کہ یہ میری بہترین اذان تھی تو واقعی وہ بہترین تھی۔

ہوئے۔ نہ یہ ایک عام واقعہ تھا اور نہ اسے غیر معمولی کہا جاسکتا ہے۔ پھر بھی یہ ایک پیغمبر کی وفات تھی۔ جس قادر مطلق نے عرشِ معلیٰ پر اُن کے نور کی شمع جلائی تھی، اُسی نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

میں نے حسبِ معمول صبح انہیں بیدار کیا۔ وہ باہر تشریف لائے مگر اُن کی حرکات و سکنات میں روزمرہ جیسی چستی نہیں تھی۔ سردرد کی شکایت کر رہے تھے۔ مجھے کہا میں اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھوں، کہیں خار تو نہیں۔ میں نے عرض کی کہ پیشانی گرم ہے۔ حضور آرام فرمائیں لیکن انہوں نے میرے ساتھ مسجد جانے پر اصرار کیا۔ چلنے لگے تو نقاہت محسوس کر رہے تھے۔ میرا بازو تھام لیا۔ میں انہیں اپنے ساتھ لگا کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ اچانک رک گئے اور کہنے لگے:

”بلال تمہیں یاد ہے جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اُس دن بھی ہم ایسے ہی چل رہے تھے لیکن اُس دن میں نے تمہیں سہارا دیا ہوا تھا۔“

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑے۔ میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا:

”بائیس سال پہلے کی بات ہے۔“

انہوں نے فرمایا:

”نہیں بلال نہیں، کل کی، کل کی بات ہے۔“

سارا دن خار تیز ہوتا گیا۔ دوسرے دن صبح اور بھی زیادہ تھا مگر پھر بھی وہ بستر سے اٹھے اور اپنی آواز کی نقاہت اور ہاتھوں کی لرزش کے باوجود امامت فرمائی۔ تیسرے اور چوتھے دن بھی صورتِ حال ایسی ہی رہی۔ پانچویں دن جب میں نے صبح دروازے پر دستک دی تو دروازہ عائشہؓ نے کھولا۔ چہرے پر بہت پریشانی تھی۔ اُن کے عقب سے رسول کریمؐ کے کرانے کی آواز آرہی تھی۔ انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ عائشہؓ نے مجھے ایک

پر ایک مرتبہ پھر سب نے عرض کی :

”آپ ان کی طبیعت سے واقف ہیں، وہ تو آپ کی علالت ہی کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس گنوائے بیٹھے ہیں۔ وہ یہ ذمے داری نہیں نبھاپائیں گے۔“ اس مرتبہ انہوں نے مجھے زور دے کر کہا :

”تم ابو بکر سے کہو کہ وہ امامت کریں۔“

یہ نبیؐ کا فیصلہ تھا۔ ہم سب نماز کے لئے روانہ ہو گئے۔ ابو بکرؓ حسب حکم امامت کے لئے کھڑے ہو گئے اور نماز شروع ہو گئی۔ اتنے میں حضورؐ، علیؓ اور فضل بن عباسؓ کے شانوں پر ہاتھ رکھے مسجد میں تشریف لائے اور ابو بکرؓ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ ابو بکرؓ نے انہیں دیکھ کر فوراً ان کے لئے جگہ چھوڑنا چاہی مگر حضورؐ نے انہیں اشارے سے حکم دیا کہ وہ نماز پڑھاتے رہیں، اور خود ان کی امامت میں نماز ادا فرمائی۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضورؐ نے تبوک کے سفر میں عبدالرحمن بن عوفؓ کی امامت میں بھی نماز ادا فرمائی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ حضورؐ کو وضو میں دیر ہو گئی تھی اور نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا، چنانچہ لوگوں نے نماز قضا ہونے کے خوف سے ابن عوفؓ کو امامت کے لئے کہا۔ ابھی انہوں نے ایک ہی رکعت پڑھائی تھی کہ حضورؐ تشریف لے آئے۔ ابن عوفؓ نے انہیں اپنی جگہ دینی چاہی مگر اُس دن بھی حضورؐ نے انہیں اشارے سے روک دیا اور ان کی امامت میں نماز ادا کی۔ سب کے سلام پھیر لینے کے بعد انہوں نے اپنی ایک باقی رکعت ادا کی۔ نماز پڑھ کر انہوں نے فرمایا :

”آپ لوگوں نے اچھا کیا کہ ابن عوفؓ کے پیچھے نماز پڑھ لی۔

ہر نبیؐ کو اپنی موت سے پہلے کم از کم ایک نماز اپنے کسی متقی پیروکار کی امامت میں ادا کرنا ہوتی ہے۔“

دو دن تک ان پر غشی کے دورے پڑتے رہے۔ کبھی ہوش آجاتا کبھی بے ہوشی طاری ہو جاتی۔ میں اس تمام عرصے میں ان کی چوکھٹ پر بیٹھا رہا۔ جب مجھے پانی لانے کے لئے کہا جاتا، میں دوڑ پڑتا۔ دوڑنے سے مجھے اپنے ذہن کا وہ جھلکا ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ لگتا تھا میرا ہر قدم ان کی بیماری دور کر رہا ہے۔ یہ میں نہیں جانتا تھا کہ ہر قدم پر منزل دور ہوتی جا رہی ہے۔ میں ہر دفعہ ایک نئے کنویں سے پانی لے کر آتا۔ اس خیال سے کہ اگر ایک کنویں کے پانی سے بیماری دور نہیں ہوئی تو شاید دوسرے کنویں کے پانی میں کوئی ایسی تاثیر ہو جس سے افاقہ ہو جائے۔ اس طرح ایک ایک کر کے میں نے مدینے کے سات کنوؤں کا پانی لا کر دیا۔ عائشہؓ نے یہ پانی الگ الگ سات برتنوں میں رکھ لئے تھے۔ یہ برتن دیگر ازواج مطہرات کے حجرہوں سے آئے تھے۔ عائشہؓ باری باری ان میں کپڑا بھگو بھگو کر حضورؐ کے بدن پر رکھتیں تاکہ بخار کی حدت کم ہو۔

آٹھویں دن حضورؐ کی حالت میں اچانک ایک تبدیلی آئی۔ صبح انہوں نے دروازہ خود کھولا اور باہر تشریف لائے۔ سر پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

اتنے میں عبید اللہ بن عبد اللہؓ آئے اور حضورؐ سے عرض کی کہ لوگ آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے بے تاب ہیں۔ حضورؐ نے مجھے فرمایا کہ میں ابو بکرؓ سے نماز کی امامت کے لئے کہوں۔ یہ حکم سن کر میں چلنے ہی والا تھا کہ عائشہؓ نے ان سے عرض کی :

”میرے والد بہت رقیق القلب ہیں۔ ان کی آواز بھی بہت دھیمی ہے۔

ویسے بھی قرآن کی تلاوت کرتے وقت ان پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔

وہ آپ کی جگہ محرابِ نبویؐ میں کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھا سکیں

گے۔“

یہ سن کر محسنِ عالم نے مجھے دوبارہ حکم دیا کہ میں ابو بکرؓ کو ان کا پیغام پہنچا دوں۔ اس

حضورؐ نے فرمایا:

”انہیں ابھی خیرات کر دو۔ میں اس رقم کے ساتھ اللہ کو کیانہ دکھاؤں گا۔“

اس کے بعد وہ صرف ایک بار اور مسجد میں تشریف لائے۔ میرے لئے یہ ان کا آخری دیدار تھا۔ صرف چند گھنٹوں کی زندگی باقی تھی مگر چہرے سے پڑمردگی کی کیفیت بالکل دور ہو چکی تھی۔ انسؓ نے جو میرے قریب کھڑے تھے، آپ کو دیکھ کر کہا کہ میں نے کبھی ان کا چہرہ اتنا حسین نہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ کلام فرما رہے تھے:

”اگر میری وجہ سے کسی کو کوئی دکھ پہنچا ہو تو وہ مجھے معاف کر دے۔“

قرآن حکیم ہدایت کا سرچشمہ ہے اسے سینے سے لگا کر رکھنا۔“

جب انہیں سہارا دے کر اٹھایا گیا تو انہوں نے کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر

دوڑائی اور فرمایا:

”میں تم سے رخصت ہو رہا ہوں لیکن یاد رکھنا تمہیں میرے پیچھے آنا ہے۔“

اب جو میں بیان کرنے لگا ہوں وہ میں نے دیکھا نہیں سنا ہے۔ نزع کے عالم میں

حضورؐ کا سر مبارک عائشہؓ کی گود میں تھا۔ انہوں نے آپ کو اپنے بازوؤں میں سنبھال رکھا تھا۔ کسی نے مسواک پیش کی تو کچھ دیر مسواک کرتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آخری لمبے میں عائشہؓ نے انہیں یہ کہتے سنا۔

”اے اللہ حشر کے دن مجھے غریبوں کے ساتھ اٹھانا۔“

اور پھر کچھ اور الفاظ فرمائے جو سنائی نہیں دئے یا سمجھ میں نہیں آئے یا یاد نہیں

رہے یا ہمارے لئے تھے ہی نہیں۔ اُس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب تھے۔ پھر اچانک انہوں

نے سر اٹھایا اور یہ لفظ ادا کئے:

اُس دن جب مسجد نبوی میں یہ واقعہ دہرایا گیا تو حضورؐ کے دو سال پہلے کے یہ الفاظ یاد کر کے میرا دل بیٹھ گیا۔ آج ان لفظوں کے معنی ہی کچھ اود ہو گئے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے اُحد کے شہدائے لے ڈعا فرمائی اور پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر تشریف لے گئے۔ لگتا تھا چلنے میں انہیں بہت تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہ گئی تو میں دوسری سمت دیکھنے لگا۔ مجھ جیسے کم فہم کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وقت قریب ہے، سب چہروں پر یہی تاثر تھا۔ ہر ایک کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

اُس رات جب تاریکی گہری ہو گئی، تو حضورؐ نے جنت البقیع جانے کا ارادہ کیا۔ میں اور علیؓ بھی ساتھ ہوئے، اس خیال سے کہ کہیں ضعف کی وجہ سے گرنہ پڑیں مگر ہم نے دیکھا کہ ان کے قدم نہایت مضبوطی سے پڑ رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ قبروں تک پہنچ گئے اور بلند آواز میں فرمانے لگے:

”اے قبر کے رہنے والو تمہیں سلام،

خوشی مناؤ کہ تم زندہ لوگوں سے بہتر ہو،

وہ صبح جو تمہیں جگاتی ہے،

اُس صبح سے بہتر ہے،

جو زندہ لوگوں کو جگاتی ہے۔“

گہری تاریکی میں اُن کا روئے مبارک مجھے نظر نہیں آ رہا تھا مگر اُن کے کلمات کا

ایک ایک حرف میرے دل پر نقش ہو گیا۔

بقیع سے واپس تشریف لائے تو انہوں نے عائشہؓ سے پوچھا کہ گھر میں کتنی رقم

ہے۔ عائشہؓ کو اس سوال کا جواب دینے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ فوراً بولیں:

”سات درہم۔“



ہاتھ بلند کر کے سب سے خاموشی کی درخواست کی۔ آج اُن کے لہجے میں، اُن کی آواز میں، اُن کے الفاظ میں ساری دنیا کا اختیار جھٹک رہا تھا۔

”اگر ہم میں سے کوئی ایسا ہے جو محمدؐ کو معبود سمجھتا ہے تو وہ جان لے کہ محمدؐ کا انتقال ہو چکا ہے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے اس دردناک حقیقت کے دلوں میں اترنے کے لئے جتنا وقت ضروری تھا، دیا اور پھر اعلان کیا:

”لیکن جو اللہ کو اپنا معبود سمجھتا ہے، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔“

اُس کے بعد آل عمران کی یہ آیت پڑھی جو جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھی:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَأَنْتُمْ مَاتَ أَوْ

قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَصُرَ

اللَّهُ شَيْئًا ۚ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝

اور محمد تو صرف (اللہ کے) پیغمبر ہیں

ان سے پہلے بھی کئی پیغمبر ہو گزرے ہیں

بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں

تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا،

تو اللہ کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا

اور اللہ شکر کرنے والوں کو ثواب دے گا۔

الرُّسُلِ إِلَّا عَلَىٰ

باہر بیٹھے ہم نے حضرت عائشہؓ کے رونے کی آواز سنی تو ہمیں پتا چل گیا کہ حضورؐ انتقال فرما گئے ہیں۔ عمرؓ جلدی سے اندر گئے، مگر اُن کی آنکھوں نے صرف یہ دیکھا کہ حضورؐ استراحت فرما رہے ہیں۔ غم نے اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اُن کے ذہن نے یہ قبول ہی نہیں کیا کہ حضورؐ اب ہم میں نہیں ہیں۔ وہ نہایت غیظ و غضب کے عالم میں باہر نکلے۔ ہوا میں کئے لہراتے ہوئے اور زور زور سے چلاتے ہوئے کہ اگر کسی نے کہا محمدؐ فوت ہو گئے ہیں تو وہ اپنے انجام کے لئے تیار ہو جائے۔ ہم کئی لوگوں نے مل کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر انہوں نے ہمیں دھکا دے کر پرے کر دیا۔ پھر خود ہی اپنے موقف کی توجیہ کرنے لگے۔ اُن کا استدلال یہ تھا:

”موسیٰ علیہ السلام کا قصہ یاد ہے جب وہ کوہ سینا پر اللہ کے پاس گئے تھے

تو یہودیوں نے مشہور کر دیا تھا کہ وہ وفات پا گئے ہیں لیکن کیا ہوا،

چالیس دن کے بعد وہ زندہ سلامت واپس تشریف لے آئے۔ محمدؐ بھی

چالیس دن بعد انہی کی طرح واپس آجائیں گے۔“

بے چارے نیک دل عمرؓ وہ صحن مسجد کے وسط میں کھڑے تھے۔ اُن کے سر کے

بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کبھی ادھر مز کے کچھ کہتے کبھی ادھر۔ اُن کا غم حقیقت کی تنگی سے

نبرد آزما تھا، جیسے کوئی دیوانہ چاند پر پتھر پھینک رہا ہو۔

ابو بکرؓ بھی حضرت عائشہؓ کے خجرے میں تشریف لے گئے۔ انہوں نے آپ کا

روئے مبارک دیکھا۔ دیکھتے ہی انہیں حضورؐ کی وفات کا یقین ہو گیا۔ انہوں نے حضورؐ کی

پیشانی پر بوسہ دیا اور چادر سے چہرہ ڈھانپ دیا۔

وہاں سے ابو بکرؓ مسجد میں تشریف لائے۔ آتے ہی اُس حلیم الطبع انسان نے ایک

یوں لگتا تھا جیسے لوگوں نے اس آیت کا مفہوم پہلی مرتبہ سمجھا تھا۔

عمر فاروقؓ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور زور زور سے رونے لگے۔  
گریہ وزاری کے عالم میں کھڑے نہ رہ سکے تو بیٹھ گئے، اسی طرح چہرہ چھپائے زار و قطار  
روتے رہے۔ اُن کا سارا جسم لرزے کے عالم میں تھا۔ پھر مدینہ اس طرح گریہ کنال ہوا کہ  
معلوم ہوتا تھا ساری کائنات رورہی ہے۔ میں نے آمدِ رسولؐ پر مدینے کی خوشی کی ابتداء دیکھی  
تھی، آج مدینے کے غم کی ابتداء دیکھ رہا تھا۔

مدینین کے بعد قبر پر چھڑکاؤ کرنے کی سعادت بھی میرے حصے میں آئی۔ میں  
آہستہ آہستہ قبر پر چھڑکاؤ کرتا جاتا تھا اور سوچتا جاتا تھا کہ آج کیسا آفتاب غروب ہو گیا۔ کیا  
سعادت ہے اس زمین کی، مٹی کے ان ڈروں کی، جنہوں نے اس آفتاب کو اپنی آغوش میں نیا  
ہے۔ مٹی بیٹھ گئی تو میں نے ہاتھوں سے تھپک تھپک کر اُسے ہموار کیا۔ رخصت ہوتے  
ہوئے مڑ کر دیکھا تو ساری قبر پر میرے اہو سی ہاتھوں کے نشان بنے ہوئے تھے!

## اُن کے بعد

اُس دن کے بعد میں نے اذان دینا بند کر دی۔ یہ نہیں کہ میرا جی نہیں چاہتا تھا۔  
میں اللہ کے آخری رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نامزد مؤذن آج بھی دل میں وہی تڑپ رکھتا  
تھا۔ اُن کے تعریفی کلمات آج بھی میری حیات کا عزیز ترین سرمایہ تھے۔ اُن کا فرمان آج بھی  
میرے لئے ہر چیز پر مقدم تھا۔ ثواب کا آج بھی میں اتنا ہی مستحق تھا، جتنا آج سے پہلے۔  
اشاعتِ دین میں میرا حقیر سا حصہ آج بھی میری روح کی تسکین کا سامان تھا۔ میں بھی وہی  
تھا۔ میری آواز بھی وہی تھی۔ آج بھی میرے سُروں میں وہی گونج تھی۔ میرے لہجے میں  
وہی کھنک اور اسلام کے اولیٰ دنوں کا وقار اور دبدبہ تھا۔ اذان کے الفاظ آج بھی لہو کی طرح  
میرے رگوں میں رواں تھے۔ اُس کا لحن آج بھی میرے سارے وجود کو مترنم کئے ہوئے تھا۔  
آج بھی میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ میں بلند آواز سے توصیفِ الٰہی بیان  
کروں، رسالتِ محمدؐ کی شہادت دوں، ایمان والوں کو نماز کے لئے پکاروں، نیکی کی طرف

بلاؤں۔ مگر نہ جانے کیا ہو گیا تھا، ایسے لگتا تھا کچھ اندر سے ٹوٹ گیا ہے۔ کوئی ایسی چیز جس کے ٹوٹنے سے میری ساری صلاحیتیں چھ گئی ہیں اور جو کچھ ٹوٹا ہے دوبارہ جڑ نہیں سکتا۔ اب سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں تھا۔ اب اسی اثبات و نفی کے عالم میں زندہ رہنا میرا مقدر تھا۔ میں بے بس تھا۔

ایک دن علیؑ اور ابو ذرؓ نے بہت زور دے کر مجھے اذان کے لئے چھت پر چڑھا دیا۔ میری ٹانگیں ساتھ نہیں دے رہی تھیں مگر دونوں نے سہارا دیا۔ ابھی میرے منہ سے اللہ اکبر، ہی نکلا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے الفاظ کا درد سب بھول گیا تھا۔ کبھی کوئی لفظ نکلتا، کبھی کوئی۔ سب الفاظ آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ حضورؐ کا نام مبارک آتے ہی مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ میں انک گیا۔ پھر دوبارہ شروع سے اذان دینے لگا، پھر محمدؐ کا نام آتے ہی رک گیا۔ چار دفعہ میں نے اذان شروع کی اور چاروں مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ میں لفظ محمدؐ، اکثر ان کو دیکھ کر ادا کیا کرتا تھا۔ وہ سامنے ہوتے تھے یا پاس ہوتے تھے تو میں ان کی طرف اشارہ کر کے ان کی رسالت کی شہادت دیا کرتا تھا۔ آج میری آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ زبان ساتھ دے رہی تھی نہ ذہن۔ آخر علیؑ اور ابو ذرؓ دونوں نے ترس کھایا اور مجھے نیچے اتار لائے۔

## آخری اذان

جن جن موقعوں پر میں نے اہل دین کو نماز کے لئے پکارا ہے، اگر یکجا کر دئے جائیں تو اسلام کی اولین تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔ جنگ اُحد کے موقعے پر شیخین کی اذانِ مغرب ہی لیجئے۔ رسول اللہؐ کی قیادت میں مدینے سے مارچ کرتا ہوا لشکرِ اسلام اُحد سے نصف فاصلے پر شیخین تک پہنچا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ نبی کریمؐ سب نامی گھوڑے پر سوار تھے۔ سب کا مطلب ہے 'آب رواں'۔ اُس گھوڑے کی خصوصیات کے اعتبار سے یہ نام اُس کے لئے بہت موزوں تھا۔ حضورؐ کے سر پر خود تھا جس کے گرد سیاہ عمامہ بندھا ہوا تھا۔ چڑے کی پیٹی میں تلوار لگی تھی۔ پشت پر ڈھال، شانے پر کمان، ہاتھ میں نیزہ۔ اور دوہری زرہ۔ سب کے علاوہ ایک گھوڑا اور بھی تھا جس پر ابو بردہؓ سوار تھے، باقی سب پیدل چل رہے تھے۔ تین نیزے فضا میں بلند تھے جن پر علم لہرا رہے تھے۔ اُس کا علم اُسیدؓ کے ہاتھ میں تھا، خزرج کا خبابؓ کے پاس اور مہاجرین کا پرچم مصعب بن عمیرؓ کے سپرد تھا۔

دو تاریخی موقعوں پر میں نے حضورؐ کے حکم پر خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دینے کی سعادت حاصل کی۔ فتح مکہ کے دن جس کا احوال میں سنا چکا ہوں اور اُس سے ایک سال پہلے عمرۃ القضاء کے موقع پر جب ہم اپنے ہتھیار پیچھے چھوڑ کر قریش کی خاص اجازت سے عمرہ کرنے گئے تھے۔ اُس دن پہلی مرتبہ جب میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا تھا اور میں نے صحن کعبہ میں چاروں طرف سفید احراموں میں ملبوس اہل ایمان کا سیل بے کراں دیکھا تھا تو میری آنکھیں خوشی سے بھر آئی تھیں۔ تین دن کے لئے ہی سہی مگر ان دنوں میں یہ کعبہ ہمارا تھا۔ اہل ایمان سے آباد۔ اس کے اطراف گو تین سو ساٹھ بت موجود تھے مگر مجھے خوشی تھی کہ میں بلال حبشی، جو کبھی خود اُن کا غلام تھا آج انہیں معبودِ لا شریک کا اعلان سنانے والا تھا۔ ابو قیس کی پہاڑی پر قریش کے سردار، خانہ کعبہ پر نظریں جمائے مسلمانوں کو عمرہ کرتے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اسی دوران میں ایک حبشی غلام کو بھی خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے دیکھا۔ کعبے کی رفعتوں سے خالق حقیقی کی تکبیر اور محمدؐ کی رسالت کی شہادت پہاڑیوں میں گونجی تو انہیں اندر ہی اندر خوف پیدا ہو گیا تھا کہ وہ یہ بازی ہارتے جارہے ہیں۔ حدیبیہ میں انہوں نے ایک سال پہلے جو معاہدہ کیا تھا اب انہیں اُس کی شرائط اپنے حق میں نظر نہیں آرہی تھیں۔ انہوں نے ایک ریت کا گھر وندایا تھا جو اُن کی نظروں کے سامنے گرتا جا رہا تھا۔

بیت المقدس کی تسخیر کے موقع پر جب امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے جابہ میں عیسائیوں سے صلح کا معاہدہ کیا تو اُس موقع پر انہوں نے ایک نہایت جامع اور بلیغ خطبہ دیا۔ سامعین میں میں بھی تھا۔

تقریر ختم کر کے انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا:

”اے ہمارے سردار بلال! آج اسلام کے قبلہ اول پر اسلام کا پرچم لہرایا ہے۔“

تین تین پہنچتے پہنچتے سورج غروب ہو گیا تو مجھے اذان کا حکم ملا۔ ایک ہزار جاں نثاروں کو جو اپنی زندگی کے ایک عظیم جہاد میں شامل ہونے کے لئے گھر سے نکلے تھے، دعوتِ نماز دیتے ہوئے مجھ پر عجب کیفیت طاری تھی۔ ان میں نہ جانے کتنے تھے جن کی یہ آخری نماز مغرب تھی۔ ان میں دو روشن چہرے مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ شام کے دھند لکے میں بھی لگتا تھا اُن پر دھوپ پڑ رہی ہے۔ اذان دیتے وقت بار بار میری نظریں اُن کی طرف اٹھ جاتیں۔ یہ دونوں جوان تھے۔ چودہ چودہ، پندرہ پندرہ سال کے۔ رفیع بن خدیجؓ اور نجد کے ایک قبیلے کے یتیم سمورہ بن جندبؓ۔ حضورؐ نے کم عمری کی وجہ سے دونوں کو جنگ میں شرکت کی اجازت نہیں دی تھی مگر کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ رفیعؓ بہت اچھے تیر انداز ہیں بلکہ کئی نامور تیر اندازوں سے بہتر ہیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں اجازت دے دی۔ سمورہؓ یہ فیصلہ سُن کر یوں اٹھے:

”اگر رفیع لڑ سکتا ہے تو میں بھی لڑ سکتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ طاقت ور ہوں، کشتی کروا کے دیکھ لیجئے۔“

حضورؐ نے تسم فرمایا اور نماز کے بعد مقابلہ ہوا تو سمورہؓ نے واقعی رفیعؓ کو ہرا دیا۔ اس طرح وہ بھی مجاہدینِ احد میں شامل ہو گئے۔

جنگِ احزاب میں دشمن کے راتوں رات فرار ہو جانے کے بعد جب میں نے فجر کی اذان دی تو خندق کے کنارے لگے ہوئے خیموں سے نکلنے ہوئے مجاہدین کے چروں پر شکر کے جو تاثرات تھے، وہ مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ نماز کے بعد ہم نے دیکھا تو میدان خالی پڑا تھا۔ ایک اور یقینی شکست فتح میں تبدیل ہو گئی تھی اور ہمارے دل گواہی دینے لگے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں عربستان کی مجموعی طاقت کے خلاف سرخرو کیا ہے تو اب انشاء اللہ فتح ہر قدم پر ہمارے پاؤں چومے گی اور پھر تاریخ نے ہمارا یہ اندازہ صحیح ثابت کر دکھایا۔

مخمل پر رقت طاری ہو گئی۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ شہادت رسالت دی تو صحابہ کرام کا حال دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہزاروں کے مجمعے میں صرف حضور اکرم کے صحابی بیٹھے ہیں اور میں جابہ میں نہیں مسجد نبوی میں اذان دے رہا ہوں۔ عمر کی تو روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ آخری بار میں نے انہیں حضور کی وفات پر اس طرح زار و قطار روتے دیکھا تھا۔ یہی حال ابو عبیدہ کا تھا۔ بار بار اپنا ہاتھ فرش پر مارتے اور روتے جاتے۔ ایک طرف معاذ بن جبل، جن کا حسین و جمیل چہرہ صرف ہنسنے کے لئے بنا تھا، اس شدت سے گریہ و زاری کر رہے تھے کہ بے حال ہوتے جا رہے تھے، ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ انہیں سنبھال رہے تھے۔ ہر شخص فراق رسول میں تڑپ رہا تھا، ہر صحابی کے ذہن میں دور نبوی کی تصویر کھینچ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے حضور ابھی ابھی ہم سے رخصت ہوئے ہوں۔ اذان ختم ہونے کے بعد لوگوں کو قرار آیا۔

حضور کی وفات کے بعد ابو بکر خلافت کے منصب پر فائز ہوئے اور رفتہ رفتہ تمام کاروبار حیات معمول کے مطابق چلنے لگا مگر میری اپنی یہ حالت تھی کہ میری نظریں اب بھی حضور کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی کہیں سے آجائیں گے، اسی طرح مسکراتے ہوئے۔ انہیں سامنے نہ پا کر میں بھری دنیا میں تنہا ہو گیا تھا۔ میری زندگی میں ایسا خلاء پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے شب و روز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اذان کے علاوہ میرے معمولات وہی تھے مگر لگتا تھا جیسے زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا۔ جیسے میں کسی خزاں رسیدہ شاخ سے گرا ہوا ایک پتہ تھا جسے ہوائیں ادھر ادھر اڑائے پھر رہی تھیں، جس کی اپنی کوئی منزل نہیں تھی۔ زندگی میں اگر کچھ تھا تو ان کی یادیں، ان کی تربیت، ان کے ارشادات، ان کی دی ہوئی تعلیم اور ان کی بے پناہ شفقت کا احساس۔

ابو بکر کے انتقال کے بعد میں عمر فاروق کی خلافت کے ابتدائی دور میں جماد شام

اس تاریخی موقع پر اگر آپ اذان دیں تو بہت مناسب ہوگا۔

عمر کا یہ کہنا تھا کہ ایک لمحے میں کتنی ہی باتیں میرے ذہن میں پھر گئیں۔ مجھ پر وہ ہمیشہ بڑی شفقت فرماتے تھے۔ جب ملتے مجھے سیدنا کہہ کر مخاطب کرتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا:

”ابوبکر سیدنا واعتق سیدنا یعنی بلا لاً“

ابو بکر ہمارے سردار ہیں جنہوں نے ہمارے سردار بلال کو آزاد کر لیا۔

ایک اور موقع پر جب وہ خلافت کے منصب پر فائز تھے تو قریش کے سرداروں کا ایک وفد ان سے ملاقات کے لئے آیا۔ میں بھی کسی کام کے سلسلے میں ان کے پاس حاضر ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے ان سے پہلے اندر بلوایا تو اکابر قریش کو بہت ناگوار گزرا۔ انہوں نے کہہ بھی دیا کہ شرفائے قریش تو انتظار کر رہے ہیں اور ایک حبشی کو اندر بلایا گیا ہے۔ اس موقع پر سہیل بن عمرو نے یہ کہہ کر بات سنبھالی کہ دعوت حق ہم سب کو ایک ساتھ ملی تھی مگر بلال ہم پر سبقت لے گئے۔ یہی اولیت ان کا شرف ہے۔ ہمیں شکایت کا کوئی حق نہیں۔

اُس دن جب ہم مدت بعد ملے تھے اور میں نے عمر کی زبان سے اپنا نام سنا تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میں نے نہایت ادب سے عرض کی:

”امیر المؤمنین آپ جانتے ہیں میں نے رسول اللہ کی وفات کے بعد کبھی اذان نہیں دی لیکن اگر آپ کا حکم ہے تو میں تعمیل کروں گا۔“

میں اذان دینے کھڑا ہوا تو فتح مکہ کی اذان کا نقشہ میرے ذہن میں ابھر آیا۔ قبلہ اول پر مسلمانوں کا قبضہ بھی ایک ویسا ہی با عظمت موقع تھا۔ ہزاروں فرزندان توحید جمع تھے اور سب کے دل بارگاہ الہی میں اسلام کی اس تاریخی کامیابی پر شکر سے لبریز تھے۔ میرے سامنے کئی صحابہ کرام بیٹھے تھے، میرے منہ سے اللہ اکبر، اللہ اکبر، کے الفاظ کا نکلنا تھا کہ

میں شریک ہو گیا اور رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں حصہ لیا۔ یہ معرکے ختم ہوئے تو یہیں شام ہی کے علاقے خولان میں سکونت اختیار کر لی۔ ایک رات رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا۔ فرما رہے تھے:

”بلال، کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم ہمیں ملنے آؤ۔“

میں تڑپ کر رہ گیا اور فوراً رختِ سفر باندھ لیا۔ مدینے میں داخل ہوا۔ بے تاملی عروج پر تھی۔ سیدھا روضہ اقدس پر پہنچا اور اس قدر رویا کہ لگتا تھا اب یہاں سے اٹھنا نہیں ہو گا۔ حضورؐ کے نواسے حسنؑ اور حسینؑ بھی میری خبر سن کر روضہ رسولؐ پر پہنچ گئے۔ ان کو دیکھ کر کیا کیا یاد آ گیا۔ ان کا منہ، سر، ہاتھ چومنا اور بار بار انہیں سینے سے لگا کر پیار کیا۔ انہوں نے خواہش کی کل صبح آپ حرمِ نبویؐ میں اذان دیں۔ میں اپنے آقاؐ کے جگر گوشوں کی خواہش کیسے پال سکتا تھا۔ سارے شہر کو خبر کر دی گئی کہ بلال کل فجر کی اذان دیں گے۔ صبح اذان دی تو سارا مدینہ اذان سننے کے لئے اُٹ آیا۔ روتے روتے لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں، ان کی بھی جنموں نے دورِ نبویؐ میں میری اذانیں سنی تھیں اور ان کی بھی جنموں نے صرف میرا نام سن رکھا تھا۔ میں خود بھی زار و قطار رو رہا تھا۔ اذان دیتے وقت جب میں نے شہادتِ رسولؐ کے کلمات کہتے ہوئے روضہ مبارک کی طرف انگشتِ شہادت کا اشارہ کیا تو گویا یہ اشارہ میری آواز میں شامل ہو گیا۔ گھروں میں بیٹھی ہوئی خواتین بھی جو میری اذان سنی رہی تھیں، بے تاب ہو کر گھروں سے نکل آئیں۔ لوگوں نے کہا تہی کریمؐ کے یومِ وفات کے بعد مدینے میں ایسا دلداز منظر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ میری آخری اذان تھی۔ میری اذان کی ابتدا بھی اسی مسجد سے ہوئی تھی، انتہا بھی وہیں ہوئی۔

## فتحِ شام

ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کے ابتدائی دور ہی میں جگہ جگہ فتنہ ارتداد نے سر اٹھایا تو خلیفہ اول نے اس کا قلع قمع کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ پوری تندہی سے دس ماہ اس فتنے کا سر کچلنے میں مصروف رہے۔ ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ جہاں سمجھانے جھانے سے بات بنی وہاں نہایت بردباری اور کمال فراست سے لوگوں کے دوسو سے دور کیے اور جہاں سختی ناگزیر تھی وہاں پوری طاقت سے اس فتنے کی سرکشی کی، یہاں تک کہ امن و امان ہو گیا۔ ابو بکر صدیقؓ کو ہم لوگ نہایت متین، خاموش طبع، نرم خواہر بہت دھیمے مزاج کے انسان کی حیثیت سے جانتے تھے مگر اس معرکے میں ان کے کردار کا ایک آہنی پہلو بھی سب کے سامنے آیا جو حد سے گزر جانے والوں کے لئے کسی رورعایت کا متحمل نہیں تھا۔ اسی عرصے میں شام کی طرف سے کچھ لوگوں کو شہِ ملی اور ادھر سے مسلمانوں کے خلاف پے در پے چھوٹی چھوٹی معرکے آرائیاں شروع ہو گئیں۔ دشمنانِ اسلام شاید سمجھتے ہوں کہ اسلام کے سربراہ تو اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہیں، کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اجنادین کی فتح کے فوراً بعد ابو عبیدہؓ اور خالد بن ولیدؓ کے لشکروں نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ ابھی جاری تھا کہ خلیفہ اول نے وفات پائی اور عمر بن خطابؓ مسند نشین خلافت ہوئے۔

عبدالقاروتی کے اوائل میں ایک روز خالد بن ولیدؓ موقع پا کر فصیل شہر پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اندر سے شہر کا پھانک کھول دیا۔ ابو عبیدہؓ فوراً اپنے لشکر سمیت شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ اہل دمشق نے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کے طالب ہوئے۔ یوں دنیا کے قدیم ترین شہر دمشق پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ دمشق رومیوں کے ہاتھوں سے چلا تو گیا مگر صحرائیوں کے ہاتھوں شکست رومیوں کی انا کے لیے بہت بڑا چیلنج بن گئی۔ رومی پچاس ہزار کا لشکر لے کر اپنی پوری تیاریوں کے ساتھ پیمان میں جمع ہو گئے۔ مسلمانوں کی تعداد نصف سے کم تھی لیکن ان کا جذبہ جہاد پھر کام آیا۔ انہوں نے رومیوں پر اس قدر شدید حملے کیے کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر ان کا غرور خاک میں ملا دیا۔ مسلمانوں کا حوصلہ بڑھا تو انہوں نے یکے بعد دیگرے مرج الروم، حمص، حماة، شیزر، معرة السمان اور کئی دوسرے مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ابو عبیدہؓ کی قیادت میں مسلمانوں کا لشکر رومیوں کے مضبوط مرکز لاذقیہ کی طرف بڑھا جمال ابو عبیدہؓ کا حسن تدبیر کام آیا اور اس شہر پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ پے در پے شکستوں سے قیصر روم تلملا اٹھا۔ اس نے اپنے تمام مقبوضات سے فوجیں طلب کر کے انطاکیہ میں جمع کر لیں۔ اب یہ رومی لشکر تقریباً دو لاکھ فوجیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے مقابلے کے لیے مسلمانوں نے بھی شام کے مختلف شہروں سے فوجیں بلوائیں اور ساتھ ہی مدینے سے کمک طلب کر لی۔ شام میں موجود مسلمان فوجیں دریائے یرموک کے کنارے ایک مقام پر جمع ہو گئیں۔ اسی عرصے میں مدینے سے کمک بھی آ پہنچی لیکن اب

ابو بکر صدیقؓ نے اس صورت حال کا بغور جائزہ لیا اور اپنے چند مقتدر اور صاحب الرائے ساتھیوں کے مشورے سے طے کیا کہ شام کو من مانیوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ فرست صدیقی یہ گوارہ نہیں کر سکتی تھی کہ شام کے مختلف علاقوں سے رومی اپنی طاقت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو مرعوب کرتے رہیں۔ چنانچہ ابو بکر صدیقؓ نے شام پر مختلف اطراف سے لشکر کشی کا ایک نظویل سلسلہ شروع کیا۔ کئی لشکر ترتیب دیے اور ان کے امیروں کو ہدایت کی کہ اگر میدان جنگ میں کبھی سب کو یکجا ہونا پڑے تو ابو عبیدہ بن الجراحؓ ان کے سپہ سالار اعلیٰ ہوں گے۔

ابو عبیدہؓ اپنے مختصر لشکر کے ساتھ شام میں داخل ہوئے تو انہوں نے رومی جنگ بازوں کو ہر جگہ جنگ کے لیے تیار پایا۔ اس کے باوجود وہ بھڑائی اور ماب کو تسخیر کرتے ہوئے جابیہ پہنچ گئے اور وہاں سے رومیوں کی زبردست جنگی تیاریوں کے بارے میں ایک تفصیلی خط مدینے روانہ کیا۔ خط ملتے ہی ابو بکر صدیقؓ نے امدادی فوج بھیجنے کا اہتمام کیا۔ سیف اللہ خالد بن ولیدؓ کو حکم دیا کہ فوراً عراق سے شام پہنچیں۔ ارد گرد کے دوسروں محاذوں پر یزید بن ابی سفیانؓ، شریحیل بن حسنہؓ اور عمرو بن العاصؓ کو بھی اپنے اپنے لشکر لے کر ابو عبیدہؓ کے پاس جانے کی ہدایت کی۔ یہ سب لشکر جابیہ پہنچ گئے تو ابو عبیدہؓ نے اجنادین کا رخ کیا جمال رومیوں کا ایک بہت بڑا لشکر مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اجنادین کے قریب فریقین کے درمیان گھسان کا رن پڑا اور بالآخر رومیوں کی عددی قوت مسلمانوں کے جوش جہاد کے آگے سرنگوں ہو گئی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ جب یہ خبر مدینے پہنچی تو میں صدقات اور خیرات کی تقسیم کے سلسلے میں خلیفہ اسلام کی خدمت حاضر تھا۔ یہ خوشخبری سننے ہی انہوں نے باوا بلند اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور سجدہ شکر جلائے۔ اس عظیم الشان، تاریخی کامیابی پر سارے مدینے میں جیسے خوشیوں کی بارش ہو گئی۔

وہاں اس جگہ نماز پڑھی جہاں آج کل مسجد عمر ہے۔ اس موقع پر خلیفہ دوم کے حکم پر میں نے مدت کے بعد اذان دی جس کی تفصیل میں آپکو بتا چکا ہوں۔ اس وقت میں معرکہ شام کے چند غازیوں اور شہیدوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

حدیبیہ میں قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو ہمارے شانہ بشانہ اس جہاد میں شریک تھے۔ ان کے علاوہ دشمن اسلام ابو جہل کے بھائی حارث بن ہشام اور اس کے بیٹے عکرمہ بھی تھے اور ہر معرکہ میں ایسی جان بازی سے لڑے کہ قبول اسلام کا حق ادا کر دیا یہ تینوں فتح مکہ کے بعد اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ایک معرکہ میں تو عکرمہ رومیوں کے صفوں میں اتنی دور تک چلے گئے کہ سارا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ ان کے ساتھیوں نے کہا:

”عکرمہ خدا کا خوف کرو، یوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ جوش جا لیکن اس کو ہوش پر غالب نہ آنے دو۔“

عکرمہ نے لڑتے لڑتے جواب دیا:

”میں لات و عزیٰ کی خاطر جان پر کھیلا کرتا تھا۔ آج اللہ اور رسول کے لیے جان پر

نہ کھیلوں۔ خدا کی قسم ایسا ہرگز نہ ہوگا۔“

جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑتے لڑتے عکرمہ نے جنگ یرموک میں شہادت کا درجہ

حاصل کیا۔

ان کے چچا حارث بن ہشام مکہ میں تھے کہ عمر فاروق نے انہیں خط لکھ کر جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے مردانہ وار لبیک کہا اور مجاہدین میں شامل ہو کر شام پہنچ گئے۔ کئی خون ریز معرکوں میں سرفروشانہ حصہ لیا اور اپنے بھتیجے عکرمہ کے ساتھ جنگ یرموک میں شہادت پائی۔

سہیل بن عمرو نے غزوہ حنین کے بعد جہانہ میں اسلام قبول کیا اور اس عہد کے

بھی ہماری تعداد تیس اور چالیس ہزار کے درمیان تھی۔

رومی نہایت بے جگری سے لڑے، بار بار مسلمانوں پر حملے کیے اور ایک بار تو ہماری فوجوں کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب بھی ہو گئے لیکن اہل ایمان کی سرفروشی اور مہارت جنگ نے صورت حال کو سنبھال لیا اور اس غضب کا جوابی حملہ کیا کہ رومی لشکر میں افزائی فری پھیل گئی۔ ان کے تقریباً ستر ہزار آدمی مارے گئے اور جو زندہ بچے، وہ بھاگ نکلے۔ خود قیصر روم جان چاکر قسطنطنیہ چلا گیا۔

یرموک کی فتح کے بعد ابو عبیدہ قنترین، حلب اور انطاکیہ کو تسخیر کرتے ہوئے بیت المقدس پہنچے گئے۔ عمرو بن العاص نے پہلے ہی اس شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ابو عبیدہ کا لشکر بھی بیت المقدس جا پہنچا تو نصاریٰ نے اس شرط کے ساتھ صلح کی درخواست کی کہ مسلمانوں کے امیر المومنین بہ نفس نفیس بیت المقدس آئیں اور صلح کے معاہدے کی تکمیل کر کے اپنے ہاتھوں سے کلید شہر وصول کریں۔ ابو عبیدہ نے خلیفہ ثانی کو نصاریٰ کی اس شرط سے مطلع کیا تو عمر فاروق چند مہاجرین اور انصار کے ہمراہ بیت المقدس کے لیے روانہ ہو گئے۔

ابو بکر صدیق کے کہنے پر میں نے جہاد کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ان کی زندگی میں میں نے ان کی خواہش کا پورا پورا احترام کیا۔ انہوں نے وفات پائی تو عمدہ فاروقی میں مجھے جہاد کی اجازت مل گئی۔ میں نے فوراً رختِ سرباندا ہا اور جہاد شام میں حسبِ مقدور حصہ لیا۔ عمر فاروق جابیہ کے مقام پر پہنچے تو ابو عبیدہ، خالد بن ولید، یزید بن ابی سفیان اور فوج کے دیگر افسران نے ان کا استقبال کیا۔ میں بھی ان کے خیر مقدم کے لیے وہاں موجود تھا۔ عیسائیوں کے نمائندے بھی جابیہ پہنچ گئے، معاہدہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور اس پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔ اس کے بعد عمر فاروق جابیہ سے چل کر بیت المقدس پہنچے اور



ساتھ کہ جس قدر مشرکین کے ساتھ مل کر جنگ کی ہے اسی قدر اب مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جنگ کروں گا اور جتنا مال مشرکین پر خرچ کیا ہے اس سے دگنا مسلمانوں پر خرچ کروں گا۔ وہ بھی کمال شجاعت سے لڑتے ہوئے جنگ یرموک میں شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔

ابو عبیدہ بن الجراحؓ نہ صرف فاتح شام تھے بلکہ ان کے اور بھی کئی اعزاز ہیں۔ انہیں زبان رسالت سے امین الامت کا بے مثال لقب عطا ہوا۔ وہ سابقون الاولون، مہاجرین اولین، اصحاب بدر، عشرہ مبشرہ اور اصحاب الشجرہ میں سے ایک تھے۔ ان کا اصل نام عامر تھا مگر شہرت اپنی کنیت، ابو عبیدہ سے پائی۔ چہرہ نورانی، دراز قد، صاحب سیف و علم، بڑی پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ سارے شام میں عموماً اور دمشق میں خصوصاً جگہ جگہ قائم اسلامی درس و تدریس کے حلقے ایک خاص علمی فضا جو آپ دیکھ رہے ہیں اور یہ سارے مدرسے جن میں صحابہ کرامؓ لوگوں کو قرآن حکیم کی تعلیم دیتے اور فقہی مسائل سمجھاتے ہیں، یہ سب کچھ ابو عبیدہؓ ہی کا فیضان ہے۔

مجھے یاد ہے نو جبری میں نجران سے اسلام کی سن گن لے کر ایک وفد مدینے آیا تھا۔ انہوں نے رسول پاکؐ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام قبول کیا تو حضورؐ نے انہیں دینی تعلیمات پر بہتر طور پر روشناس کرانے کے لیے ابو عبیدہؓ کو ان کے ساتھ نجران بھیجا دیا تھا۔ اس موقع پر رسالت مآبؐ نے ان کے علم کے پیش نظر امین الامت کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا۔ نجران میں ان کا تدریسی سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ اسی رعایت سے بیت المقدس کی فتح کے بعد عمر فاروقؓ نے انہیں سارے شام کا والی مقرر کر دیا جہاں انہوں نے اپنے سابقہ تدریسی تجربے کی روشنی میں جگہ جگہ اسلامی درس گاہیں قائم کر دیں جن کے طفیل دمشق آج کل علم کا مرکز بنا ہوا ہے۔

## حضورؐ کی خدمت میں

میں نے امیہ کے ظلم سے چھٹکارا پانے کے بعد خود کو ہمہ تن رحمت عالم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہ میری سعادت تھی کہ دکھ میں سکھ میں، سفر میں حضر میں، زہد میں فقر میں، فتح میں شکست میں، رزم میں بزم میں، یس ہمیشہ اُن کی خدمت میں حاضر، اُن کی شخصیت کے سحر میں گم، اُن کی ذات کے مقناطیسی دائرے میں، اُن کے لب و لہجہ کی ہر جنبش میں اپنے لئے احکام کی تلاش کرتا رہتا تھا۔ ہر لمحہ میری یہ کوشش رہتی تھی کہ نظریں ان کے روئے مبارک پر جمی رہیں۔ اُن کی شخصیت، اُن کا کردار، اُن کی تعلیم عالم انسانیت پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھی۔ وہ صداقت، وجاہت، ذہانت، شرافت، شجاعت، استقامت، امانت، سخاوت، فصاحت، بلاغت، وقار، انکسار اور عالی ظرفی کا اتنا حسین مرقع تھے کہ انہیں اَحْسِنَ تَقْوِيْمٍ کی دلیل کہا جاسکتا ہے۔ ہر خوبی بدرجہ اتم اور ساری صفات آپس میں اس میزان کے ساتھ گندھی ہوئی کہ اُن کی دید ہی اُن کی صداقت کی شہادت تھی۔ عبد اللہ بن

گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پر دی ہو، نہ کو تاہ سخن نہ فضول گو۔ مخدوم و مطاع ایسے کہ ان کے رفتی ان کے منہ سے بات نکلتے ہی تعمیل کے لئے جھپٹ پڑتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ عبداللہ بن رواحہ نے آپ کے جمالِ جہاں آرا کی کیفیت اپنے ایک شعر میں یوں بیان کی:

”یا رسول اللہ! اگر آپ میں کھلی ہوئی نشانیاں نہ بھی ہوتیں  
تب بھی آپ کا روئے انور خیر رسالت دینے اور آپ کو رسول برحق  
ثابت کرنے کے لئے کافی تھا۔“

روزمرہ زندگی کے اصول یہ تھے کہ مکان رہنے کے لئے ہے، لباس ستر پوشی کے لئے اور غذا زندہ رہنے کے لئے۔ کچھ بھری رغبتمیں بھی تھیں لیکن شانِ رسالت نے کسی کو گلے کا ہار نہیں بنایا۔ موسم، تمدنی مروجات اور وضو نماز کی ضروریات کے پیش نظر جو میسر آ گیا، پہن لیا۔ لباس کو اظہارِ امارت کا ذریعہ بنایا نہ اعلانِ رہبانیت کا۔ اسی طرح غذا سے بھی نہ بلاوجہ اجتناب برتا نہ اسے لذتِ کام و دہن کا وسیلہ بنایا۔ یہی حال سفر کا تھا۔ موقع کی مناسبت سے جو سواری مل گئی استعمال کر لی۔ چنانچہ خچر، گھوڑے، گدھے، لونٹ سبھی زیر استعمال رہے۔ رہنے کے حجرے بھی ضرورت کے مطابق۔ ان میں کسی اصراف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ پتھر گارے سے بنے ہوئے، دس بارہ فٹ لمبے اور آٹھ دس فٹ چوڑے حجرے جن کی چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ کھڑے ہوں تو چھت کو ہاتھ لگ جائے۔ ایک مرتبہ عائشہ نے پتھروں کے کھر درے پن کو چھپانے کے لئے اپنے حجرے کی دیواروں پر کپڑا اتان دیا تو آپ نے فرمایا:

”عائشہ کپڑا اس لئے نہیں ہوتا کہ پتھروں کو پہنایا جائے۔“

عام لباس، سفید کرتا، سفید تہ بند، سر پر سفید عمامہ یا ٹوپی، شانوں پر سفید چادر جسے کبھی لپیٹ لیتے، کبھی داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال لیتے۔

سلام نے جب پہلی بار ان کو دیکھا تو معان کے منہ سے نکلا کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ قبیلہ تیم کے اور مہ اپنے بیٹے کو لے کر آئے تو انہیں دیکھتے ہی کہنے لگے کہ واقعی یہ اللہ کے نبی ہیں اور ایمان لے آئے۔ ایک مرتبہ مدینے میں ایک قافلہ وارد ہوا اور شہر سے باہر ٹھہرا۔ حضور کا اتفاقاً ادھر سے گزر ہوا تو انہوں نے قافلے والوں سے ایک اونٹ کا سودا کر لیا اور یہ کہہ کر اونٹ ساتھ لے آئے کہ قیمت بھجوادوں گا۔ بعد میں قافلے والوں کو تشویش ہوئی تو قافلے کی ایک معزز خاتون نے انہیں تسلی دی:

”مطمئن رہو۔ میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں کے چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ کبھی بد معا ملچی نہیں کرے گا۔ اگر وہ رقم نہ بھجوائے تو میں اپنے پاس سے ادا کردوں گی۔“

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں کہ مدینے سے رقم پہنچ گئی۔ یہ طارق بن عبداللہ کا قافلہ تھا جو مدینے سے کھجوریں خریدنے آیا تھا۔ بعد میں یہ لوگ شہر میں آئے۔ حضور سے ملے، لوگوں سے اسلام کے بارے میں کوئی سن گن لی اور مسلمان ہو گئے۔

میں نے ان سے زیادہ خوب رو کسی کو نہیں دیکھا۔ چہرے پر واقعی چاند کی سی چمک تھی۔ مسکراتے تو پیشانی پر روشنی بکھر جاتی اور آبِ دارِ دانتوں سے شعاعیں پھوٹتیں۔ معلوم ہوتا تھا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ پتلیاں سیاہ۔ پلکیں دراز، سر کے بال سیاہ، گنجان اور تھوڑے تھوڑے گھنگریالے۔ بدن مضبوط، گٹھا ہوا۔ قد درمیانہ مگر مائل بہ درازی۔ مجمع میں کھڑے ہوتے تو دوسروں سے قد ذرا نکلتا ہوا معلوم ہوتا۔ سینہ کشادہ، پیٹ ہموار، کلاسیاں چوڑی۔ ہتھیلیاں فراخ۔ تلوے اتنے خمیدہ کہ کھڑے ہوں تو نیچے سے پانی بغیر چھوئے گزر جائے۔ بو خزامہ کی ام معبڈ کے بقول دُور سے بھی دل فریب، قریب سے بھی کمال حسین۔ نہایت شیریں کلام، واضح الفاظ، کلام کی ویشی الفاظ سے مُترا،

ضرورت پڑنے پر تہ کر کے نکلیے بھی بنا لیتے۔ کوئی خاص ملاقاتی آتا تو اتار کر اُس کے بیٹھنے کے لئے بچھا دیتے جیسا کہ مجھے یاد ہے غزوہ حنین کے بعد جب اُن کی آیا حلیمہ سعدیہ کی دختر حذافہ عرف شیماء سعدیہ کی قیدی کی حیثیت سے اُن کے سامنے لائی گئی تو اُس کی عزت افزائی کے لئے انہوں نے اس کے بیٹھنے کے لئے اپنی چادر بچھا دی تھی۔ سفید کے علاوہ ہلکا سبز اور ہلکا پیازی رنگ بھی پسندیدہ تھا لیکن دھاریوں کی صورت میں۔ یمن کی نبی ہوئی ہلکے رنگوں والی دھاری دار چادریں اور ہلکے زرد اور نیلے رنگ کے لباس بھی پہنتے تھے۔ کپڑے نہ ڈھیلے رکھتے تھے نہ تنگ۔ نہ اُن کی لمبائی علامت کبر دکھائی دیتی تھی نہ کوتاہی رہبانیت کا پرچار۔ نئے کپڑے عموماً جمعے کے دن پہنتے تھے، فاضل جوڑے ہوا کر نہیں رکھتے تھے۔ کپڑے پھٹ جاتے تو پونڈ لگا لیتے تھے، لیکن صفائی اور نظافت کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔ یہی میانہ روی، یہی تقویٰ، یہی سادگی اُن کا مزاج تھی۔ کبھی کبھی تحفوں میں آئے ہوئے بہت قیمتی کپڑے بھی پہنے لیکن پسند نہیں فرمائے۔ ایک مرتبہ ستائیس اونٹنیوں کے بدلے ایک نہایت قیمتی جوڑا خرید کر پہنا۔ اُس میں نماز بھی پڑھی، پھر کسی کو تحفے میں دے دیا۔ یہ اس لئے کہ اچھے کپڑے سے اجتناب کہیں دین میں حجت ہی نہ بن جائے اور لوگ خواہ مخواہ چیتھڑے نہ لٹکائے پھر میں۔ وہ جہاں فضول خرچی سے روکنا چاہتے تھے وہاں یہ بھی خواہش تھی کہ لوگ جو گیوں، راہبوں اور سادھوؤں کی راہ پر نہ چل نکلیں۔ اصل مقصد یہ تھا کہ صاحب بصیرت، خوددار اور زیرک لوگوں کا ایک فعال، متحرک اور متوازن معاشرہ قائم ہو جائے۔

کر تا پہنتے تو پہلے دایاں ہاتھ آستین میں ڈالتے، جو تا پہنتے تو پہلے دائیں پاؤں میں۔ دائیں کروٹ سے لیٹتے اور سوتے وقت داہنار خسار دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر سوتے۔ کسی کو کوئی چیز دیتے تو دائیں ہاتھ سے، لیتے تو دائیں ہاتھ سے۔ دائیں ہاتھ کی فوقیت اور اچھے کاموں کے لئے داہنے ہاتھ کا استعمال اُن کی سکھائی ہوئی اسلامی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔

بائیں برس تک ان کی زندگی کے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُن کی حیات مبارکہ ایک ایسی معیاری اور مثالی زندگی تھی جس کی اقدار میں کوئی تضاد، کوئی خلفشار، کوئی پیچیدگی، کوئی الجھاؤ، کوئی ایہام، کوئی تضاد نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کی زندگی تھی جو اپنی خداداد تمیز طبعی کی بنا پر مزاج فطرت سے کامل مطابقت رکھتا تھا۔ جس کے احسانات، فطری طور پر، تمام خارجی عوامل کی طرف من حیث العلت رجوع کرتے تھے۔ ہر بات پر اُن کا رد عمل اس حد تک حسب معمول ہوتا تھا کہ غیر معمولی معلوم ہوتا تھا۔ جب کوئی حل طلب مسئلہ اُن کی خدمت میں پیش ہوتا تو اُن کے اطراف بیٹھے ہوئے ہم سب اپنے اپنے طور پر اُس کا حل سوچنے لگتے کہ اگر یہ مسئلہ ہمیں درپیش ہو تو ہم اسے کیسے سلجھائیں گے۔ صحابہ میں بڑے بڑے جید عالم، معاملہ فہم، جہاں دیدہ اور صاحبان عقل و دانش تھے اور مجھ جیسے کو تاہ فہم بھی۔ ہم سب اپنی دانست میں مسئلے کا بہترین حل دریافت کرتے مگر جب وہ فیصلہ صادر کرتے تو ہمیں اپنے حل نہایت سطحی، چمکانہ اور نامناسب معلوم ہونے لگتے۔ ہم سب کو یہ لگتا کہ انہی کا فیصلہ مناسب ہے۔ بالکل سادہ سا فیصلہ ہوتا، بالکل سامنے کی بات لیکن وہی سادہ سی بات اُن کے بنانے سے پہلے کسی کو نہ سوجھتی۔ ہماری مجموعی فراست بھی اُن کے سامنے بچھ ہوتی تھی۔ اپنی ان گنت دینی اور دنیوی مصروفیات اور ذمے داریوں کے باوجود وہ کبھی اُن کے بوجھ تلے دبے نہیں دکھائی دیتے تھے۔ مزاج میں بردباری اور سنجیدگی کے پہلو بہ پہلو شگفتگی کا عنصر ہمیشہ نمایاں رہتا تھا۔

تین ہجری کی بات ہے۔ بعوفظان کے ارادے کچھ نیک نہیں لگتے تھے۔ آئے دن خبریں ملتی رہتی تھیں کہ وہ ہمارے خلاف مہم جوئی کی تیاری کر رہے ہیں۔ خطرہ بڑھ گیا تو حضورؐ، مدینے میں عثمانؓ کو قائم مقام بنا کر پانچ سو مسلمانوں کے ساتھ اُن کی سرکوبی کے لئے پہنچ گئے۔ بعوفظان کو بھی کسی نے اطلاع دے دی اور وہ ہماری آمد سے پہلے ہی پہاڑوں کی

جاہز نے کہا یہ کم ہے تو حضورؐ مسکرائے:

”اچھا چلو دو درہم“

جاہز نے پھر کہا کم ہے تو حضورؐ مسکرا مسکرا کر رقم بڑھاتے گئے اور بالآخر چالیس درہم پر بات ختم ہو گئی۔

مدینے پہنچ کر اگلے دن میں نماز فجر کے بعد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضورؐ کے دروازے پر جاہز کا اونٹ بندھا ہے اور حضورؐ جاہز سے فرما رہے ہیں کہ جاؤ دور کعت نفل پڑھ کر آؤ۔ جاہز چلے گئے تو حضورؐ نے مجھے ارشاد فرمایا:

”بلال جلاؤ چالیس درہم کے برابر سونا تول کر جاہز کو دے دو اور ہاں پلڑا ذرا نیچا رکھنا“ میں سونا تول کر لایا تو اتنے میں جاہز بھی آگئے۔ وہ سونا میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے سونا سنبھال لیا اور رخصت چاہی۔ دو چار ہی قدم گئے ہوں گے کہ حضورؐ نے انہیں واپس بلایا اور فرمایا:

”ارے جاہز اپنا اونٹ یہیں بھولے جا رہے ہو“

یوں جاہز سونا بھی لے گئے اور اپنا اونٹ بھی۔ حضورؐ اکثر صحابہ سے اس قسم کا التفاف فرماتے رہتے تھے۔

گفتگو میں الفاظ نہایت ٹھہر ٹھہر کے ادا کرتے۔ تاکید کے لئے کلمات تین بار دہراتے تھے۔ زبان نہایت معیاری ہوتی۔ کبھی کوئی عامیانه محاورہ یا بازاری لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ بات کرتے وقت اکثر چہرے پر مسکراہٹ رہتی۔ ایک مرتبہ عبداللہ بن حارث نے کہا تھا کہ میں نے محمدؐ سے زیادہ مسکراتے کسی کو نہیں دیکھا۔ بات کی وضاحت کے لئے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشاروں سے بھی مدد لیتے تھے۔ کسی سمت اشارہ کرتے تو پورا ہاتھ حرکت میں لاتے تھے۔ وہ انصاف العرب تھے۔ فصاحت زبان و بیباں کے ساتھ ساتھ حسن

طرف بھاگ نکلے۔ حضورؐ نے واپسی کا حکم دیا۔ ربیع الاول کی درمیانی تاریخیں تھیں، موسم نہایت خوشگوار۔ حضورؐ نے خود سب سے پیچھے چلنے کا فیصلہ فرمایا۔ جاہز بن عبداللہ ویسے تو فوج کے ساتھ تھے مگر ان کا اونٹ اتنا ضعیف اور لاغر تھا کہ وہ پیچھے رہ گئے اور ہماری ٹولی سے آن لے۔ یہاں بھی وہ پیچھے رہے جاتے تھے۔ حضورؐ نے دو ایک مرتبہ یہ صورت دیکھی تو جاہز سے کہا:

”ذرا نیچے اترو اور اونٹ کو بٹھاؤ“

جاہز نے تعمیل کی۔ خود بھی حضورؐ قصواء سے نیچے اترے اور جاہز کے ہاتھ سے ہانکنے کی چھڑی لے کر ان کے اونٹ کو آہستہ آہستہ تین چار چھڑیاں ماریں اور پھر جاہز کو سواری کے لئے کہا۔ اب جو جاہز کا اونٹ چلا تو اتنا تیز کہ ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔

اگلے پڑاؤ پر نماز مغرب کے بعد جاہز، حضورؐ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ یہ عطفان کے آئندہ اقدام پر خیال آریاں ہو رہی تھیں کہ اچانک حضورؐ نے فرمایا:

”جاہز میں تمہارا اونٹ خریدنا چاہتا ہوں“

جاہز نے کہا:

”آپ کی نذر ہے“

حضورؐ نے فرمایا:

”نہیں۔ میں اسے قیمتاً خریدنا چاہتا ہوں“

میں حیران تھا کہ یہ جاہز کے اونٹ کا کہاں سے ذکر آ گیا اور اس میں خریدنے کی کون سی بات تھی۔ نجیف و نزار اپنی جان سے بیزار کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ جاہز نے پھر اپنی پیشکش دہرائی تو رسول کریمؐ نے فرمایا:

”نہیں جاہز نہیں۔ مجھ سے سودا کرو۔ تمہارا اس کے لئے ایک درہم ٹھیک رہے گا“

گفتار، لہجے کی شانگنی، آواز کی مٹھاس اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پر ودیناؤں کی گفتگو کی امتیازی شان تھی۔ مثال کے طور پر:

أَعْقِلْ وَاكُلْ (پہلے عقل استعمال کرو پھر توکل کرو)

أَسْلِمُهُ تَسْلِيمَهُ (اسلام لاؤ اور سلامتی پاؤ)

أَمَّا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (اعمال نیتوں پر منحصر ہیں)

الْحَرْبُ خِدْعَةٌ (جنگ چالوں سے لڑی جاتی ہے)

أَلَّا نَحْمِيَّ الْوُطَيْئِسُ (اب تندور گرم ہوا)

الْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ (مجالس کے لئے امانت داری لازم ہے)

مَنْ لَا يَرْحَمُهُ، لَا يَرْحَمُهُ (جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اُس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا)

سَيِّدُ الْقِيَوْمِ خَادِمُهُ (قوم کا سردار وہ ہے جو اس کی خدمت کرے)

كُلُّ ذِي نِعْمَةٍ مَحْسُودٌ (ہر نعمت پانے والے سے حسد کیا جاتا ہے)

بعثت کے چوتھے سال میں جب تبلیغ دین کا حکم ہوا تو آپ ایک دفعہ مجھے اور ابو بکرؓ

کو ساتھ لے کر عکاظ کے میلے میں گئے۔ یہ عربوں کا قومی میلہ تھا جو ہر سال مکہ میں لگتا تھا اور

اس میں شرکت کرنے کے لئے عرب کے گوشے گوشے سے لوگ آتے تھے۔ ایک جگہ

لوگوں کا اجتماع دیکھا تو اللہ کے رسولؐ نے انہیں دعوتِ حق دینے کی کوشش کی۔ یہ دیکھتے ہی

مشرکین کے ایک حتمِ غفیر نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور اُن کی باتوں کا اس قدر

مذاق اڑایا کہ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکے۔ ہم دونوں اندر ہی اندر چیخ و تاب کھا رہے تھے مگر بے بس

تھے۔ قبیلہ بنو سلیم کا ایک جوان سال بدوی اس سارے طوفانِ بد تمیزی میں حضورؐ کے صبر و تحمل

سے اس درجہ متاثر ہوا کہ ہجوم کے چھٹ جانے کے بعد وہ اُن کے پاس آیا اور اُن کی دعوت کی تفصیل

جاننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس موقع پر حضورؐ کو اُس بدوی کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ سنیے:

بدوی۔ کیسا ایمان افضل ہے۔؟

حضورؐ۔ جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے۔

بدوی۔ اے اللہ کے رسول میں بھی آپ پر ایمان لاتا ہوں۔

حضورؐ۔ آج کل ہم لوگ مظالم کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ ان کا برداشت کرنا تمہاری

طاقت سے باہر ہے۔ فی الحال اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔ جب اسلام کا غلبہ ہو

جائے تو میں جہاں ہوں وہاں آجاتا۔

یہ خوش نصیب بدوی عمر بن عبسہ تھے اور اُس عظیم ماں کے فرزند تھے جن کے

بطن سے جلیل القدر صحابی ابوذر غفاریؓ پیدا ہوئے تھے۔ جو خود بھی کم و بیش اسی آن بان سے

اسلام لائے تھے۔ اُس خوش خمت خاتون کا نام رملہ بنت وقیعہ تھا۔ عمرو قحطکہ سے کچھ عرصہ

قبل مدینے آئے اور قحطکہ پر جانے والی سپاہ میں شریک ہوئے۔

علیؑ نے ایک مرتبہ آپ سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنے ذاتی مسلک کے

بارے میں بتائیں تاکہ سب کی رہبری ہو۔ اس کے جواب میں آنحضرتؐ نے اپنے فکر و عمل کی

اتنی جامع وضاحت فرمائی کہ اُس کا ایک ایک لفظ ہم سب کو ازبر ہو گیا۔ مجھے وہ ارشاد آج بھی

یاد ہے:

”عرفان میرا سرمایہ ہے، عقل میرے دین کی اساس ہے، محبت میری بنیاد ہے،

شوق میری سواری ہے، ذکرِ الہی میرا سرمایہ ہے، اعتماد میرا خزانہ ہے، نخوت میرا رینق ہے،

علم میرا ہتھیار ہے، صبر میرا لباس ہے، اللہ کی رضا میری سعادت ہے، عجز میرا اعزاز ہے،

زہد میرا پیشہ ہے، یقین میری طاقت ہے، صدق میری سفارش ہے، طاعت میرا دفاع ہے،

جماد میرا کردار ہے اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔“

## گھلی کتاب

اللہ کے آخری پیغمبرؐ کی حیاتِ طیبہ ایک بین الانسانی مشن کی داستان ہے اور اُن کا لایا ہوا صحیفہ، لہدی اصولوں کی کتاب ہے جسے عمل کی زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔ ولادت سے لے کر وفات تک اُن کی کوئی بات، کوئی عمل کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اُن کو لوگوں نے ہر حال میں دیکھا ہے۔ چمن میں، جوانی میں، ادھیڑ عمر میں، ضعیفی میں، تنگدستی میں خوش حالی میں، فتح میں، شکست میں، صحت میں، بیماری میں، اختیار میں، بے اختیاری میں، شوہر کی حیثیت سے، باپ کی حیثیت سے، گھر کے چھوٹے فرد کی حیثیت سے، تاجر کی حیثیت سے، قائدِ انقلاب کی حیثیت سے، منصف و عادل کی حیثیت سے، فرماں روئے حکومت کی حیثیت سے۔ جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے آج تک کسی پیشوا، کسی شاہ، کسی شہنشاہ، کسی پیغمبر، کسی بھی انسان کی زندگی کے بارے میں اتنی تفصیل موجود نہیں ہے۔ اُن کی زندگی کے ایک دن کا ایک لمحہ محفوظ ہے۔

کام کاج میں لگے ہوں اور وہ سب سے آخر میں بادشاہوں کی طرح خواب گاہ سے باہر نکلیں۔  
لیکٹ دفعہ ابن مسعود نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ ایک ابھنی اُن کے پاس حاضر ہو اور اُس نے  
جیسے ہی گفتگو شروع کی تو اُس پر کچکی طاری ہو گئی۔ آپ نے اُسے حوصلہ دیتے ہوئے فرمایا:  
”گھبراؤ مت، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو ایک ایسی ماں کا بیٹا  
ہوں جو خشک گوشت کھایا کرتی تھی۔“

حضور ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ ز اور مادہ  
کھجوروں کے خوشے ملا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا  
ہم اسی طرح کیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید تمہارے لئے بہتر ہو۔  
چنانچہ لوگوں نے اُس سال مادہ کھجوروں کے پھولوں میں ز کھجور کے پھولوں کے ڈٹھل  
رکھنے چھوڑ دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فصل بہت کم ہوئی۔ جب لوگوں نے آپ سے اُس کا تذکرہ  
کیا تو آپ نے فرمایا:

”میں تو ایک انسان ہوں۔ جب تمہیں کوئی دین کی بات بتاؤں تو مان لیا کرو۔ جب  
اپنی رائے سے کچھ کموں، تو یاد رکھو میں محض ایک انسان ہوں۔“

اُن کی قیادت محبت کی قیادت تھی۔ وہ شفقت اور پیار سے لوگوں کو تعلیم دیتے  
تھے۔ اُن کا طریقہ یہ تھا کہ وہ سب کی سنتے تھے اور پھر مشورے کے انداز میں اُنہیں نیک و بد  
سمجھا دیتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں کیا کہ محض حکم دے کر فارغ ہو گئے ہوں۔ اُن کے مزاج  
میں شرمیلا پن تھا۔ اس لئے گفتگو میں پہل بہت کم کرتے تھے۔ اگر ضروری بھی ہوا تو نہایت  
مہذب اور شائستہ انداز میں، ہزار حسن و لطافت اور تکلفات کے ساتھ۔ محفل میں کبھی کوئی  
بات چھڑ جائے تو اُسے اس انہماک سے سنتے تھے جیسے کوئی نوجوان بڑوں کی باتیں سن کر کچھ  
سیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کسی سے اختلاف کرتے تھے تو کبھی سخت لہجہ اختیار نہیں کرتے

محمدؐ ایک کھلی کتاب کی طرح سب کے سامنے تھے۔ ہر ادنیٰ، ارفع کے دائرہ فہم  
میں، سب کی نظروں کے سامنے۔ اُن سے ہر وقت ملا جا سکتا تھا۔ مدینے کی گلیوں کو چوں میں  
لوگ اُن سے سلام دُعا لیتے، مصلحے کرتے، معافی کرتے۔ وہ خود سلام میں پہل کرتے،  
سب کی خیریت دریافت کرتے، لوگوں کے گھروں میں بہمار پڑسی کے لئے جاتے۔ گلیوں  
میں کھیلتے ہوئے بچوں سے باتیں کرتے، غریب غربا کے دکھ سنتے، سب سے برابر کی سطح پر  
ملتے۔ نہ کسی سے کوئی خصوصیت برتتے، نہ اپنے لئے کوئی خصوصیت چاہتے۔ کوئی پکارتا تو  
'بلبیک' یعنی میں حاضر ہوں کہہ کر جواب دیتے۔ خطاب کرنے والے کی جانب سے اُس وقت  
تک رُخ نہ پھیرتے جب تک کہ وہ خود منہ نہ پھیرے۔ کسی کو کوئی پیغام بھجاتے تو سلام  
ضرور کھلاتے۔ کسی کا سلام اُن تک پہنچایا جاتا تو کھینچنے والے اور لانے والے دونوں کو الگ الگ  
سلام کتے۔ نماز میں بھی کوئی سلام کتا تو اشارے سے جواب دے دیتے تھے۔

ایک دفعہ حضورؐ صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ کسی نہایت سنجیدہ موضوع پر گفتگو ہو  
رہی تھی کہ ایک نیم پاگل خاتون، جس کے مرض سے سبھی واقف تھے، آئی اور اصرار کیا کہ  
حضورؐ تخلئے میں اُس کی بات سنیں۔ حضورؐ نہایت خندہ پیشانی سے اُٹھے اور اس کے ساتھ باہر  
گلی میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد اُس کی بات سن کر آگئے۔ مجھے اور ارفعؓ نے بتایا کہ اس سے پہلے  
بھی وہ دو دفعہ اپنی بے معنی باتیں سنانے کے لئے حضورؐ کے پاس آچکی ہے مگر حضورؐ کسی کی  
دلازاری نہیں کرتے تھے۔

صبح اذان سے پہلے میں انہیں بیدار کرنے کے لئے اُن کے دروازے پر دستک دیتا  
تھا۔ وہ خود باہر تشریف لاتے، اکثر آنکھیں ملتے ہوئے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کبھی کبھی  
صبح کے دھندلکے میں وہ پاؤں سے ٹٹول ٹٹول کر اپنی چپل تلاش کرتے تھے۔ بالکل عام آدمی  
کی طرح۔ اُن کی صبحوں کا یہ دستور نہ تھا کہ تمام اہل خانہ اور خدام اُن کے اٹھنے سے پہلے اپنے

تھے۔ اُن کے جو بات مختصر ہوتے تھے لیکن وہ اس لئے کہ اُن کے سوچنے کی رفتار بہت تیز تھی اور شاید اس لئے بھی کہ ان کے ارشادات میں افراط و تفریط کی گنجائش نہ پیدا ہونے پائے۔

اُن پر وحی ضرور آتی تھی لیکن وہ اپنی رائے کو دوسروں کی رائے سے نہ کم تر سمجھتے تھے نہ برتر لیکن ہم جو جانتے تھے وہ جانتے تھے۔ ہمیں ہمیشہ اُن کی فوقیت کا پورا پورا ادراک رہتا تھا۔ اُن کی زباں سے جو لفظ نکلتا، اس قدر پاکیزہ، اس قدر معقول ہوتا تھا کہ وہ ہمارے لئے حکم اور قانون کا درجہ رکھتا تھا۔

بعض دفعہ جب وہ محسوس فرماتے کہ اُن کے احترام میں غلو سے کام لیا جا رہا ہے تو رنجیدہ ہو جاتے اور خاصی خاصی دیر تک گرمی سوچ میں مستغرق رہتے۔ اُن کو اس کیفیت میں دیکھ کر ہم پر اُن کے جلال کی ہیبت طاری ہو جایا کرتی تھی جسے ہم مختلف سوالوں اور ہلکی پھلکی باتوں میں چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ بہت پریشان ہو جایا کرتے اور فرمایا کرتے تھے:

”میں محض انسان ہوں، محض انسان ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ اللہ

نے میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔“

وہ ہم میں ہر ایک سے بلند مرتبے پر فائز تھے لیکن ان کے گھر میں دنیوی مال و متاع عام لوگوں سے بھی کم تھا۔ انہیں اپنے اوپر نہ سختی کرنے کا شوق تھا نہ فاقہ کشی کا۔ اگر کسی رات بھوکے سو رہے تو محض اس لئے کہ انہوں نے اپنا کھانا کسی اور کو دے دیا جو اُن کے خیال میں اُن سے زیادہ بھوکا تھا۔

آج ہم جن باتوں کو اپنے قوانین کہتے ہیں، وہ اُن کا معمول تھیں۔ ہمارا قانون بنا ہی اُن کے حسن عمل کے نمونوں سے ہے۔ ہم اُن کی زبان سے نکلے ہوئے تقریباً ہر لفظ کو یاد کر

لیا کرتے تھے۔ بہت کم کلمات ہوں گے جو محفوظ نہ رہے ہوں۔ اکثر آپس کی گفتگو میں ہم اُن کی باتوں کا اعادہ کیا کرتے تھے۔ اسی اہتمام کی بدولت آج خدا کے فضل سے ہزاروں افراد ہیں جو اُن کی احادیث کے عالم ہیں۔

محمدؐ کبھی انسان کے عام فہم دائرے سے باہر بات نہیں کرتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبیؐ تھے اور رہتی دنیا تک کل عالم انسانیت کی ہدایت اور رہبری پر مامور تھے۔ اُن کی گفتگو میں، اُن کے عمل میں، اُن کے احکامات اور تعلیمات میں ایہام ممکن نہیں تھا کیونکہ اُن کے بعد منشاء الہی کی مزید توضیح کے لئے کوئی اور پیغام نہیں آتا تھا۔

ایک روز سرور کائناتؐ اپنے حجرے میں آرام فرما رہے تھے۔ میں حجرہ مبارک کے باہر اپنے گرتے کے دامن کو پیوند لگا رہا تھا کہ ایک انصاری خاتون زینبؓ آئیں اور مجھ سے کہا حضورؐ سے یہ دریافت کر دو کہ میں اپنا صدقہ اپنے دیور کے یتیم بچوں کو دے سکتی ہوں یا نہیں۔ میں اندر جانے کے لئے اٹھنے ہی لگا تھا کہ ایک اور خاتون تشریف لے آئیں۔ اتفاق سے اُن کا نام بھی زینبؓ ہی تھا، عبد اللہ ابن مسعودؓ کی بیوی۔ مزید اتفاق یہ کہ وہ بھی وہی مسئلہ دریافت کرنا چاہتی تھیں۔ وہ بھی اپنا صدقہ اپنے کسی غریب عزیز کو دینا چاہتی تھیں۔ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور خواتین کا مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا وہ کون عورتیں ہیں۔ میں نے عرض کی عبد اللہ ابن مسعودؓ کی بیوی زینبؓ اور دوسری زینبؓ الانصاریہ۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا بے شک یہ صدقہ دینا درست ہے۔ اُن خواتین کو بتادو کہ اُنھیں ذہرا اجر ملے گا۔ ایک صدقے کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔

روزمرہ زندگی میں آپ نے اپنے لئے مساوات پسندی۔ کسی اعزازی سلوک کی نہ تمنا کی، نہ اجازت دی۔ نہ مجالس میں نمایاں مقام پر نشست پسند کی۔ نہ یہ چاہا کہ لوگ اُن کے لئے تعظیماً کھڑے ہوں یا اُن کے لئے آقاؤں اور سرداروں جیسے القاب احترام استعمال



## زندگی اور یادیں

زندگی اور اُس کی یادیں۔ ایک ضعیف آدمی کا سب کچھ یہی ہوتا ہے۔ میں اپنی ذات میں تو نہ پہلے کبھی کچھ تھا، نہ آج ہوں۔ میرا کوئی ذاتی اعزاز نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھے صرف میرے دوستوں کے حوالے سے یاد کریں۔ کوئی میرے بارے میں پوچھے کہ بلال کون تھا تو اُسے صرف یہ بتادیا جائے کہ وہ محمدؐ کا صحابی تھا۔

میں نے ایسے وقتوں میں زندگی گزاری ہے جو اس کائنات کا بہترین دور تھا کیونکہ اس دور میں اللہ کا آخری نبیؐ اُس دنیا میں رونق افروز تھا۔ آئندہ کسی کو یہ سنہری دور نصیب نہیں ہوگا لیکن اُس دور کی عظمتوں کی شہادت ہر شخص کے پاس پہنچے گی۔

کوئی مجھے یہ اعزاز بھی نہ دے کہ میں بہت اچھا مؤذن تھا۔ ایک دفعہ تو میری غلطی سے حضورؐ سمیت سب کی نماز قضا ہو گئی۔ تبوک کا سفر تھا۔ ایک مقام پر رات زیادہ ہو گئی تو صحابہ نے عرض کیا کہ یہاں قیام کا حکم ہو جائے تو مناسب ہو۔ آنحضرتؐ نے فرمایا مجھے ڈر

کریں۔ کوئی غیر اگر ہماری مجلس میں آجاتا تو اُسے پوچھنا پڑتا کہ آپ میں محمدؐ کون ہے۔ ضمام بن ثعلبہؓ جب اُن سے ملنے کے لئے آئے تھے تو اُن کو یہی صورت درپیش تھی۔

کوئی مجھے پوچھے تو میں یہی کہوں گا کہ وحی کے علاوہ میں نے اُن میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جسے حدودِ بشریت سے ماوراء قرار دیا جاسکے یا جسے معجزہ کہہ سکیں لیکن اتنی ساری بشری خوبیوں کا جن میں سے ہر ایک خوبی بشری امکانات کی آخری حد تھی، ایک ذات میں یکجا ہو جانا جائے خود ایک معجزہ تھا۔ اُن کی یہ کاملیت سمجھ میں آنے کے باوجود ایک ایسا کرشمہ تھی کہ انسان دیکھے اور دیکھتا ہی رہے۔ سوچے تو سوچتا ہی جائے مگر اُس کی رفعتوں کو نہ پا سکے۔ وہ معجزہ تو نہیں تھے لیکن ایک بیش بہا نعمت ضرور تھے کہ اُن کو دیکھتے ہی بے ساختہ منہ سے نکلتا۔ فَبَايَ الْاٰلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذَّبَانِ .

اس پر رسالتِ آج نے دُعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ سردی کے اثرات کو اُن سے دور فرما دے۔ کچھ دیر کے بعد لوگ آگے تو جماعت ہوئی۔ نہ میری آواز کی بلندی کام آئی نہ اُس کی تاثیر۔ کام آئی تو حضورؐ کی دُعا۔

یوں بھی میری اذان کا معیار ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا تھا۔ کبھی تیز ہوا میں میرے الفاظ مجھے واپس لوٹا دیتیں۔ کبھی صبح کی خنکی کی وجہ سے میرے گلے میں خراش ہو جاتی۔ کبھی کبوتر مجھے پریشان کرتے۔ صرف یہ یاد رکھئے گا اور اہالیانِ عرش بھی یہ بات نہ بھولیں کہ رسولِ کریمؐ نے ایک بار فجر کی نماز کے وقت ارشاد فرمایا تھا:

”میں جنت میں سب سے پہلے داخل کیا جاؤں گا اور میرے ناتنے کی مہارت تھامے بلال مجھ سے آگے آگے پیدل چل رہا ہوگا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور فرمایا:

”بلال! میں نے جنت میں تمہارے قدموں کی چاپ اپنے آگے سنی ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارا کون سا عمل ہے جس پر تمہیں ثواب کی سب سے زیادہ توقع ہے۔“

میں خاکسار بھلا کیا جواب دیتا۔ مؤدبانہ عرض کیا:

”یا رسول اللہ، میرا ایسا عمل تو کوئی نہیں ہے۔ البتہ دن رات میں، میں نے کوئی وضو ایسا نہیں کیا، اور کوئی اذان ایسی نہیں دی جس کے بعد میں نے شکرانے کے دو نفل نہ ادا کئے ہوں۔“

حضورؐ نے تبسم فرمایا اور مجھے دُعا دی۔

آج میں اپنے گرد نظر دوڑاتا ہوں، پُرانے ساتھیوں میں سے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں اور جو باقی ہیں انہیں بھی، مجھ سمیت، یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ موت کی آرزو کرنا

ہے کہیں نیند ہمیں نمازِ فجر سے نہ عاقل کر دے۔ مجھے اپنی سبب بیداری پر بڑا اعتماد تھا۔ میں نے سب کو صبح وقت پر جگانے کا ذمہ لے لیا۔ پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ مجھے راتوں کو جاگنے کی عادت تھی۔ اُس رات مزید احتیاط کے لئے میں کجاوے پر ہی ٹیک لگائے، آسمان پر پھیلے ستاروں کو نکتا رہا جو اُس رات معمول سے زیادہ روشن تھے۔ ستاروں کی گردش مجھے پل پل کی خبر دے رہی تھی کہ اب اذانِ سحر میں کتنا وقت رہ گیا ہے۔ میں اپنے فرض کی ادائیگی سے مطمئن تھا مگر اذان کے وقت سے کچھ دیر پہلے میری آنکھ لگ گئی اور طلوعِ آفتاب تک نہ کھلی۔ جب میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا:

”بلال! تمہاری ذمے داری کیا ہوئی۔“

میں نے عرض کی:

”یا رسول اللہ! زندگی بھر کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ آج پتا نہیں کیسی غفلت طاری

ہو گئی۔“

مسکرا کر فرمایا:

”بے شک اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے، روحوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اب فوراً اذان دو اور

سب کو نماز کے لئے جمع کرو۔“

میری اذان کے تاثر کی بات بھی جانے دیجیے۔ ایک دفعہ سخت سردی کے موسم میں، میں نے فجر کی اذان دی تو ایک شخص بھی نماز کے لئے نہیں پہنچا۔ میں نے دوبارہ اذان دی، پھر بھی کوئی نہیں آیا۔ حضورؐ مسجد میں تشریف لاپچکے تھے۔ فرمانے لگے:

”بلال! آج نمازیوں کو کیا ہو گیا ہے۔“

میں نے کہا:

”یا رسول اللہ! شاید سردی کی شدت نے انہیں روک رکھا ہے۔“

اچھی بات نہیں لیکن موت کے لئے تیار رہنا اچھی بات ہے۔

میں نے بڑی اچھی زندگی گزاری ہے۔ زندگی کے ایک دن کا، ایک پل کا بھی افسوس نہیں۔ اُس دن کا بھی نہیں جب میں گرم چٹانوں کے نیچے دم توڑ رہا تھا۔ میں اپنے لاغر بدن پر، اپنے طویل قد پر خوش ہوں، اپنے گھنے خمدار بالوں پر، اپنے جسم کی رنگت پر خوش ہوں، خوش ہوں کہ افریقی نژاد ہوں۔ یہ رنگت، یہ بنیت میری پہچان ہیں۔ میں خوش ہوں کہ میں اُن دس ہزار مجاہدین میں شامل تھا جنہیں سینکڑوں سال پہلے کتابِ اشٹنا کی پیش گوئی میں قُذوسی کہہ کر پکارا گیا تھا۔

مختصر یہ کہ میں خوش ہوں کہ میں، میں ہوں۔ کیا سے کیا ہو گیا تھا، میہ کا زر خرید غلام اور ابنِ خلف کہتا تھا کہ مردہ انسانی جسم خود اپنی ہی اصل حالت پر واپس نہیں آسکتا۔

## خاتم المرسلین

محمد کو ہم خاتم المرسلین مانتے ہیں اسی وحدہ لا شریک کے حکم پر جس نے نبی نوع انسان کی دنیاوی اور روحانی زندگی میں ایک ضبط اور توازن قائم رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً پیغمبر بھیجے اور ہمیں حکم دیا کہ اُن سب کی نبوت اور اُن کے لائے ہوئے صحیفوں پر ایمان لاؤ۔ اسلام اللہ کی طرف سے آئی ہوئی تمام ہدایات کا لب لباب اور جوہر ہے اور جب قرآن نے اعلان کر دیا کہ

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (۵/۳)

تو حامل قرآن، محمد مصطفیٰ کا خاتم النبیین ہونا محض فضیلت نہیں بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔ جیسے خلیل اللہ، کلیم اللہ اور روح اللہ کے القاب۔ اس کے ساتھ ہی حق تعالیٰ شانہ نے یہ اہتمام بھی کیا کہ جس نبی پر اللہ کے پیغام کا اختتام ہو وہ جزو ایمان ہونے کے علاوہ ایک مکمل نمونہ عمل بھی ہو۔ وہ نہ فوق البشر ہو کہ جسم رکھتے ہوئے اس کا منکر ہونہ تحت البشر کہ

جسم کے ہی تقاضوں کی تکمیل کو سب کچھ سمجھ بیٹھے۔ وہ ان دو انتہاؤں کے درمیان خیر البشر ہو جو جسمانی اور اخلاقی تقاضوں کی متوازن تکمیل سے وہ سیرت پیش کرے جس کی پیروی ہر انسان کے لئے ممکن ہو۔ حضورؐ کی سیرت مبارکہ نے بشر کے لئے خیر البشر بننے کے بعد بھی بشر رہنے کو ممکن بنا دیا۔ نبیؐ آخر الزماں کے ظہور کے اولین مقاصد میں تھا کہ ان کے کردار و عمل کو تمام دنیاوی اور روحانی تقاضوں کی تکمیل میں مصروف دیکھا جائے اور ان کی مثال کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا جائے۔ مثال کے طور پر گوتم بدھ کی ترک دنیا کی تعلیم پر چند بھٹو عمل کر سکتے ہیں۔ اگر ان کے تمام پیروکار یا ان کی اکثریت یہ تیرہ اختیار کر لے تو بھیک دینے والا کون ہو گا۔ گوتم بدھ کی طرح ازدواجی زندگی کو تاج دینے والے محض تجربہ اور زہد کی رفعت کو تسلیم تو کر سکتے ہیں اس کی پیروی نہیں کر سکتے اور اگر کریں گے تو نسل انسانی کا تسلسل کیسے برقرار رہے گا۔

جسم کے ساتھ یہ بات شامل کر دی گئی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسانیت کے لئے نمونہ عمل بن کر ہر شخص کے پیش نظر رہیں تاکہ ان کے بعد آنے والے انسان کسی ضرورت کے تحت یا کسی مصلحت کیشی کا شکار ہو کر اپنی قوتِ تخلیق اور خود اختیاری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دین میں کوئی ایسا عنصر نہ شامل کر بیٹھیں جس کی سند قرآن اور انسانِ کامل، محمد مصطفیٰؐ کی سیرت اور اسوہ حسنہ میں نہ مل سکے اور اگر خدا نخواستہ ایسی صورت پیدا ہو جائے تو قرآن اور سنت کی کسوٹی کا دائمی معیار موجود ہے جس سے وہ اپنے لئے رہنمائی حاصل کر سکیں گے۔

نبیؐ کی یہی رہنمائی نور السموات والارض ہے جو شیشے کے حباب میں ہے اور شیشہ روشنی کی گزر گاہ ہے، کسی اور ٹھوس شے کی طرح رکاوٹ نہیں بلکہ اس کی ترسیل میں مدد و معاون ہے۔ دور سے دیکھتے تو روشن حباب ہی نظر آئے گا، اُس کے اندر کا چراغ نظر نہیں آئے گا۔ جتنا شمع دان کے قریب ہوتے جائیں گے چراغ اور حباب کا فرق واضح ہوتا جائے گا۔

ہر نبیؐ اپنے دور کے حالات اور معاملات کے دائرہ کار میں حیات انسانی کے لئے ہادی و رہبر بن کر سامنے آیا لیکن جس نبیؐ پر پیغامِ الہی کی تکمیل ہونا تھی اُسے زمان و مکان سے مختص نہیں فرمایا گیا اور یوں آپ کی سیرت کو ابد الابد تک کے لئے انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کا رہبر و رہنما اور مکمل نمونہ عمل بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انسان کو شخصیت پرستی سے چھوٹکارا دلادیا جو آئے دن چولے بدل بدل کر سامنے آتی رہتی ہے۔

انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ اپنے تخلیقی ذہن کے مطابق، اپنی خود اختیاری کے بل بوتے پر ہر اصول اور قانون میں تغیر و تبدل کر کے اپنے لئے قابل قبول بنا تا رہتا ہے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ کیسے کیسے جلیل القدر پیغمبر کی تعلیمات کو انسان نے اپنی قطع و بربد کے ذریعے کیسا کیسا مسخ کیا۔ اللہ کے ازلی پیغام کے مکمل تحفظ کے لئے محمدؐ کی پیغمبرانہ ذمہ داریوں

اکثر غیر مسلموں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور گوتم بدھ کی تعلیمات سادہ اور قابل فہم ہیں لیکن آنحضرتؐ کی شخصیت انہیں پیچیدہ اور کچھ حد تک ناہموار محسوس ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ کی تعلیمات میں انہیں کئی ایسے پہلو نظر آتے ہیں جو ان کے نزدیک خالصتاً مادی اور دنیاوی ہیں اور جنہیں وہ اپنی دانستہ میں رسالت کے دائرہ کار سے باہر گردانتے ہیں۔ ایسی باتوں کا جواب دینا نہ میرا مقصد ہے نہ منصب لیکن میرے خیال میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم اس کائنات سے الگ نہیں ہیں جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور جسے خالق ارض و سما نے صداقت ازلی کے منظر کی حیثیت سے تخلیق کیا ہے۔ یہ دنیا اپنے تمام عوامل اور لوازم کے ساتھ ہمارے اپنے اندر بھی موجود ہے۔ ایک اور نیادی نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ پیغمبر وہ بھی ہوتے ہیں جو صرف روحانیت کی

نہیں فراہم کر سکتی تھی مگر اپنی پیغمبرانہ ذمے داریوں کے پیش نظر ان کے لئے ایسے سماجی اور سیاسی اقدام ناگزیر تھے۔

کچھ لوگ ان پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ ان کے مزاج میں رحم کی کمی تھی، حالانکہ وہ تو تھے ہی رحمت اللعالمین۔ ایسی سوچ نہ صرف محمد کی ذات کے ساتھ انتہائی ناانصافی ہے بلکہ ہوا اسرائیل کے کئی پیغمبروں، یہاں تک کہ بائبل تک کی اہانت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اپنے دنیاوی مشن کی تکمیل کے آخری مراحل میں فتح مکہ کے موقع پر اپنے دس ہزار صحابیوں کی متفقہ رائے کے باوجود انہوں نے عام معافی اور درگزر کا اعلان کر کے جس جذبہ ترحم کا ثبوت دیا وہ لوح تاریخ پر عفو اور رحم دلی کی بہترین مثال کے طور پر ہمیشہ ثبت رہے گا۔

محمد کی صفات کے ضمن میں ایک اور نکتہ توجہ طلب ہے کہ نبوت سے پہلے ان کی زندگی ایک عام آدمی کی زندگی تھی۔ ان میں بہت سی خوبیاں تھیں لیکن کوئی ایک خوبی بھی ان کی رسالت کا جواز نہیں فراہم کرتی تھی۔ انہیں خود منصب رسالت کا گمان تک نہیں تھا۔ ان کی یہی سیدھی سادی، غیر ڈرامائی، اہم واقعات سے خالی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں نبوت ان کی اپنی کسی بشری صفت کی بنا پر نہیں ملی تھی بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے اپنے انتخاب کی بنیاد پر سونپی گئی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنی صلاحیتوں پر نازاں رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی استعداد کے شایان شان ان سے کوئی عظیم کام لے۔ ایسے لوگ یہ بنیادی بات بھول جاتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کی ذات بے نیاز ہے۔ اُسے انسان کی کسی خوبی اور صفت کی احتیاج نہیں ہے۔ وہ مختارِ کل ہے، جس سے جو کام لینا چاہتا ہے اُس میں ویسی ہی صفات پیدا کر دیتا ہے۔ پیغمبر آخر الزماں کو اللہ تعالیٰ نے جس عظیم کام پر مامور کیا تھا، اُس کی تکمیل کے لئے انہیں اتنی ہی عظیم صفات سے

بات کرتے ہیں اور وہ بھی جو انسانوں کو روحانی اور الہامی تعلیمات کی جلاخشی کے علاوہ اُسے اس کرہ ارض پر منشاء الہی کے مطابق زندگی گزارنے کا درس دیتے ہیں۔ یہ نکتہ ذہن سے اوجھل ہو جائے تو حضور کی شخصیت واقعی پیچیدہ اور ناقابلِ فہم محسوس ہوگی۔ یہ واقعہ ہے کہ حضور کی روحانی حقیقت، ایک حد تک بشری اور مادی پردوں میں لپیٹی ہوئی ہے مگر یہ اس لئے ہے کہ انہیں اس دنیا کے لئے ایک عالمگیر اور مستقل قانون ساز کا کردار ادا کرنا تھا۔ اپنی اس ذمے داری کے پیش نظر وہ دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے۔ اس حیثیت میں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قریب ہیں بلکہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان تمام اکابر کو خالصتاً روحانی پیمانے سے ناپ کر کوئی نتیجہ اخذ کر لینا شاید مناسب نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ حضور میدان جنگ میں برسراپیکار دیکھے گئے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ دنیاوی تنگ و تاز کے دائرے سے باہر وہ عظیم ترین روحانی بلند یوں پر بھی بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے شادیاں بھی کیں مگر ان کی شادیاں محض دنیاوی مقاصد کے لئے یا منفی معنوں میں مادی نہیں تھیں۔ ان کی ازدواجی زندگی، ان کی طرف سے، عام سماجی حدود میں داخل ہونے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ یہ ان کے ان افعال کا حصہ تھی جن کے ذریعے ان کی تعلیمات کی روحانی اقدار کو مجموعی انسانی زندگی کے ساتھ منضبط ہونا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ ان کی روحانی یا عمودی صفات کو ان کی دنیاوی یا فنی صفات کے ساتھ ہم آہنگ اور متوازن کرنے کی بات تھی۔ ان کے مزاج اور معمولات کے پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو ازدواجی زندگی کے جھمیلوں میں پڑنا ان کے لئے کوئی بہت خوش آئند بات نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ اس لئے کہ انہیں سادگی عزیز تھی، بوریا نشینی اچھی لگتی تھی، رات دیر گئے تک عبادت کرنا پسند تھا۔ روزوں کی سختیاں مرغوب تھیں اور ازدواجی زندگی ان کے ان محبوب مشاغل میں کوئی آسانی

جنم لیا تھا جو روحانی اور مادی، دونوں سطحوں پر الہامی سچائیوں کی تصدیق کا نام ہے مگر اس قوت کو متوازن رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس میں عصمت اور پاکدامنی کا عنصر بھی شامل کر دیا تھا۔ دراصل قوت اور پاکدامنی دونوں کا تعلق تقدس سے ہے۔ قوت اور جدوجہد عملی طور پر تقدس کا دفاع کرتی ہیں اور عصمت و پاکدامنی تقدس کو قائم اور برقرار رکھنے کا ایک خاموش اور انفعالی انداز ہے۔ جدوجہد میں جہاد فی سبیل اللہ کے داخلی اور خارجی مظاہر ملتے ہیں اور عصمت اور پاکدامنی میں سادگی، حلم اور عظمت کردار کی ساکن و خاموش خوبیاں ہیں، گویا قوتِ مخرکہ، اللہ تعالیٰ کے مقاصدِ ارفع کے حصول کے لئے ایک شمشیرِ برہنہ ضرور تھی مگر ایسی جس کی تندہ و تیزی کو پاکدامنی کی آب دے کر اس میں اعتدال پیدا کر دیا گیا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ مجرد طاقت فی نفسہ، تکبر اور غرور کو جنم دیتی ہے جو ان گنت فتنوں کی جڑ ہے۔ حلم، سادگی اور معصومیت، کبر و نخوت کا تریاق ہیں۔

ان کی عالی ظرفی سے میری مراد سخاوت، فیاضی اور کشادہ دلی کے علاوہ بالغ نظری سے بھی ہے جو انہیں مسئلے کو ایک آفاقی اور کُل کائناتی تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت بخشتی تھی۔ محمدؐ کی ذات میں عالی ظرفی کے ساتھ شرافت کا عنصر ایک اضافی صفت کی طرح جڑا ہوا تھا۔ شرافت، عالی ظرفی ہی کی ایک تجریدی صورت ہے۔ تصوراتی سطح پر عالی ظرفی ہی کا نام شرافت ہے۔ شرافت کی ذیلی خوبیوں میں نظافت و طہارت کے ساتھ ساتھ حسنِ جمالیات اور کائنات گیر سطح پر حُسن و حُسن کی پہچان اور قدر دانی شامل ہیں۔ فیاضی اور سخاوت کے معنوں میں عالی ظرفی، طاقت کی نبردِ جُوئی کی ضد ہے جو اس کے اثرات کو ہمدردی اور عفو سے اعتدال مہیا کرتی ہے۔

تقویٰ سے یہاں میری مراد یہ ہے کہ بدہ دل و جان سے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے، ماورائے اور اس ازلی صداقت سے منسلک کرے جو ذاتِ مطلق کا لازمی جزو ہے اور

نواز۔ نہ اس سے بڑا کام کسی کے سپرد ہو، نہ اتنے اوصافِ جلیلہ کسی اور کے حصے میں آئے۔  
 بنیادی طور پر سرورِ دو عالم کی ذات توازن اور عجز کا امتزاج تھی۔ بشری دائرہ عمل میں انتہائی توازن اور اللہ تعالیٰ کے سامنے ذات کی مکمل نفی کی حد تک عجز۔ مزید غور کریں تو ان کی شخصیت میں تین عناصر واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ جدوجہد، عالی ظرفی اور تقویٰ۔ یہ تینوں الفاظ میں خاص معنی میں استعمال کر رہا ہوں کیونکہ ایسی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کے کسی پہلو کو لفظوں کے بدھے ٹکے معانی میں نہیں سمویا جاسکتا اور خاص طور پر ایسی صورت میں کہ آپ جس خوبی کا بھی ذکر کریں وہ ان کے یہاں مل جاتی ہے بلکہ وہ خوبی ہی نہیں جو ان میں نہیں۔

اپنے عام فہم معنوں میں تو یہ تینوں خوبیاں کچھ حد تک بہت سے اچھے انسانوں میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک خوبی میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انداز سے چند مزید صفات شامل کر کے انہیں جو توازن عطا کیا ہے وہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ اپنی ان اضافی صفات کی بنا پر یہ تینوں الفاظ خاص معنوں کے حامل ہیں۔ ان تمام اضافی خوبیوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ بنیادی صفات میں حدودِ توازن اور اعتدال رہے، وہی توازن جو عین منشائے الہی ہے اور جس پر اس کی ساری کائنات کا نظام قائم ہے۔ ہم تو محمدؐ کی ذاتی زندگی میں عدم اعتدال کا تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن ان کی شخصیت کے اعتدال کو بشری نہیں، الہامی میزان پر پورا اتارنا مقصود تھا کیونکہ انہیں سارے عالم انسانیت کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال اور ایک دائمی معیار بننا تھا۔

پہلی صفت جدوجہد۔ ان الفاظ سے میری مراد وہ فعال قوت تھی جو کرہ ارض پر بسنے والے انسانوں کے تمام روحانی اور مادی مسائل حل کرنے کی استعداد رکھتی تھی۔ یہ عام جسمانی، دماغی یا عسکری قوت نہیں، ایمان کی قوت تھی۔ اس قوت نے ایمان کی کوکھ سے

معاذ بن جبلؓ، عبداللہ بن سلام، سعد بن معاذؓ، سلمان فارسیؓ جیسے صاحبان علم کے نعمت کدوں سے جو کچھ اس فقیر کی جھولی میں گر اور جتنا اس کوزہ سفالیں میں سارے کام میں نے حسب توفیق، جہاں تک میرے عجز بیان نے ساتھ دیا، عرض کر دیا۔ مجھ فروتن کے لئے یہ احساس ہی کچھ کم پریشان کن نہیں کہ ذکر ہو رہا ہے فصیح العرب کا اور بات کرنے والا ایک غیر عرب، عجمی بھی نہیں، ایک بے نوا، تمہی دامن، افریقی نژاد حبشی جس کا سین شین بھی درست نہیں جس کی عمر کا نصف سے زیادہ ابتدائی حصہ صرف یہ چار پانچ الفاظ کہتے گزرا:

”جی آقا“

”جی حضور“

”بلیک یا آقا“

”جو حکم حضور“

جس پر ایسے بھی دور گزرے ہیں کہ ہفتہ ہفتہ بھر اس نے اپنی آواز نہیں سنی اور پھر جب اُس کے لئے سورج طلوع ہوا تو روشنی اس قدر خیرہ کن تھی کہ ایک مدت تک عالم حیرت میں رہا۔ شاکلِ نبیؐ کے بیان میں مجھ سے یقیناً بہت سی فروگزاشیں ہوئی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے۔

سیرتِ محمدؐ کی تعریف و توصیف کا سلسلہ بدلا آبا تک جاری رہے گا اور اس سراجِ منیر کے فیوض و احسانات پر تبصرے ہوتے رہیں گے۔ انسان رہتی دنیا تک، جس دور میں بھی اس منبع نور سے رجوع کرے گا اسے محسنِ عالم کی سیرت پاک کے ایک ایک گوشے سے روشنی کے سیل اُٹتے نظر آئیں گے اور پھر یہ توفیق کوزہ پر ہے کہ وہ اس فیضِ جاریہ سے کتنا فیضیاب ہوتا ہے۔

صداقت کا لازمی جزو ہے غیر جانب داری اور انصاف۔ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے منسلک کرنے کے معنی ہیں ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا۔ ماورائے تعلق سے میرا مطلب ہے ارضی زندگی کی تمام تر تقاضوں کے باوجود، عذاب و ثوابِ آخرت سے ایک پل کے لئے بھی غافل نہ رہنا اور اپنی بنیادی حیثیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا کہ انسان خالق و مالکِ کائنات کی خلق ہے اور اُس کا عبد ہے۔

تو اب صورت یوں ہوئی کہ قوت اپنے لئے، عالی ظرفی دوسروں کے لئے اور تقویٰ اللہ تعالیٰ کے لئے۔ قوت کا پہلو ارضی زندگی میں روحانی مقاصد کی تکمیل کرنے کی ایک عملی اور مثبت صورت ہے۔ سخاوت اور عالی ظرفی میں روح کی محبت پنہاں ہے جو لافانی ہے اور ہر شخص میں موجود ہے۔ حضورؐ کی ان دونوں ارضی یا فنی صفات کے دھارے اپنی تمام تر ذیلی صفات کے ساتھ مل کر مثالی توازن اور اعتدال کے ساتھ اُن کی تیسری صفت یعنی تقویٰ میں شامل ہو جاتے ہیں تو تمام مادی اور روحانی پہلو اس درجہ متوازن ہو جاتے ہیں کہ اس توازن کی بنیاد پر ہمہ بلا آخر حقیقتِ مطلق کی تجلیات میں محو ہو جاتا ہے۔ تقویٰ اسی لئے تمام صفات کا نکتہ کمال ہے کیونکہ یہی وہ حتمی توازن مہیا کرتا ہے جو منزلِ آخر تک پہنچاتا ہے۔ وہی منزل جو ابتدا بھی ہے، انتہا بھی اور مہتما بھی!

یہ بہت بڑی بڑی باتیں ہیں، مجھ ناچیز کے منصب سے بہت بلند، صفاتِ رسالتِ آباء کا احاطہ یا اُن پر تبصرہ کرنے کی مجھے توفیق نہیں۔ اُن کا ایک سرسری جائزہ بھی میری بساط سے باہر ہے۔ ویسا سوچا جائے تو میری بساط ہے ہی کیا ایک سیاہ نام حبشی غلام جسے رحمتِ عالم نے اپنے سایہ عافیت میں جگہ دے کر اپنے صحابہ میں شامل فرمایا۔ حضورؐ کے معمولات پر غور کرنا، آپ کے ہر قول و فعل سے اپنے لئے سبق حاصل کرنے کی سعی، صحابہ کرام کا معمول تھا۔ آپ کی سیرت کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ ابو بکرؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علیؓ، ابوذر غفاریؓ،

## جنت کی محفل

اب میں چھڑی کے سارے چلتا ہوں۔ ہر روز گزشتہ روز سے کم اور جلدی گھر لوٹ آتا ہوں۔ میری نقل و حرکت روز بہ روز محدود ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ دنوں سے تو صرف مسجد تک جانا آتا رہ گیا ہے۔ لیکن میرا ذہن آفاق کی سی وسعت رکھنے والی سیر گاہ ہے۔ کیونکہ اس میں دو برس رسالت کی حسین یادوں کے باغ کھیلے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کرم کرے تو شاید جنت کے خوش نصیبوں میں مجھے پھر ابو ذرؓ کے ساتھ سیر کرنے کا اور ان کی باتیں سننے کا موقع مل جائے۔ وہی باتیں کہ اسلام کی سادگی اور فقر اس نبیادی عقیدے کا اعتراف اور اعلان ہے کہ مالک ملک صرف اللہ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ ذاتِ الہی کے سامنے انسان غریب ہے۔ اللہ صرف اللہ کی ہے۔ غریب وہ ہے جو یہ جانتا ہے کہ اس کا جو کچھ ہے وہ اس کا اپنا نہیں ہے اور وہ ہر شے کے لئے کی محتاج ہے۔ امیر وہ ہے جو خود کفیل ہے، جسے کسی کی حاجت نہیں۔ راضی برضائے الہی کے



اب ایک نیا لہجہ سننے میں آتا ہے۔ کتے کے نواحی صحرا میں بسنے والے قبائلیوں کا لہجہ۔ آواز میں جوش و جذبے کے ساتھ عزم و اعتماد کی کلنگ :

حقیقت تو صرف ایک ہے اور وہ ہے ذاتِ الہی۔ اُس کے سوا اور کوئی حقیقت ہے ہی نہیں۔

ایک نمائندگی شائستہ آواز، مدنی لہجہ، ٹھہرے ٹھہرے الفاظ جن سے عظمت جھلکتی ہے :  
 'مادری تخلیقات بھی حقیقت ضرور ہیں مگر ایک محدود معنی میں۔ انھیں ثانوی حقیقت کہا جاسکتا ہے، اصل حقیقت نہیں۔'

ایک اور صاحبِ علم اپنی نکتہ رسی سے بات آگے بڑھاتے ہیں :  
 'مادری حقیقت دراصل، اصل حقیقت کا مظہر ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ مادری حقیقت جسے ابھی ابھی ثانوی حقیقت کہا گیا ہے، اصل حقیقت ہی کی نشاندہی کرتی ہے۔ اصل حقیقت ایک ہے جو نظروں سے لوجھل رہتی ہے مگر اُس کے مظاہر کے ہزاروں روپ ہیں۔ ویسے ہی جیسے اصل روشنی پاکیزہ اور ہر رنگ سے بے نیاز ہوتی ہے مگر جب منعطف ہو جاتی ہے تو قوسِ قزح کے بے شمار رنگوں میں ڈھل جاتی ہے۔'

اب اس گنگلو میں ایک نئی آواز شامل ہوتی ہے۔ الفاظ شاعرانہ مگر اندازِ خالصتاً منطقی، لہجے میں بہت نرمی مگر میان پر پوری قدرت :

'قدرت کا عمل تخلیق ایک کائنات گیر قائلین کی طرح ہے جس پر بنے ہوئے مختلف نقش و نگار ایک الہامی آہنگ کے ساتھ بچے بچوتے رہتے ہیں مگر ہر شکست و رخت کے بعد اُن کا باہمی توازن اور کائنات کا مجموعی حُسن برقرار رہتا ہے۔ اسی توازن، اسی میزان کے ذریعے وہ ہر لحظہ کسی آفاقی ضابطے، کسی الہامی قاعدے کی شمولیت مہیا کرتے رہتے ہیں۔'

ایک اور نئی آواز جیسے علم و معرفت کا باب گھل گیا ہو :

تصویر کی حد تک اسلام فقر اور غربت کا نام ہے لیکن یہ فقر بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں رکھتا۔ اس کا مطلب ترک اور رہبانیت نہیں ہے۔ یہ وہ فقر ہے جس کے دروازے اس روحانی استغنا پر کھلتے ہیں جو ہماری الہامی تعلیم کا درس ہے اور یہی مثبت سوچ جو فقرِ اسلامی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اُس کے وجود کا جواز ہے۔

اس وقت جب میں یہ باتیں کر رہا ہوں تو دو در رسالت کی ان گنت محفلوں کے نقوش میرے ذہن میں گردش کر رہے ہیں۔ یہ یادیں، یہ نقوش میرے تصور کی محفلیں سجائے رہتے ہیں۔ رب العالمین مجھے پھر موقع عطا کرے کہ میں اپنے تصورات کی تعبیر دیکھوں۔ کتب رسالت کے فارغ التحصیل، رسول اللہ کے ساتھ حلقہ جمائے بیٹھے ہیں۔ علم و معرفت کی قدیمیں روشن ہیں مبات سے مبات نکل رہی ہے۔ خوش گفتاری اور عالی خیالی کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔

ایک آواز ابھرتی ہے۔ عجمی لہجہ مگر فکرِ اسلامی میں ڈوبی ہوئی :

'مادی دنیا کی کوئی چیز قابلِ اعتنا نہیں۔ میرے خیال میں اس سے کتناہ کشی ہی بھتر ہے۔ چند تانیوں کی خاموشی کے بعد ایک نمائندگی جانی پہچانی آواز سنائی دیتی ہے جسے میں نے اپنی اسلامی زندگی میں شاید ہر روز سنا۔'

'مادی دنیا میں واقعی کوئی چیز قابلِ انقیاد نہیں اور اگر کچھ ہے بھی تو محض روحانی حوالوں سے جو ماوراء ہیں۔'

جو اب ایک ایسی دلکش آواز شریکِ گنگلو ہوتی ہے جیسے کوئی نغمہ چھڑ جائے۔ لہجے میں اتنا رس جیسے شہد گھلا ہو :

'مادری بھی ایک حقیقت ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مادری تخلیقات کا وجود

ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ بے مقصد نہیں ہو سکتیں۔'

گی۔ کیونکہ جیسا کہ آپ نے سنا اصل حقیقت کے سوا تو کچھ ہے ہی نہیں۔ اب یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ چونکہ اصل حقیقت ناقابل تقسیم ہے، اس لئے مادی یا ثانوی حقیقت، اصل حقیقت کا مظہر ہونے کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔

مدنی علم و فضیلت اسی خیال کو ذرا اور آگے لے جاتی ہے:

’یہ مادی تخلیقات جنہیں ہم ثانوی حقیقت کہہ رہے ہیں، خالق ارض و سموات ہی کی ذات کا کرشمہ ہیں۔ یہ وہی ثانوی حقیقت ہے جو اللہ جل شانہ کا مظہر ہے اور جو ذات الہی کے نام ”الظاہر“ کی تفسیر ہے۔ یہ ثانوی حقیقت اپنے اندر کوئی الوہیت نہیں رکھتی، لیکن یہ مظہر الوہیت ضرور ہے۔‘

علم و بصیرت کا ایک اور سوتا پھوٹتا ہے:

’بے شک اللہ تعالیٰ جس طرح ’الاول و الآخر‘ ہے اسی طرح ’الباطن و الظاہر‘ بھی ہے اور اس کی تخلیقات اس کے ”الظاہر“ ہونے کی دلیل ہیں۔‘

پھر وہی آواز سنائی دیتی ہے جیسے علم کا بحر زخار مخاطب ہو:

’رسول کریمؐ نے بھی ایک دفعہ فرمایا تھا۔ میں نے آج تک کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جس دیکھنے سے پہلے میں نے اس میں اللہ کو نہ دیکھا ہو۔‘

وہی آواز پھر ابھرتی ہے جس میں شعر کی چاشنی کے ساتھ فلسفیانہ گیرائی بھی شامل تھی مگر اس بار لہجہ بہت دھیمہ جیسے کوئی اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو:

’ایک آفاقی آب حیات ہے جو ہر تخلیق کے رگ وریشے میں دوڑ رہا ہے۔ ایک جو ہر ہے۔‘

پھر وہی شد کھلی آواز، لہجے میں وہی شائستگی اور شیرینی کہ جوئے اسی کا ہو جائے:

’ایک ضروری نکتہ قابل التفات یہ ہے کہ اصل حقیقت اور ثانوی حقیقت کے

’درست، لیکن انسان اپنی محدود سوچ اور محدود ترکتہ نظر کی وجہ سے مادی تخلیقات کی ہیئت سے بھی پوری طرح آشنا نہیں ہو سکتا، اُن کی ماہیت کا مکمل ادراک تو شاید اُس کی بساط سے ہی باہر ہے۔‘

گفتگو میں ایک نیا نکتہ پیدا ہوتے ہی وہی خوبصورت آواز پھر سنائی دیتی ہے جس نے کہا تھا کہ مادی تخلیقات کا وجود ہی اُن کے با مقصد ہونے کا ثبوت ہے۔ انداز بیان بھی اتنا دل میں گھر کرنے والا کہ جی چاہے یہی آواز کانوں میں گونجتی رہے:

’نکتہ نظر سے چیزوں کی ہیئت ضرور بدل جاتی ہے مگر اُن کی ماہیت نہیں بدلتی۔ اگر ہم ایک مستطیل کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھ رہے ہوں تو آسمان ہمیں مستطیل نظر آئے گا۔ زاویہ نگاہ بدل جائے تو آسمان کبھی مربع نظر آئے گا، کبھی بیضوی، کبھی گول، لیکن رہے گا وہی آسمان جس کا سورج دن کو ہمارے گھروں میں اُجالا کرتا ہے، جس کے ستارے راتوں کو ہمیں راہ دکھاتے ہیں۔‘

اب وہی محترم آواز دوبارہ گفتگو میں شریک ہوتی ہے جس نے موضوع کے تعین کے بعد سب سے پہلے اپنی رائے دی تھی:

مسئلہ دراصل یہ ہے کہ دین ایک دائرہ ہے جس کی حدود مقرر ہیں۔ لیکن اسی محدود دائرے میں لامحدود کا تصور بھی شامل ہے۔ محدود میں لامحدود، انہونی بات ہے، مگر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہر ہیئت، ہر صورت کو صرف جزوی طور پر دیکھ سکتے ہیں، مکمل صورت میں نہیں۔‘

’مکمل صورت میں نہ دیکھ سکنے کے باوجود اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اصل حقیقت صرف ایک ہے اور اُس میں کسی غیرہ کی گنجائش نہیں اس لئے یہ ثانوی حقیقت اگر کائنات میں موجود ہے اور یقیناً موجود ہے تو یہ لازماً اصل حقیقت کا حصہ ہوگی یا اُس کا کرشمہ ہو

گرج، دلیل میں وزن، بیان میں خود اعتمادی :

’دُنیا بیتی و اشکال پر مشتمل ہے۔ جدھر دیکھو مادی ہیئتیں بکھری ہوئی ہیں۔ انہی کا مجموعہ ہے ہماری دنیا۔ مگر درحقیقت یہ ساری کی ساری ساکت و متحرک اشکال، اپنی ظاہری صورت میں محض کھنڈر ہیں کسی آفاقی نغمے کا، جو کبھی سارے ارض و سما میں جاری تھا مگر کسی وقت مجسم ہو کر ان مادی ہیئتوں میں قید ہو گیا۔ علم اور روحانیت کی نظر ان جامد شکلوں کو پگھلا دیتی ہے تو ہر مادی ہیئت کے اندر سوئی ہوئی ازلی موسیقی پھر سنائی دینے لگتی ہے۔‘

رسالت مآب، معلم عقلِ انسانی ہونے کے باوجود بالکل طالبِ علمانہ انداز میں، نہایت انتہاک سے سب کی باتیں سن رہے ہیں اور لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کبھی براہِ راست اُن کا ذکر آجاتا تو ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم کھیل جاتا۔ میں کہ خود کھنڈر ہوں ایسی بے شمار یادوں کا، ایک بار پھر اُن محفلوں کے انتظار میں ہوں، فردوسِ بریں کے کسی گوشے میں، نئے مشاہدات کے پس منظر میں، نئے موضوعات کے ساتھ۔

لیکن ابھی شاید چند روز اور مجھے دمشق کے سورج کا طلوع و غروب دیکھنا ہے۔

اب اس خادمِ رسول، بلال حبشی کو اجازت دیجئے۔ اس مجلس کو یہیں ختم کرتے ہیں اور اپنے نبی پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔

اللَّهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی نَبِيِّنَا وَرَسُولِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِهِ  
وَأَصْحَابِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّاتِهِ أَجْمَعِينَ ۝ اللَّهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ  
وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰی آلِ إِبْرَاهِيمَ  
إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ اللَّهُمَّ صَلِّ عَلٰی جَمِيعِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ

درمیان جو ربط ہے، وہ یکطرفہ ہے۔ اصل حقیقت کو ثانوی حقیقت پر کُلی اختیار ہے۔ ہر چند کہ یہ ربط بہت واضح نہیں ہے مگر یقینی طور پر موجود ہے اور براہِ راست موجود ہے۔ اس کے برعکس خلق اور خالق کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے کیونکہ خلق بے اختیار ہے۔ خالق ہی سارے اختیارات کا مالک ہے۔

بات ختم ہوتے ہی وہی محترم آواز پھر سنائی دیتی ہے :

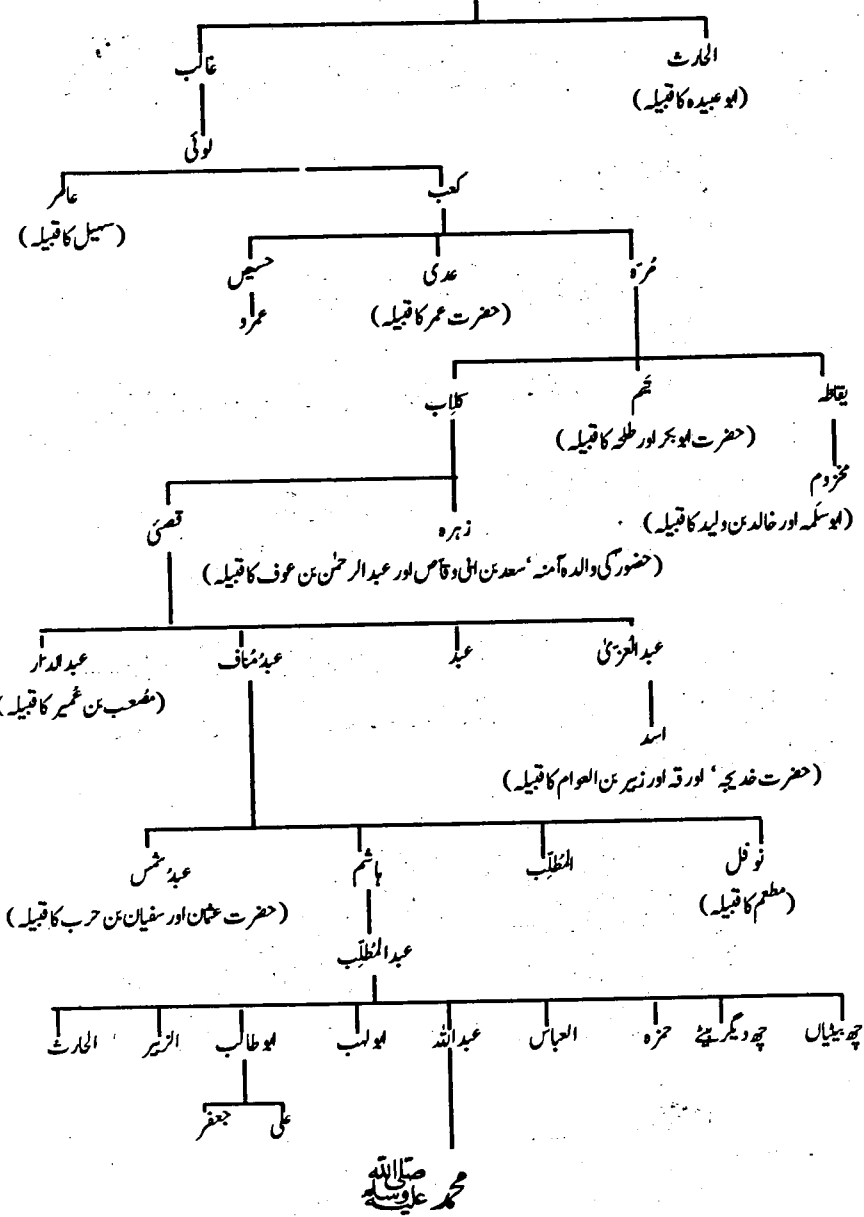
یہ بہت اچھا نکتہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصل حقیقت اور ثانوی حقیقت، حقیقت کے دو درجات ہیں جن کے درمیان رسول کی ذات ایک حدِ فاصل اور ایک نکتہ اتصال کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ کا رسول ثانوی حقیقت کی معراج ہے۔ اُس کی مکمل ترین صورت۔ رسول ہی ثانوی حقیقت کے تعلق کی وضاحت کرتا ہے اور ان دونوں کو مالک و خالق کائنات کی فضاء کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور منضبط کرتا ہے جس سے ایک میزان قائم رہتا ہے۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ حبشی کس طرح ماضی، حال اور مستقبل کو آپس میں گنڈے کئے جا رہا ہے۔ یہ شاید اس لئے کہ میرا دین قیدِ زمان سے ماوراء ایک تسلسلِ مکانی یا تسلسلِ وجود کا نام ہے۔ اسلام میں وقت تو محض ایک غارت گر ہے جو اس تسلسلِ مکانی کی صورت بنا کر تارہتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ رسولِ پاک کو یہ کہتے سنا تھا کہ کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا جو سابقہ دور سے بدتر نہ ہو۔ یہ تسلسلِ وجود ایک علامت کی طرح مسلمان کی زندگی کا احاطہ کئے رہتا ہے، جیسے ہمارے اطراف پھیلی ہوئی مادی علامتیں، جو غیر محسوس انداز میں لیکن یقینی طور پر روزِ اول ہی سے ہمیں ایک خلاق اعظم اور ایک حقیقتِ مطلق کی راہ بٹھا رہی ہیں۔ معلوم سے غیر معلوم کی طرف اشارے کر رہی ہیں۔

وہی کلمے کے نواحی قبائل کا لہجہ پھر سننے میں آتا ہے۔ آواز میں کھلی فضاؤں کی گھن

(نمبر اور امت حضرت اسماعیل کی اولاد زینہ کی لڑی سے ہیں۔ ان کی اولاد جو کے سپاہر کہہ ہوئی درج ذیل شجرہ میں شامل نہیں ہے)

نمر (قریش)

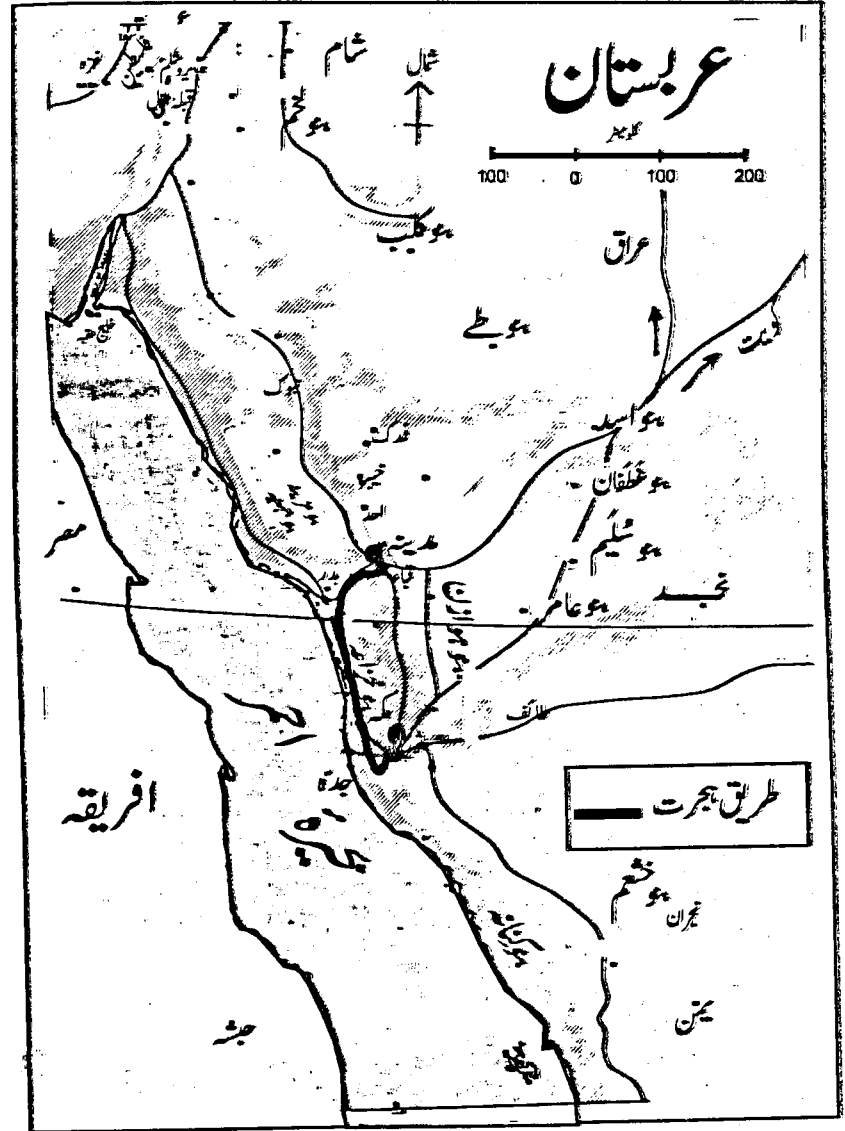



وَعَلَىٰ عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ وَأَنْ تَغْفِرَ لِي وَلِوَالِدِي وَلِأَسْتَاذِي وَ لِجَمِيعِ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ ۗ أَلَهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيمَانًا كَامِلًا وَيَقِينًا صَادِقًا وَرِزْقًا وَاسِعًا وَقَلْبًا خَاشِعًا وَ لِسَانًا ذَاكِرًا وَرِزْقًا حَلَالًا طَيِّبًا وَتَوْبَةً قَبْلَ الْمَوْتِ وَرَاحَةً عِنْدَ الْمَوْتِ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَفْوَ عِنْدَ الْحِسَابِ وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّةِ وَالنَّجَاةَ مِنَ النَّارِ ۗ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا وَالْحَقِّيْ بِالصَّالِحِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۞ بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّحِمِينَ ۞

# اشاریہ









۶۶	آئمہ (حضرت)
۹۱	آنس بیزر
۱۳۸/۱۳۷/۱۳۶/۱۳۵	ابوطالب
۲۱۵/۱۹۳	ابوالبوب قالد انصاری
۲۰۱/۱۶۳/۱۶۲	ابوالبشیر بن البرقیان
۱۳۲	ابوحنیفہ بن عقیبہ
۱۰۹	ابوسلمہ بن ابوالاسد
۳۱۸/۳۳۶/۳۰۲/۱۰۸	ابوعبید بن الجراح
۶۳/۶۲/۶۱/۶۰/۵۹/۵۵/۵۱/۵۰/۴۹/۴۸/۴۵/۹	ابوجبر (ابن ابوقحافہ)
۱۷۱/۱۷۰/۱۶۹/۱۶۸/۱۶۷/۱۶۶/۱۶۵/۱۶۴/۱۶۳/۱۶۲/۱۶۱/۱۶۰/۱۵۹/۱۵۸/۱۵۷/۱۵۶/۱۵۵/۱۵۴/۱۵۳/۱۵۲/۱۵۱/۱۵۰/۱۴۹/۱۴۸/۱۴۷/۱۴۶/۱۴۵/۱۴۴/۱۴۳/۱۴۲/۱۴۱/۱۴۰/۱۳۹/۱۳۸/۱۳۷/۱۳۶/۱۳۵/۱۳۴/۱۳۳/۱۳۲/۱۳۱/۱۳۰/۱۲۹/۱۲۸/۱۲۷/۱۲۶/۱۲۵/۱۲۴/۱۲۳/۱۲۲/۱۲۱/۱۲۰/۱۱۹/۱۱۸/۱۱۷/۱۱۶/۱۱۵/۱۱۴/۱۱۳/۱۱۲/۱۱۱/۱۱۰/۱۰۹/۱۰۸/۱۰۷/۱۰۶/۱۰۵/۱۰۴/۱۰۳/۱۰۲/۱۰۱/۱۰۰/۹۹/۹۸/۹۷/۹۶/۹۵/۹۴/۹۳/۹۲/۹۱/۹۰/۸۹/۸۸/۸۷/۸۶/۸۵/۸۴/۸۳/۸۲/۸۱/۸۰/۷۹/۷۸/۷۷/۷۶/۷۵/۷۴/۷۳/۷۲/۷۱/۷۰/۶۹/۶۸/۶۷/۶۶/۶۵/۶۴/۶۳/۶۲/۶۱/۶۰/۵۹/۵۸/۵۷/۵۶/۵۵/۵۴/۵۳/۵۲/۵۱/۵۰/۴۹/۴۸/۴۷/۴۶/۴۵/۴۴/۴۳/۴۲/۴۱/۴۰/۳۹/۳۸/۳۷/۳۶/۳۵/۳۴/۳۳/۳۲/۳۱/۳۰/۲۹/۲۸/۲۷/۲۶/۲۵/۲۴/۲۳/۲۲/۲۱/۲۰/۱۹/۱۸/۱۷/۱۶/۱۵/۱۴/۱۳/۱۲/۱۱/۱۰/۹/۸/۷/۶/۵/۴/۳/۲/۱	ابوجندل
۲۰۲	ابن مہاذب
۳۰۸/۳۰۷	ابومخزومہ حنفی
۷۱	ابوامیہ بن مغیرہ
۳۳۰/۳۲۹/۳۲۸/۳۲۷/۳۲۶/۳۲۵	ابورویحہ انصاری
۳۷۳	ابورمضہ
۳۷۲/۳۷۱/۳۷۰/۳۶۹/۳۶۸/۳۶۷/۳۶۶/۳۶۵/۳۶۴/۳۶۳/۳۶۲/۳۶۱/۳۶۰/۳۵۹/۳۵۸/۳۵۷/۳۵۶/۳۵۵/۳۵۴/۳۵۳/۳۵۲/۳۵۱/۳۵۰/۳۴۹/۳۴۸/۳۴۷/۳۴۶/۳۴۵/۳۴۴/۳۴۳/۳۴۲/۳۴۱/۳۴۰/۳۳۹/۳۳۸/۳۳۷/۳۳۶/۳۳۵/۳۳۴/۳۳۳/۳۳۲/۳۳۱/۳۳۰/۳۲۹/۳۲۸/۳۲۷/۳۲۶/۳۲۵/۳۲۴/۳۲۳/۳۲۲/۳۲۱/۳۲۰/۳۱۹/۳۱۸/۳۱۷/۳۱۶/۳۱۵/۳۱۴/۳۱۳/۳۱۲/۳۱۱/۳۱۰/۳۰۹/۳۰۸/۳۰۷/۳۰۶/۳۰۵/۳۰۴/۳۰۳/۳۰۲/۳۰۱/۳۰۰/۲۹۹/۲۹۸/۲۹۷/۲۹۶/۲۹۵/۲۹۴/۲۹۳/۲۹۲/۲۹۱/۲۹۰/۲۸۹/۲۸۸/۲۸۷/۲۸۶/۲۸۵/۲۸۴/۲۸۳/۲۸۲/۲۸۱/۲۸۰/۲۷۹/۲۷۸/۲۷۷/۲۷۶/۲۷۵/۲۷۴/۲۷۳/۲۷۲/۲۷۱/۲۷۰/۲۶۹/۲۶۸/۲۶۷/۲۶۶/۲۶۵/۲۶۴/۲۶۳/۲۶۲/۲۶۱/۲۶۰/۲۵۹/۲۵۸/۲۵۷/۲۵۶/۲۵۵/۲۵۴/۲۵۳/۲۵۲/۲۵۱/۲۵۰/۲۴۹/۲۴۸/۲۴۷/۲۴۶/۲۴۵/۲۴۴/۲۴۳/۲۴۲/۲۴۱/۲۴۰/۲۳۹/۲۳۸/۲۳۷/۲۳۶/۲۳۵/۲۳۴/۲۳۳/۲۳۲/۲۳۱/۲۳۰/۲۲۹/۲۲۸/۲۲۷/۲۲۶/۲۲۵/۲۲۴/۲۲۳/۲۲۲/۲۲۱/۲۲۰/۲۱۹/۲۱۸/۲۱۷/۲۱۶/۲۱۵/۲۱۴/۲۱۳/۲۱۲/۲۱۱/۲۱۰/۲۰۹/۲۰۸/۲۰۷/۲۰۶/۲۰۵/۲۰۴/۲۰۳/۲۰۲/۲۰۱/۲۰۰/۱۹۹/۱۹۸/۱۹۷/۱۹۶/۱۹۵/۱۹۴/۱۹۳/۱۹۲/۱۹۱/۱۹۰/۱۸۹/۱۸۸/۱۸۷/۱۸۶/۱۸۵/۱۸۴/۱۸۳/۱۸۲/۱۸۱/۱۸۰/۱۷۹/۱۷۸/۱۷۷/۱۷۶/۱۷۵/۱۷۴/۱۷۳/۱۷۲/۱۷۱/۱۷۰/۱۶۹/۱۶۸/۱۶۷/۱۶۶/۱۶۵/۱۶۴/۱۶۳/۱۶۲/۱۶۱/۱۶۰/۱۵۹/۱۵۸/۱۵۷/۱۵۶/۱۵۵/۱۵۴/۱۵۳/۱۵۲/۱۵۱/۱۵۰/۱۴۹/۱۴۸/۱۴۷/۱۴۶/۱۴۵/۱۴۴/۱۴۳/۱۴۲/۱۴۱/۱۴۰/۱۳۹/۱۳۸/۱۳۷/۱۳۶/۱۳۵/۱۳۴/۱۳۳/۱۳۲/۱۳۱/۱۳۰/۱۲۹/۱۲۸/۱۲۷/۱۲۶/۱۲۵/۱۲۴/۱۲۳/۱۲۲/۱۲۱/۱۲۰/۱۱۹/۱۱۸/۱۱۷/۱۱۶/۱۱۵/۱۱۴/۱۱۳/۱۱۲/۱۱۱/۱۱۰/۱۰۹/۱۰۸/۱۰۷/۱۰۶/۱۰۵/۱۰۴/۱۰۳/۱۰۲/۱۰۱/۱۰۰/۹۹/۹۸/۹۷/۹۶/۹۵/۹۴/۹۳/۹۲/۹۱/۹۰/۸۹/۸۸/۸۷/۸۶/۸۵/۸۴/۸۳/۸۲/۸۱/۸۰/۷۹/۷۸/۷۷/۷۶/۷۵/۷۴/۷۳/۷۲/۷۱/۷۰/۶۹/۶۸/۶۷/۶۶/۶۵/۶۴/۶۳/۶۲/۶۱/۶۰/۵۹/۵۸/۵۷/۵۶/۵۵/۵۴/۵۳/۵۲/۵۱/۵۰/۴۹/۴۸/۴۷/۴۶/۴۵/۴۴/۴۳/۴۲/۴۱/۴۰/۳۹/۳۸/۳۷/۳۶/۳۵/۳۴/۳۳/۳۲/۳۱/۳۰/۲۹/۲۸/۲۷/۲۶/۲۵/۲۴/۲۳/۲۲/۲۱/۲۰/۱۹/۱۸/۱۷/۱۶/۱۵/۱۴/۱۳/۱۲/۱۱/۱۰/۹/۸/۷/۶/۵/۴/۳/۲/۱	ابوعبیدہ
۲۹۳/۲۹۲	ابوقحافہ (عثمان بن عامر)
۲۹۳	ابوحنفہ
۳۱۶	ابوحنیفہ بن المغیرہ



۲۹۹'۶۹'۱۰	اسما عیلت
۱۰	اسحاق
۱۰۸	اسماء بنت عمیس
۱۷۶'۱۷۵	اسماء بنت ابوبکر
۱۵۶	اسود بن نوقل
۳۲۳'۳۲۲'۲۹۹'۲۹۸	اسامہ بن زید
۲۹۳'۲۵۷	أسید بن خضیر
۳۵۵'۳۳۱'۳۳۹'۲۰۰'۱۸۲	انس بن مالک
۳۶۱	أسید (لویں)
۱۸۵'۱۸۴	انح عبد القیس
۲۳۳	اصیر م بن ثمان
۳۲۷'۱۸۶	اقرع بن حابس تمیمی
۳۳۱'۲۱۵'۵۴	اتم کلثوم بنت محمد
۲۹۳	ام الفضل
۲۹۳	اتم سلمہ
۲۹۳	اتم یابی
۳۳۱'۲۰۰	اتم سلیم
۳۷۴	اتم معبد
۳۳۱	ام ایمن
۳۳۱'۳۳'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۱۹'۱۷'۱۵'۱۴'۱۳	أمیہ
۱۳۸'۱۲۹'۹۷'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰	ام جلیل
۳۹۲	اسخیلز
۱۳۹'۱۲۰	
۲۲۵	
	
۶۷	حمیرہ
۲۸۶'۲۸۵'۲۸۴'۲۸۳'۲۸۲'۲۸۱'۲۸۰	بدیل بن ورقہ

۳۲۵'۳۱۷	ابو قحیفہ
۲۴۱	ابو عمارہ
۲۷۷	ابو بصر
۲۳۱'۲۲۸	ابن قتیبہ
۱۶۱	ابن اتم کلثوم
۲۶۸	ابو قتادہ
۲۷۴	ابو سنان وہیب بن محض
۲۰۱	ابن ابی کعب
۵۴	ابو العاص
۳۸۵'۳۴۱	ابن مسعود
۳۳۱'۲۰۱	ابو طلحہ
۱۵۳'۱۵۲	ابن الدغنة
۳۹۶'۳۰۹'۳۰۳'۳۰۱'۲۹۹'۲۱۰'۶۹'۱۹'۱۰	ابو ایمن
۳۹۶'۲۳۵'۹۳'۹۲	ابن ابی خلف
۱۳۸'۱۱۰'۹۸'۹۷'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰	ابو سفیان
۳۸۵'۲۸۳'۲۶۱'۲۶۰'۲۵۹'۲۵۰'۲۳۹'۲۳۷	
۳۲۷'۲۹۴'۲۹۰'۲۸۹'۲۸۷'۲۸۶	
۲۰۱	ابو طلحہ زید بن سهل
۱۳۸'۱۲۰'۱۱۰'۱۰۹'۱۰۸'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰	ابو جہل (ابن ہشام)
۱۷۳'۱۷۲	
۱۳۸'۱۲۰'۱۱۰'۱۰۹'۱۰۸'۹۸'۹۷'۹۶'۹۵'۹۴'۹۳'۹۲'۹۱'۹۰'۸۹'۸۸'۸۷'۸۶'۸۵'۸۴'۸۳'۸۲'۸۱'۸۰'۷۹'۷۸'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹'۶۸'۶۷'۶۶'۶۵'۶۴'۶۳'۶۲'۶۱'۶۰'۵۹'۵۸'۵۷'۵۶'۵۵'۵۴'۵۳'۵۲'۵۱'۵۰'۴۹'۴۸'۴۷'۴۶'۴۵'۴۴'۴۳'۴۲'۴۱'۴۰'۳۹'۳۸'۳۷'۳۶'۳۵'۳۴'۳۳'۳۲'۳۱'۳۰'۲۹'۲۸'۲۷'۲۶'۲۵'۲۴'۲۳'۲۲'۲۱'۲۰'۱۹'۱۸'۱۷'۱۶'۱۵'۱۴'۱۳'۱۲'۱۱'۱۰'۹'۸'۷'۶'۵'۴'۳'۲'۱'۰	ابو لب
۲۹۳'۱۶۱'۱۳۹	
۳۸۴'۳۴۱'۳۳۹'۲۹۴'۲۹۳	ابو رافع
۳۰۰'۳۸۱'۳۶۰'۳۰۳'۲۸۴'۲۸۲'۱۸۲	ابو ذر غفاری
۲۹۴'۱۲۷'۱۲۶	ابو الجری
۱۷۷'۱۷۶'۱۷۵	اربطہ

۳۶۶	حسین
۳۱۶'۲۸۶'۲۸۵'۲۸۴'۲۸۳'۲۸۲'۲۸۱'۲۸۰	حکیم بن حزام
۳۷۶	علیہ سعید
۳۰۲	حامہ
۱۸۱'۱۶۹'۱۵۲'۱۴۴'۱۳۵'۱۲۷'۱۲۶'۱۲۵'۱۲۴'۱۲۳	حمزہ بن عبدالمطلب
۲۲۴'۲۲۸'۲۲۷'۲۲۶'۲۱۷'۲۰۰'۱۹۷	
۲۰۲	حظلمہ بن ابی عامر
۱۰۰	حوا (حضرت)
۲۵۶'۲۴۴'۲۴۱	حنی بن اخطب
	
۱۰۹'۱۰۸	خالد بن حزام
۳۶۹'۳۶۸'۳۶۳'۳۶۲'۳۶۱'۳۷۰'۳۶۹'۳۵۵	خالد بن ولید
۳۷۰	
۲۲۷'۲۱۷'۲۱۵'۲۱۴'۲۱۳	خباب بن ارت
۸۱'۸۰'۷۹'۷۷'۷۶'۷۵'۷۴'۷۳'۵۵'۵۴	خدیجہ الکبریٰ
۲۹۳'۱۵۲'۱۴۶'۱۲۰'۱۰۸	
۲۷۸'۲۷۲'۲۷۱'۲۶۸	خراش بن لیث
۲۶۸	خفاف
۳۴۱	خولہ
	
۱۱۳	دانیال
۳۹۶	داؤد
	
۲۰۲	رافع بن مالک
۱۹۳	رافع بن عمرو
۳۰۲'۱۳	رباح

۱۶۳'۱۶۱	براء بن معرور
۲۶۹	بواسلم
	
۱۸۶	ثابت بن قیس انصاری
۳۲۶'۳۱۶	ثوبان
	
۳۷۹'۳۷۸'۳۶۳'۳۵۴'۳۵۳'۳۵۲	جابر بن عبد اللہ
۳۲۳	جبار بن سلمیٰ کلابی
۳۲۸'۸۶'۷۹'۷۸'۷۷	جبرائیل
۳۲۲'۱۱۸'۱۱۶'۱۱۵'۱۱۴'۱۱۰'۱۰۸	جعفر طیار بن ابی طالب
۲۷۴	جد بن قیس
۹۳'۹۱	جولیس بیزر
	
۳۱۶	حارث
۲۰۲	حارث بن السمرہ
۲۵۰	حارث بن عوف
۲۵۷	حارث عطفانی
۳۱۶	حارثہ
۲۶۸	حارث بن سعید
۳۷۱	حارث بن ہمام
۳۱۶	حاتم طائی
۳۶۱	حباب
۳۷۶	حذافہ عرف شیمہ
۳۲۶'۳۲۱'۲۳۵'۲۰۲	حذیفہ بن الیمان
۱۸۶'۳۶	حسان بن ثابت
۳۶۶	حسن

ربیع بن حارث

۳۱۱

ربیع بن کعب

۳۰۹

ربیع بن خدیج

۳۶۲

ربیع بن محمد

۱۰۹'۵۴

ربیع بن قیس

۳۸۱



زبیر بن العوام

۲۹۱'۲۰۱'۲۰۰'۱۰۹

زبیر بن عبدالمطلب

۶۹'۶۷'۶۶

زبیر

۲۵۷

زبیر کان

۱۸۶

زبیر بن الاسود

۲۹۲

زبیر بن ابی سلمیہ

۲۹۲

زبیر بن حارث

۳۱۶'۲۰۹'۲۰۰'۱۸۱'۱۵۶'۱۵۵'۱۴۶'۷۷'۳۹

۳۲۳'۳۲۲

زبیر بن محمد

۵۵'۵۴

زبیر زوجہ عبد اللہ بن مسعود

۳۸۷

زبیر بن الانصاری

۳۸۷

زبیر بن خالد الجعفی

۲۶۸



سالم مولیٰ ابی حذیفہ

۳۲۶'۳۲۵'۳۱۶

سراقہ بن مالک

۱۷۷

سعد بن شمیر

۲۱۰

سعد بن عبادہ

۲۹۱'۲۵۷

سعد بن عبیدہ

۲۶۶

سعد بن زورہ

۱۹۳'۱۹۳'۱۶۳

سعد بن معاذ

۳۰۱'۲۶۵'۲۵۷'۲۵۵'۲۰۲

سعد بن الربیع

۲۰۲

سعید بن زید

۲۰۲'۱۳۴

سعدی

۳۱۶

سلمان فارسی

۲۲۲'۲۱۶'۲۰۴'۲۰۲'۲۰'۱۸۸'۱۸۷'۱۸۶

۲۰۱'۳۲۷

سلام

۲۳۱

سلیمان

۳۹۶'۷۰

سلمہ بن سلامہ

۲۰۱

سمورہ بن جندب

۳۶۲

سمریہ بنت خباب

۳۱۶'۱۳۰'۱۰۸

سود بنت زمعہ

۲۱۵'۱۰۸

سل

۱۹۳'۱۹۳

سہیل

۲۹۳'۱۹۳'۱۹۳

سہیل بن عمرو

۳۷۱'۳۶۳'۳۷۸'۳۷۷'۳۷۶'۳۷۵'۳۵۶



شعب بن ربعی

۱۳۷'۱۳۲

شقران صالح

۳۲۳'۳۱۶

شرید بن سوید ثقفی

۲۶۸

شامہ بن عثمان

۳۳۳'۳۲۹'۲۰۲

خزیمہ بن حنت

۳۶۷



صفوان

۲۹۳'۲۳۷'۲۳۲

صہیب بن سنان

۳۲۹'۳۲۸'۳۲۷'۳۲۶'۳۱۷'۳۱۶'۲۰۲



ضحاک بن سفیان

۳۲۳

ضرار بن الخطاب

۲۵۶

شامہ بن ثعلبہ

۳۸۸'۱۸۴



۶۳	عبلہ
۳۶	عبید بن حارث
۳۵۲	عبید اللہ بن عبد اللہ
۳۰۸'۳۰۲	عتاب بن أسید
۱۳۷'۱۳۲'۱۲۹'۹۷	خجیہ بن ریح
۲۹۹'۲۹۸'۲۳۹	عثمان بن طلحہ
'۳۲۶'۲۹۳'۲۹۲'۲۷۴'۲۷۳'۲۷۲'۲۰۰'۱۵۶'۱۰۹	عثمان بن عفان
۴۰۰'۳۷۷	
۳۴۱'۲۰۱	عثمان بن مظعون
۱۵۸	عدس
۲۷۱'۲۷۰	عردہ
۱۵۱	عتبہ
۲۷۴	عکاشہ بن مخصن
۳۷۱'۲۹۳'۲۷۲'۲۵۵	عکرمہ بن ابو جمل
'۲۰۵'۱۷۱'۱۷۰'۱۳۶'۱۰۸'۷۷'۵۳'۵۳'۵۲'۵۱	علی بن ابی طالب
'۳۲۷'۳۲۳'۲۹۸'۲۹۷'۲۷۷'۲۵۶'۲۱۸'۲۱۷	
۴۰۰'۳۸۱'۳۶۰'۳۵۳'۳۵۳	
۳۵۳'۳۲۳'۳۰۳'۲۹۲'۲۷۷'۲۰۲'۲۰۰'۱۰۹	عبدالرحمن بن عوف
۲۰۲	عمیر بن ابی وقاص
۲۰۲	عمار بن حزم
'۳۱۶'۲۰۶'۲۰۲'۱۰۸'۳۹'۳۳'۲۷'۲۶'۲۵'۲۳'۲۳	عمار بن یاسر
۳۲۷'۳۲۴	
۱۵۶	عمرو بن لئیمہ
۳۸۱	عمرو بن عبسہ
۳۷۰'۳۶۸'۱۴۱'۱۱۸'۱۱۶'۱۱۵'۱۱۳'۱۱۳'۱۱۳'۱۱۳'۳۵	عمرو بن العاص
۲۵۶'۲۵۵	عمرو بن عبدالود
۱۶۴	عمرو بن جموح
۲۰۲	عمرو بن معاذ
۹۱	عمر بن لئی

	طارق بن عبد اللہ
۳۷۴	طلحہ بن عبید اللہ
۲۲۸'۲۰۱'۱۸۲'۱۷۸'۱۷۷'۱۵۲	
	عامر بن فہیرہ
۳۲۳'۳۱۶'۲۶۷'۲۶۶'۱۷۷'۱۷۶'۱۷۵'۱۷۴'۲۵۰	عائشہ بنت ابو بکر
'۳۵۲'۳۵۱'۳۵۰'۳۲۵'۳۲۲'۲۶۷'۲۶۶'۲۱۵'۸۴	
۳۷۵'۳۵۶'۳۵۵'۳۵۴	
'۲۹۷'۲۹۳'۲۹۰'۲۸۹'۲۸۷'۲۸۵'۲۸۳'۱۹۳	عباس بن عبد المطلب (ابو الفضل)
۳۲۹'۳۱۱'۲۹۸	
۲۴۰'۲۳۹	عبادہ بن صامت
۳۲۲	عبد اللہ بن عمر
۱۷۶'۱۷۵'۱۷۴'۱۷۱	عبد اللہ بن ابو بکر
۲۷۲'۲۳۹'۱۹۳'۱۹۰	عبد اللہ بن ابی
۳۷۹	عبد اللہ بن حارث
۲۰۹'۲۰۸'۲۰۷'۲۰۶	عبد اللہ بن زید
۴۰۱'۳۷۳'۲۳۹	عبد اللہ بن سلام
۳۸۷'۳۳۱'۳۳۰'۲۰۲'۲۰۰	عبد اللہ بن مسعود
۳۷۵'۳۲۲'۲۹۵'۱۹۶'۱۹۰	عبد اللہ بن رواد
۲۷۷'۲۷۶	عبد اللہ بن سہیل
۳۲۳'۱۸۴	عبد اللہ بن عباس
۶۵	عبد اللہ بن عبد المطلب
۵۵	عبد اللہ بن محمد
۳۳۹	عبد اللہ بن المورثی
۲۳۴	عبد اللہ بن حش
۱۸۶	عطار بن حاجب
۳۱۶'۱۸۷'۱۸۱	عثمان بن الاشہل
۱۹۳'۶۶	عبد المطلب



۱۳۴'۱۳۲'۱۳۱

لحسم بن عبد اللہ

۷۶'۷۵

فہیمہ

۸۳

نوح

۲۵۶'۱۵۲

نوفل مخزومی



۲۲۸'۲۲۷'۲۲۶

وحشی

۳۶

ورقہ بن نوفل

۱۳۲'۱۱۰'۱۰۹

ولید بن عقبہ

۱۳۰'۱۳۹

ولید مخزومی



۵۴

بالہ

۲۹۲

ہشام بن عمر

۲۲۸'۲۲۷'۲۲۶'۷۵'۷۴'۷۳'۷۲'۷۱'۷۰'۶۹

ہند

۲۴۱

ہوزہ بن قیس



۳۱۶

یاسر

۲۳۵

یمان

۳۷۰'۳۶۸

یزید بن ابی سفیان